

www.KitaboSunnat.com

ترتیب و تحریر

سید ابوبکر غزالی

فاران اکیڈمی قذافی سٹریٹ ©، اردو بازار، لاہور

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ
قُلْ اطِيعُوا اللّٰهَ
وَاطِيعُوا الرَّسُوْلَ

مجلس التحقیق الاسلامی اربنہ

محدث لائبریری

کتاب و سنت کی روشنی میں لکھی جانے والی اردو اسلامی کتب کا سب سے بڑا مفت مرکز

معزز قارئین توجہ فرمائیں

- کتاب و سنت ڈاٹ کام پر دستیاب تمام الیکٹرانک کتب... عام قاری کے مطالعے کیلئے ہیں۔
- مجلس التحقیق الاسلامی کے علمائے کرام کی باقاعدہ تصدیق و اجازت کے بعد (Upload) کی جاتی ہیں۔
- دعوتی مقاصد کیلئے ان کتب کو ڈاؤن لوڈ (Download) کرنے کی اجازت ہے۔

تنبیہ

ان کتب کو تجارتی یا دیگر مادی مقاصد کیلئے استعمال کرنے کی ممانعت ہے
کیونکہ یہ شرعی، اخلاقی اور قانونی جرم ہے۔

اسلامی تعلیمات پر مشتمل کتب متعلقہ ناشرین سے خرید کر تبلیغ دین کی
کاوشوں میں بھرپور شرکت اختیار کریں

PDF کتب کی ڈاؤن لوڈنگ، آن لائن مطالعہ اور دیگر شکایات کے لیے
درج ذیل ای میل ایڈریس پر رابطہ فرمائیں۔

✉ KitaboSunnat@gmail.com

🌐 www.KitaboSunnat.com



داؤد عزیزی

عَلَيْهِ
الْحَمْدُ

مَوْلَانَا
عَبْدُ

ترتیب و تحریر

سید ابوبکر عزیزی

فاران اکیڈمی

قذافی سٹریٹ، اردو بازار، لاہور

جملہ حقوق محفوظ

قاسم محمود

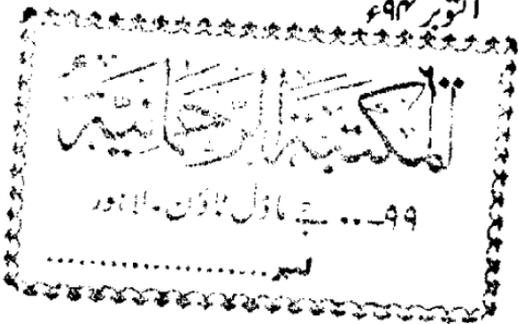
فار ان اکیڈمی ۷۱- اردو بازار لاہور نے

باجازت و رضائے سید ابوبکر غزنوی مرحوم شائع کی

اشاعت ثانی: اکتوبر ۱۹۹۳ء

تعداد اشاعت:

قیمت:



مجلد حقوق بحق سید ابوبکر غزنوی خلف الرشید حضرت مولانا سید محمد داؤد غزنوی

رحمۃ اللہ علیہ محفوظ ہیں۔

فہرست مضامین

۵	حرفِ آغاز
۹	مولانا محمد داؤد غزنویؒ کا عظیم المرتبت خاندان - مولانا محی الدین احمد قصوری
۲۱	مولانا سید محمد داؤد غزنویؒ (کچھ نقوش و تاثرات) - مولانا سید ابوالحسن علی ندوی
۲۷	مولانا سید محمد داؤد غزنویؒ (اسلام اور آزادی کا ایک بلند مرتبہ) - مولانا غلام رسول مہر
۳۷	حضرت مولانا داؤد غزنویؒ (چند تاثرات) - مولانا محمد صغیف ندوی
۴۵	حضرت مولانا محمد داؤد غزنویؒ ڈاکٹر زبیر عبداللہ صاحب
۵۳	حضرت مولانا محمد داؤد غزنویؒ مولانا مظہر علی انظر
۶۱	سید محمد داؤد غزنویؒ (جنگِ آزادی کے سالار اول) آغا شورش کاشمیری
۶۹	مولانا داؤد غزنویؒ سید رئیس احمد جعفری
۷۵	حضرت مولانا سید محمد داؤد غزنویؒ میاں محمد شفیع (دم - ش)
۸۳	مولانا داؤد غزنویؒ کی چند یادیں ڈاکٹر اسرار احمد
۹۳	حضرت مولانا سید داؤد غزنویؒ مولانا حکیم فضل الرحمن سواتی
۱۰۳	حضرت مولانا سید محمد داؤد غزنویؒ (سیاسی زندگی) ملک حسن علی ہاشمی شرقپوری
	کی ابتداء اور ملک کا سیاسی پس منظر)
۱۱۷	مولانا غزنویؒ سے ایک ملاقات مولانا محمد داؤد راز
۱۳۳	حضرت مولانا سید محمد داؤد غزنویؒ (چند افتخارات و تاثرات) مولانا محمد اسحق بھٹی
۱۴۳	میرے استاد - مولانا داؤد غزنوی رحمۃ اللہ علیہ محی الدین سلمی
۱۷۱	میرے مشفق استاد حافظ عبدالرشید
۱۷۷	مولانا سید محمد داؤد غزنویؒ (چند یادیں چند باتیں) خالد بزئی ایم۔ اے

- حضرت مولانا محمد داؤد غزنویؒ اور حضرت مولانا صاحبزادہ حافظ عبد الرحمن صاحب (۱۸۷)
- مفتی محمد حسن صاحبؒ کے باہمی تعلقات خلیفہ ایشیہ حضرت مولانا مفتی محمد حسن صاحبؒ
- مولانا سید داؤد غزنوی رحمۃ اللہ علیہ انڈولوپو: عابد نظامی (۲۰۳)
- (مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی صاحبؒ کے نظریں)
- حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحبؒ کا کتب گرامی (۲۰۸)
- مولانا غزنویؒ کا حکیمانہ انداز تبلیغ مولانا عبد الماجد دریا آبادی (۲۰۹)

سیدی و اَلْبے

تحریر: سید ابوبکر غزنوی

- ۱ — آباد اجداد (۲۱۵)
- ۲ — حالات زندگی (۲۳۷)
- ۳ — آخری ایام (۲۷۱)
- ۴ — اخلاق و عادات (۲۸۱)
- ۵ — اندازِ خطابت (۲۹۳)
- ۶ — نظریات و رجحانات (۳۲۵)
- ۷ — مسائلِ تصوف (۳۵۵)
- ۸ — فقہی موقف (۳۷۱)
- ۹ — مرزائیت کی تردید (۳۸۵)
- ۱۰ — شعر و ادب کا ذوق (۴۰۳)
- ۱۱ — دارالعلوم تقویۃ الاسلام (۴۴۳)
- مانند (۴۶۳)

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ
مُحَمَّدًا وَنَسَلِي عَلَى رَسُولِهِ الْكَرِيمِ

حرفِ آغاز

سورۃ فاتحہ اُمّ الکتاب ہے۔ ہر سورۃ قرآن ہے۔ اس جامع اور بلیغ دُعا کے ان الفاظ پر غور کیجیے:
اِهْدِنَا السِّرَاطَ الْمُسْتَقِيمَ - صِرَاطَ الَّذِينَ أَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ - عَنِّي
الْمَعْتُوبِ عَلَيْهِمْ وَلَا الضَّالِّينَ -

(ہمیں سیدھی راہ دکھا، اُن لوگوں کی راہ جن پر تو نے کرم کیا، اُن لوگوں کی راہ
نہیں جن پر غضب نازل کیا گیا اور نہ گمراہوں کی راہ)

یہ نہیں کہا کہ ہم نیکیوں اور سبلائیوں کی راہ دکھا، یہ نہیں کہا کہ ہمیں نماز، روزہ، زکوٰۃ اور
سچ کی راہ دکھا، بلکہ ان برگزیدہ انسانوں کا ذکر کیا جو بھلائی کے پیکر ہوتے ہیں، جو خیرِ محتم ہیں۔ انبیاء اور
صلحاء کے تذکرہ ہی سے صراطِ مستقیم کی ٹھیک طور پر شناخت ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن مجید میں
ایمان اور عملِ صالح کی حقیقت، انبیاء اور اولیاء کے حالاتِ زندگی ہی سے اُجاگر کی گئی ہے۔ ایک
ایک پیغمبر کا نام لے لے کر اس کے حالاتِ زندگی پر سوچ، بچار کی رحمت دی گئی:

”وَ اذْكُرْ فِي الْكِتَابِ اِبْرَاهِيمَ“ (۱۶: ۱۲)

(کتاب میں ابراہیم علیہ السلام کا ذکر کرو)

”وَ اذْکُرْ فِی الْکِتَابِ مُوسٰی“ (۱۹ : ۵۱)

(کتاب میں موسیٰ علیہ السلام کی بات کرو)

”وَ اذْکُرْ فِی الْکِتَابِ اِسْمَاعِیْلَ“ (۱۹ : ۵۴)

(کتاب میں اسماعیل علیہ السلام کا تذکرہ کرو)

”وَ اذْکُرْ فِی الْکِتَابِ اِدْرِیْسَ“ (۱۹ : ۵۶)

(کتاب میں ادریس علیہ السلام کے حالات بیان کرو)

”وَ اذْکُرْ عِیْسٰی ابْنَ مَرْیَمَ“ (۳۸ : ۴۱)

(ہمارے بندے عیسیٰ علیہ السلام کی حکایت کہو)

”وَ اذْکُرْ عِیْسٰی ابْنَ مَرْیَمَ“ (۳۸ : ۱۴)

(ہمارے بندے داؤد علیہ السلام کی سیرت بیان کرو)

قرآن مجید میں صرف انبیاء مسطورین ہی کا ذکر نہیں ہے۔ اولیاء اللہ کی سیرت طیبہ سے بھی استشعار کیا گیا ہے۔

”وَ اذْکُرْ فِی الْکِتَابِ مَرْیَمَ“ (۱۹ : ۱۵)

(اور کتاب میں مریم علیہا السلام کا تذکرہ بھی ہو)

اور اصحاب کف کا کردار بھی تذکیر و موعظت کے لیے بیان کیا گیا، تاکہ انسانیت پر یہ واضح کیا جاسکے کہ انسان غیر معصوم ہوتے ہوئے بھی قُربِ دِوَلِیْنَتِی بِلْمَلِیْکِیْنِ سِیْءِیْنَ ہو سکتا ہے۔ پس بزرگوں کے حالاتِ زندگی محفوظ کرنا اور انہیں نبی فروعِ انسان کے سامنے پیش کرنا عین منشاءِ الہی ہے اور کتاب اللہ کی اقتداء ہے۔

حضرت والد علیہ الرحمہ کو جس نے قُرب سے دیکھا۔ میری صمیم اور میری شایین اُن کے ساتھ بسر ہوئیں۔ مدتِ عمر میں اُن کے ساتھ رہا۔ انہیں دیکھ کر نڈیا پاؤں آتا تھا۔ وہ اہل بیت کے پیکر تھے۔ ان کی زندگی کتاب و سنت کے سانچے میں ڈھلی ہوئی تھی اور کسی انسان کی سیرت

کے بارے میں اس کے اپنے گھر کے افرادی گواہی بہت بڑی گواہی ہے۔ اُن کی زندگی ایک مشعل ہے جس کی روشنی میں بھٹکے ہوئے راہی سراطِ مستقیم کا سرخ پاسکتے ہیں۔ اُن کی زندگی ایک شمعِ ہدایت ہے جس سے ایمان و عمل کے پلارغ روشن کیے جاسکتے ہیں اور اسی غرضِ مغایت کے پیشِ نظر ان مقالوں کو مرتب کیا گیا ہے۔

حضرت والد علیہ الرحمہ کی تاریخِ وفات سولہ دسمبر ۱۹۶۳ء ہے۔ انہیں دُنیا سے حُضتِ بُورنے گیارہ برس ہونے کو آئے ہیں۔ مجھے اعتراف ہے کہ اُن کے سوانحِ حیات مرتب کرنے کا کام بہت پہلے سرانجام پاجانا چاہیے تھا، لیکن کچھ ایسے حالات پیش آتے رہے اور کچھ ایسی رکاوٹیں مائل ہوتی رہیں کہ اس کتاب کی طباعت میں تاخیر ہوتی چلی گئی۔

ان کی وفات کے ایک دو برس بعد ہی ان پر کتاب مرتب کرنے کا ارادہ کیا تھا۔

مقالہ نگاروں کی ایک فہرست مرتب کی جس میں ان کے احباب بھی تھے متعلقین اور معتقدین بھی تھے، ان کے رفقاءِ کار بھی تھے، ان کے ہم عصر علماء اور سیاستدان بھی تھے اور اُن کے بعض شاگردانِ رشید بھی اس فہرست میں شامل تھے۔ بیخوابش بھی تھے کہ حضرت میاں ابوالحسن علی ندوی ناظمِ ندوۃ العلماء، لکھنؤ جن کی شخصیت مجھے عزیز ہے، کے نگارشاتِ قلم بھی کتاب میں شامل ہو سکیں۔ بہت کم مقالہ نگار ایسے تھے جنہوں نے حضرت میاں صاحب کی طرح نہایت مستعدی کے ساتھ حسبِ وعدہ مدتِ معتد کے اندر اپنے مقالے بھیج دیے ہوں۔ کچھ ایسے بھی تھے جن کا پیچھا کرنا پڑا، مگر آفریزادہ قرآن سے مقالے لکھوانے میں کامیاب ہو گیا اور کچھ ایسے سخت جان نکلے کہ بار بار وعدے کرتے رہے اور برار پڑاتے رہے۔ آج میں نے اپنی ہار مان لی ہے اور کتابا پر پریس بھیج رہا ہوں۔ اگر مقالہ نگاروں کے قلم اور وقت پر مجھے کچھ اختیار ہوتا، تو کتاب کی طباعت میں اس قدر تاخیر نہ ہوتی۔

بعض مقالہ نگار اس عرصے میں فوت ہو چکے ہیں اور حضرت والد علیہ الرحمہ سے بااٹ ہیں۔

نیدر میں احمد جنوری وفات پانگے، پھر مولانا محی الدین احمد قصوری رخصت ہوئے، پھر

مولانا غلام رسول تہرعلت فرما گئے اور اب مولانا مظہر علی اظہر سہجی پلے جے ہیں۔
عزیزم خالد بزنی صاحب نے اس کتاب کی ترتیب و تسوید میں میری بہت مدد کی۔ اللہ تعالیٰ
انہیں بزلے غیر عطا کرے۔

میری پر دعا ہے کہ خدا نام و نود کی خواہش سے ہمارے دلوں کو پاک کر دے اور خاندانی
فرد و فرد کی مہلک بیماری سے یہیں محفوظ رکھے اور اپنی مخلوق کے لیے اس کتاب کو ذریعہ فیضان
اور میرے لیے اور والد علیہ الرحمہ کے لیے اس کتاب کو توشیحہ آخرت بنا دے
رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا اِنَّكَ اَنْتَ السَّمِيعُ الْعَلِيمُ۔

الوکیل عربی

۲۵ شوال المکرم ۱۳۹۲ھ

مطابق ۱۱ نومبر ۱۹۷۱ء

مولانا محمد داؤد غزنوی

کا
عظیم المرتبت خاندان

مولانا محی الدین احمد قسوری

مولانا داؤد غزنویؒ کے دادا مولانا عبداللہ غزنوی رحمۃ اللہ علیہ کی ایک فقیدانہ اشغال شخصیت تھی۔ جس میں بیک وقت علم دین اور تصوف جمع ہو گئے تھے۔ ان کے متعلق ہمارے خاندان میں مشہور ہے کہ وہ مادر زاد ولی تھے؛ چنانچہ وہ تحصیل سلوک کے شوق میں اپنے پیروشیخ سے ملنے گئے جو اس وقت افغانستان کے مشاہیر صوفیاء اور اولیاء میں سے تھے۔ یہ ان کی خدمت میں جب پہلی مرتبہ حاضر ہوئے تو سنا ہے کہ کچھ عرصہ بیٹھ کر واپس چلے آئے۔ کہتے ہیں تین مرتبہ ایسا ہوا۔ تیسری مرتبہ جب واپس ہونے لگے تو انہوں نے ان کو بلا کر کہا:

”عبداللہ! ہمارے یہاں آنے کی ضرورت نہیں۔ تمہارے گھر کے درو دیوار تمہاری رہنمائی کریں گے۔“ چنانچہ اس کے بعد ان کا وہاں جانا ثابت نہیں۔

غزنی سے پنجاب

قدرت نے فطرت امتدادِ جبریلیم، ذہن نہایت رسا، بخشنا تھا۔ علوم ظاہری سے فارغ ہوئے، تو افغانستان کو امتدادِ جبر کی بدعات اور شرکاتہ رسوم میں مبتلا پایا۔ ان کی اصلاح کی طرف متوجہ ہوئے۔ علماء و مشائخ وقت بکہ حکام پر شدید مکتہ چینی شروع ہو گئی جس سے مختلف قسم کی طعن و تشنیع کے ہدف بنے اور علماء و مشائخ کی مخالفت اس حد تک بڑھی کہ حکومت بھی اس سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکی۔

دربارِ کابل میں طلبی

چنانچہ دربارِ شاہی میں بلا گیا کہ یا تو علمائے وقت کے مطاعن کا جواب دیں یا اپنے عقائد و خیالات کی تبلیغ سے توبہ کریں۔ کہا جاتا ہے کہ اس وقت کابل غزنی بیکہ افغانستان کے بڑے بڑے علماء جمع تھے۔ تمام علماء اس طرح ساکت و صامت بیٹھے تھے کہ جیسے سانپ سونگھ گیا ہو کسی شخص کو اعتراض کرنا یکطرفہ یا رائے گفتگو تک نہ ہوا۔ شاہ افغانستان نے علماء کی مخالفت سے مجبور ہو کر گھر جا کر انہیں حکم دیا کہ افغانستان سے نکل جائیں؛ چنانچہ آپ نے اپنا رختِ سفر باندھا جو بہت محقق تھا اور رختِ افغانستان خوابیدہ شد و بختِ ہندوستان بیدار شد کہتے ہوئے کابل سے نکل کھڑے ہوئے۔

غزنی سے امرتسر

ہمارے ہاں یہ مشہور تھا، معلوم نہیں کہاں تک درست ہے کہ ان کے ساتھ ایک بچی تھی جس کا عقدا انہوں نے راستہ میں ایک نہایت ہی خدا پرست مرد سے کر دیا تھا، جو ذات کا جملہ مشہور تھا۔ جب انہیں کہا گیا تو فرمایا: ہمیں است سید۔ ان کو مکہ عند اللہ اتفاقاً۔ یہ نہیں معلوم ہو سکا کہ وہ غزنی سے سیدھے امرتسر تشریف لے گئے اور مستقلاً یہاں اقامت گزریں ہو گئے یا راستہ میں قیام کرتے کرتے یہاں پہنچے۔ بہر حال امرتسر کو انہوں نے اپنا مستقل مقصد قرار دے لیا۔ امرتسر پہنچتے ہی وہ تمام لوگوں کے مرکزِ توجہ بن گئے۔

امرتسر سے دہلی

چونکہ طبعاً سخت پابند سنت تھے، بلکہ کہنا چاہیے کہ سنت کے عاشق تھے اس لیے فنِ حدیث کی تکمیل کا شوق غالب ہوا۔

اصحابِ ثلاثہ

معلوم ہوتا ہے یہاں پہنچتے ہی ان کے روالبط مولانا غلام رسول صاحب قلعہ والوں اور مولانا حافظ محمد لکھو کی والوں کے ساتھ بہت بڑھ گئے اور تینوں بزرگوں (رحمۃ اللہ) نے فیصلہ کیا کہ حدیث کی سند حضرت میاں نذیر حسین رحمۃ اللہ علیہ سے لی جائے؛ چنانچہ تینوں نے لکھ کر حضرت میاں صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے اجازت مانگی اور اجازت آنے پر فوراً روانہ ہو گئے۔ اس وقت تک ابھی ریل جاری نہیں ہوئی تھی۔ لوگ گھوڑے گاڑیوں پر پڑاؤ پڑاؤ ہوتے ہوئے دہلی پہنچتے تھے جس وقت یہ تینوں بزرگ دہلی گاڑیوں کے اڈے پر پہنچے تو ایک بزرگ آدمی کو وہاں موجود پایا۔ جس نے ان سے پوچھ کر کہ کہاں کا قصد ہے؟ ان کا اسباب اٹھالیا اور کہا کہ میں آپ لوگوں کو وہاں پہنچا دوں گا۔ وہ بزرگ ان تینوں بزرگوں کا سامان اٹھا کر میاں نذیر حسین صاحب کی مسجد میں لے گیا۔ ان کا اسباب وہاں رکھا اور خود غائب ہو گیا۔ یہ حیران کہ اس مزدور نے پیسے بھی نہیں لیے اور کہاں چلا گیا ہے جب کافی وقت گزر گیا تو انہوں نے کسی صاحب سے دریافت کیا کہ میاں صاحب کہاں ہیں اور کب تک آئیں گے؟ تو اس نے جواب دیا کہ یہ میاں صاحب ہی تو تھے جو آپ کا سامان لائے ہیں۔ اب وہ غالباً گھر آپ کے کھانے کا کمنے گئے ہیں۔ یہ تینوں بزرگ دل ہی دل میں بڑے نادم ہوئے؛ چنانچہ جب حضرت میاں صاحب واپس تشریف لائے اور کھانا بھی لے آئے تو انہوں نے بہت ہی معذرت شروع کی، تو میاں صاحب نے فرمایا: آپ تحصیل حدیث کے لیے تشریف لائے ہیں تو حدیث بجز اس کے کیا ہے کہ خدمتِ خلق۔ یہی حدیث کا پہلا سبق ہے۔

مجھے اپنے بزرگوں سے یہ بھی معلوم ہوا ہے جن کو خود حضرت میاں صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے شرفِ تلمذ حاصل تھا کہ میاں صاحب فرمایا کرتے تھے:

”مولوی عبداللہ حدیث ہم سے پڑھ گیا اور نماز پڑھنی ہمیں سکھا گیا۔“
 محویت کی عجیب و غریب کیفیت تھی جو نہ صرف ان پر بلکہ بعض رقتا پر بھی طاری
 ہو جایا کرتی تھی۔

میرے ایک اُستاد مولوی حافظ عبدالرحمن مرحوم تھے جن سے میں نے حدیث کی
 مشہور کتاب ریاض الصالحین پڑھی۔ وہ فرمایا کرتے تھے کہ قیام امرتسر میں جب وہ حضرت مولانا
 سے حدیث پڑھا کرتے تھے تو ان کی محویت کے عجیب و غریب واقعات دیکھنے میں آئے۔
 ایک مرتبہ عصر کی نماز پڑھا رہے تھے کہ یکایک سخت بارش شروع ہو گئی۔ ایسی سخت کہ
 مقتدی سب نماز چھوڑ کر بھاگ گئے۔ صرف دو چار رہ گئے۔ نماز سے فارغ ہو کر دُعا کے
 لیے ہاتھ اٹھائے تو ہاتھ سب کیچڑ سے بھرے ہوئے تھے۔ فرمانے لگے:
 ”باراں شد؛ واللہ عبداللہ را خبر نشد۔“

نماز عصر کے بعد ان کا خاص وقت تھا۔ جن لوگوں کو دُعا کرانی ہوتی وہ اُس وقت
 پہنچ جاتے۔ میرے والد بزرگوار کے چھوٹا مولوی غلام قادر کو ان سے ملنے کا بڑا شوق تھا۔
 ایک مرتبہ وہ امرتسر پہنچ گئے تو نماز کے بعد اپنا تعارف کرایا کہ میں دلاور کے فلاں خاندان سے
 تعلق رکھتا ہوں۔ مولانا غلام رسول قلعہ والوں اور میرے دادا مرحوم و مغفور مولوی غلام احمد
 رحمہم اللہ) میں بڑی دوستی تھی۔ چنانچہ مولانا غلام رسول مرحوم ہمیشہ دلاور سال میں متعدد مرتبہ
 تشریف لایا کرتے تھے۔ حضرت والد مرحوم و مغفور کو بسم اللہ حضرت مولانا نے کرائی تھی اور
 دُعا بھی کی تھی معلوم ہوتا ہے کہ حضرت مولانا عبداللہ رحمۃ اللہ علیہ کو ہمارے خاندان سے
 تعارف ضرور ہو چکا ہوگا؛ چنانچہ جب مولوی غلام قادر صاحب نے اپنا تعارف کرایا تو فرمایا
 پھر تو تم ضرور علم سے کچھ دسترس رکھتے ہو گے۔ انہوں نے ازراہ انکار عرض کیا کچھ شُدد
 رکھتا ہوں۔ ایک دن حضرت نے اپنی کسی کتاب کا ایک قلمی نسخہ نکالا اور مولوی غلام قادر
 سے فرمایا کہ کچھ کتابت کر سکتے ہو تو یہ چھوٹی سی کتاب نقل کر دو۔“

اُن دنوں کتابت آسان کام نہ تھا۔ سنا ہے کہ سیا کوٹی کاغذ کو کچھ گھوٹنا پڑتا تھا۔ سیاہی بھی خود بنانی اور درست کرنا پڑتی تھی؛ چنانچہ کئی دن کے بعد جب یہ کتاب نقل کر کے لے گئے تو چونکہ خط بہت اچھا اور صاف تھا، بیحد خوش ہوئے۔ ایک روز نماز عصر کے بعد مجھ بچا صاحب نے فرمایا کہ حضرت میرے لیے بھی دُعا فرمائیں۔ پوچھا کیا دُعا کروں؟ عرض کیا کہ مجھے درودِ سرکا کبھی ایسا شدید دُور پڑتا ہے کہ میں بے حال ہو جاتا ہوں اور میری نمازیں قضا ہو جاتی ہیں۔ دُعا فرمائیں کہ یہ شکایت دُور ہو جائے۔ میری نماز باجماعت قضا نہ ہو۔ ایک تیسری اور چیز کہی مگر وہ میری یاد سے نکل گئی ہے۔ بہر حال چند منٹ ہاتھ اٹھا کر دُعا کی اور فرمایا: ”قبول شد انشاء اللہ“

میرے دادا والد صاحب کے مجھ بچا، اس وقت بالکل جوان تھے۔ ستر سال کی عمر پائی۔ گویا قریباً دُعا کے بعد پندرہ تیس پچاس سال زندہ رہے۔ درودِ سرکا دُورہ ایک مرتبہ بھی اس مدت میں نہیں ہوا۔ سفر و حضر میں نماز باجماعت کبھی قضا نہیں ہوئی۔ آخری رات عشاء کی نماز باجماعت پڑھی۔ تہجد کی نماز پوری پڑھی کہ وقت آگیا۔ ذکر شروع کر دیا اور صبح کی نماز سے قبل جان جاں آفریں کے پڑھ کر دی۔

ع خدا رحمت کند این عا نشنانِ پاک طینت را

دُعا کی قبولیت، یقیناً تعجب انگیز اور داعی کے کمال درجہ مستجاب الدعوات ہونے کی دلیل ہے لیکن دُعا کرنے والے کی لائیت بھی قابلِ توجہ ہے کہ کوئی چیز دنیوی نہیں مانگی۔ تینوں چیزیں دین کی اور آخرت کی مانگیں۔ انہی لوگوں کے حق میں قرآن حکیم کہتا ہے:

”من کان یرید حرث الآخرة نوذله فی حرثہ ومن کان یرید حرث الدنیا نوذتہ منہا ومالہ فی الآخرة من نصیب“

سیالکوٹ کا سفر

ایک مرتبہ ضلع سیالکوٹ کی تحصیل رعیہ میں جانے کا اتفاق ہوا۔ مولانا غلام رسول صاحب

قلعہ والے بھی ہر کاب تھے۔ جب آپ بلو والی (ایک گاؤں) پہنچے۔ یہ گاؤں میرے دو جیال کا گاؤں تھا۔ یہاں میرے دادا کے چچا اور چچا زاد بھائی کا گاؤں تھا۔ نام تو مشہور تھا خصوصاً مولانا غلام رسول صاحبؒ کو تو بہت زیادہ لوگ جانتے تھے۔ گاؤں کے چند چیدیہ آدمی حضرت مولانا غلام رسول صاحبؒ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور وعظ کی درخواست کی تو مولانا نے فرمایا کہ حضرت مولانا عبداللہ ساتھ ہیں، ان کا مقام شیخ اور خلیفہ کا ہے۔ ان کی اجازت کے بغیر وعظ نہیں کر سکتا۔ وہ مجمع اسی طرح حضرت مولانا عبداللہ رحمۃ اللہ کی خدمت میں حاضر ہو گیا۔ فرمایا: ”ایں مردماں چرمی گوئید؟“ بتایا گیا تو مولانا غلام رسول صاحبؒ سے مخاطب ہو کر فرمانے لگے:

”مولانا! قابلِ وعظ شدمی؟“

مولانا خاموش۔ کاٹو تو خون نہیں بدن میں۔ جب کچھ جواب نہ ملا تو فرمایا: ”مولانا! آپ منبر پر بیٹھے ہوئے کلمۃ الحق کہہ رہے ہوں۔ ایک شخص حاضرین میں سے اٹھتا ہے۔ وہ آپ کے منبر پر دو دھول لگاتا اور ڈاڑھی سے پکڑ کر منبر سے نیچے پھینک دیتا ہے۔ آپ کے چہرہ پر ایک بل یا نشکن نہیں پڑتا۔ آپ اٹھتے ہیں اور اسی خندہ پیشانی اور جوش سے کلمۃ الحق کہنا شروع کر دیتے ہیں تو اس وقت سمجھیے کہ آپ وعظ کے قابل ہو گئے ہیں۔“ ایک دن میاں غلام رسول صاحب کی کسی بات پر خفا ہو کر کہنے لگے:

”مولوی غلام رسول! تو مولوی شدمی، محدث شدمی، عالم شدمی، واعظ شدمی واللہ

ہنوز مسلمان شدمی۔“

یہ کہنا تھا کہ مولوی غلام رسول فریض پر گر گئے اور تڑپنے لگے۔

پھر فرمایا: ”بگو لا الہ الا اللہ“ کہتے ہیں اور مولانا کا بیان ہے کہ اُس وقت مسجد کے

درو دیوار سے لا الہ الا اللہ کی آواز آرہی تھی۔

غرض حضرت مولانا کی زندگی ایک عجیب صبر و استقامت اور اعتماد و توکل علی اللہ کی

زندگی تھی۔ ذہنی خواہشات کو اس میں کوئی راہ نہ تھی۔
ان صلوٰتی و نسکی و محیاتی و مماقی للہ رب العالمین کا پورا نمونہ تھی۔

حضرت مولانا کے بعد

حضرت مولانا کو دیکھنے کی سعادت تو مجھے نصیب نہیں ہوئی۔ یہ جو کچھ لکھا ہے وہ اپنے بعض بزرگوں یا دو ایک اساتذہ سے جنہیں حضرت موصوف سے ملنا حاصل تھا، مثلاً مولانا حافظ عبدالرحمن۔ میرے بزرگ مولانا فضل حق اور مولانا اسماعیل، سن کر لکھا ہے: اللہ مجھے آپ کے دونوں صاحبزادوں حضرت مولانا عبدالجبار رحمۃ اللہ علیہ اور حضرت مولانا عبدالواحد غزنوی رحمۃ اللہ علیہ کی صحبت اور ارشادات سے فیض یاب ہونے کا فخر ضرور حاصل ہے۔ مولانا عبدالاول رحمۃ اللہ علیہ تو غالباً اپنے پدر بزرگوار کی زندگی ہی میں وفات پا گئے تھے ۱۹۰۶ء میں میں میٹرک پاس کر کے لاہور گورنمنٹ کالج میں داخل ہوا تو حُسن اتفاق سے دو تین ایسے اچھے رفقاء مل گئے جو ہم مشرب تھے اور عقاید اور اعمال کے لحاظ سے بھی مجھے بُوئے تھے۔ پہلا سال تو یوں گزر گیا، لیکن دوسرے سال سے تو میرا اور میرے دو دوست (مولوی عبدالعزیز اور مناج الدین رحبڑار پشاور یونیورسٹی) اب دونوں اللہ کو پیار سے ہو چکے ہیں، اللہ انہیں اپنے جوار رحمت میں قبول فرمائے، اور ان دونوں دونوں کا عام طور سے وطیرہ ہو گیا تھا کہ جمعہ کے روز کالج میں ایک آدھ لیکچر سنا اور پھر کسک گئے اور جمعہ کی نماز حضرت مولانا عبدالجبار رحمۃ اللہ علیہ کے ہاں پڑھتے اور پھر دو ایک گھنٹے ان کی صحبتِ بابرکت سے فیضیاب ہو کر لاہور واپس آجاتے۔ میرے خاندانی روابط کی دہ سے میں خاص طور پر موردِ عنایات تھا۔

ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ حضرت پاک پتہ تشریف لے جا رہے تھے۔ ان دنوں تہ سے قصور اور قصور سے پاک پتہ جا یا کرتے تھے بذریعہ ریل اس دن اتفاق ایسا ہو کہ

پاک تین کی گاڑی بہت لیٹ تھی یا شاید نکل چکی تھی تو بجائے ٹیشن پر ٹھہرا رہنے کے حضرت والد صاحب مرحوم و مغفور کا پتہ پوچھ کر ہمارے ہاں تشریف لے آئے اور والد صاحب قبلہ سے فرمایا کہ میں آپ کے صاحبزادہ مولوی محی الدین سے ملنے کے لیے آ گیا ہوں واضح رہے کہ اس وقت میں پورائیشن ایبل نوجوان تھا۔ ڈاڑھی وغیرہ تھی مگر نماز خدا کے فضل سے بطریق سنت ہی ادا کرتا تھا۔

ایک عجیب بات یہ ہے کہ اہل حدیث عموماً نہایت متشدد ہوتے ہیں پختوری سے پختوری چیز پر سخت سے سخت نکتہ چینی کے خوگر۔ ہم تینوں اُس وقت کے مطابق ڈاڑھی وغیرہ مندواتے تھے لیکن مجھے نہیں یاد کہ ان دو تین سالوں میں آپ نے ہم میں سے کسی ایک کو ڈاڑھی مندوانے پر ڈانسا جو۔ اگر کما تو عام اتباع سنت پر زور دیا کہ دین سنت رسول کا نام ہے جس کی ڈاکٹر اقبال مرحوم نے یوں ترجمانی کی ہے :

بہ مصطفیٰ برسوں خویش را کہ دین ہمہ اوست

اگر بہ اوند رسیدی تمام بولہبی است

یا جیسے حضرت شیخ سعدی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں :

خلاف ہمیر کے رہ گزید

کہ ہرگز منزل نخواہد رسید

مجھے کبھی یاد نہیں کہ آپ نے خطبہ میں کسی قسم کی درشت نکتہ چینی کسی شخص یا کسی

فرقہ پر کی ہو۔ رحمۃ اللہ علیہ و علیٰ اٰلہ

اور حضرت مولانا عبدالواحد رحمۃ اللہ علیہ سے تو روالہ بہت زیادہ ہو گئے تھے بہت

کئی ایک رشتے بھی باہمی ہو گئے تھے۔ انہیں علم کے لحاظ سے میں نے بہت بلند اور

وسیع نظر پایا۔ خاص کہ حضرت امام ابن تیمیہ اور حضرت امام ابن قیم رحمہم اللہ علیہ کے تو

وہ حافظ معلوم ہوتے تھے۔ خشیت و تقویٰ بہت زیادہ تھا اور ان کی گفتگو اور مواعظ ہی

خشیت اللہ میں ڈوبے ہوئے ہوتے تھے۔ میری پہلی شادی کی تقریب میں نکاح خوانی خود انہی کی زبان مبارک سے ہوئی تھی۔ میرے سر پر جو ہار یا سہرا تھا وہ انہوں نے اپنے ہاتھ سے اتار کر پاس رکھ دیا پھر نکاح پڑھایا۔ میرے خُسرمنی اللہ ادم حوم و معفور بھی مشہور محدث تھے اور سحت درجہ پر ہیزگار۔ انہوں نے مجھے سہرا باندھے ہوئے دیکھا تو بگڑ گئے، لیکن قابل ذکر چیز یہ ہے کہ یہ بھولوں کا ہار قاضی سلمان صاحب منصور پوری رحمۃ اللہ علیہ نے برات کی روانگی کے وقت اپنے دست مبارک سے پہنایا تھا۔ برادر مرحوم مولوی محمد علی کی شادی پر وہ برات کے ساتھ فرید آباد تشریف لے گئے اور نکاح بھی انہوں نے پڑھایا۔ نکاح سے فارغ ہو کر ہم واپس آ رہے تھے۔ فرید آباد کے ٹیشن پر تشریف فرما تھے کہ مولانا آزادؒ رحمۃ اللہ علیہ کا ذکر آ گیا۔ اس وقت تک مولانا آزاد کا ابتدائی دور تھا۔ میرے منہ سے آزادؒ کا لفظ سُن کر فوراً بگڑے اور فرمانے لگے:

”آزاد کیا؟ کیا مسلمان اپنے آپ کو آزاد کہہ سکتا ہے اور وہ تو عالم مساجد ہے۔“
 میں نے فوراً جواب دیا کہ وہ کفر کی حکومت سے آزادی کے داعی اور مجاہد ہیں۔
 مجاہدین کے معاونین کے سرخیل بھی۔ تو فوراً خاموش ہو گئے۔ رحمۃ اللہ علیہ و علی آبائہم اجمعین۔

مولانا سید محمد داؤد غزنویؒ

کچھ نقوش و تاثرات

مولانا سید ابوالحسن علی ندوی، ناظم ندوۃ العلماء، لکھنؤ

غزنوی خاندان سے ہمارے خاندان کے روابط بہت قدیم اور عزیزانہ ہیں۔ ہندستان میں اس خاندان کے نامور اور مخلص بانی مولانا سید عبدالغفر غزنویؒ سلوک میں مولانا حبیب اللہ قندھاریؒ کے خلیفہ تھے اور مولانا حبیب اللہ قندھاریؒ کا روحانی تعلق و تلمذ حضرت سید محمد شہیدؒ سے تھا۔ مولانا سید عبدالغفر غزنویؒ اور ان کے فرزند ارجمند مولانا سید عبدالجبار غزنویؒ (والد مولانا سید محمد داؤد غزنویؒ) کا ذکر خیر ان کے اخلاص و توکل اور ان کی تجرید و توحید کے دلائل و واقعات میں نے بچپن ہی میں اپنے خاندان کے بزرگوں سے سُنے تھے۔ والد ماجد مولانا حکیم سید عبدالغفرؒ کی شہرہ آفاق عربی تصنیف ”نزہۃ الخواطر“ تکرر اعیانِ نبیؐ کی آٹھویں جلد میں مولانا سید عبدالغفر غزنویؒ صاحبِ کابرت اچھا ترجمہ (حالات) ہے مصنف صاحب نے اس جرم میں نہایت بلند کمالات جو وہ اکابر اہل اللہ کے متعلق استعمال کرتے ہیں استعمال کیے ہیں۔

مولانا عبدالجبار صاحبؒ کے متعلق میں نے عرصہ ہوا دو واقعات سنے تھے جن کے راوی ذاب صدر یار جنگ مولانا حبیب الرحمن خاں شیروانی مرحوم ہیں۔ ایک واقعہ تو یہ کہ جب نڈۃ العلماء کا امرتسر میں پہلا جلسہ ہوا تو مولانا سید عبدالجبار صاحبؒ بقید حیات تھے اور قرآن مجید کا درس دیتے تھے۔ یہ درس بہت سادہ اور بے تکلف ہوتا تھا۔ مولانا شبلی نعمانیؒ ایک مرتبہ اس درس میں شریک ہوئے۔ واپس آکر انہوں نے شیروانی صاحب سے بیان کیا کہ مولانا عبدالجبار صاحبؒ اپنی زبان سے اللہ تعالیٰ کا نام لیتے تھے اور نام پاک اللہ ان کی زبان سے نکلتا تھا،

تو بے اختیار یہ جی چاہتا تھا کہ سران کے قدموں پر رکھ دیا جائے۔

دوسرا واقعہ یہ تھا کہ ندوۃ العلماء کے جلسہ میں شریک ہونے والے علماء اور باہر کے ممالوں کی کسی جگہ دعوت تھی۔ ایک بہت بڑا طویل دالان تھا جس میں کئی درجے تھے ایک طرف کے بیٹھنے والے دوسری طرف کے بیٹھنے والوں کو دیکھ نہیں سکتے تھے۔ ایک درجہ میں مولانا سید محمد علی مونگیریؒ بانی و ناظم ندوۃ العلماء شریک دسترخوان تھے، دوسری طرف ایک دوسرے درجہ میں کچھ اور رہا تھا، کھانے سے فارغ ہونے کے بعد مولانا محمد علی صاحب مونگیریؒ نے شیروانی صاحب سے پوچھا کہ جس طرف آپ بیٹھے ہوئے تھے اس طرف اور کون کون تھا۔ انہوں نے چند معززین علماء کا نام لیا۔ مولانا محمد علی صاحب ہر ایک نام پر فرماتے جاتے تھے کہ کوئی اور بھی تھا؟ جب انہوں نے مولانا عبدالجبار صاحب غزنویؒ کا نام لیا تو مولانا نے فرمایا کہ ہاں اسی وجہ سے میرا دل بے اختیار اس طرف کھینچ رہا تھا۔

ان دونوں باپ بیٹوں کے علاوہ میں نے خاندان میں مولانا عبدالواحد صاحب غزنویؒ کا بھی ذکر خیر سنا تھا، لیکن اس وقت تک اس خاندان کے کسی بزرگ کی زیارت کا موقع نہیں ملا تھا۔ ۱۹۲۸ء میں مولانا داؤد غزنوی صاحب نے امرتسر سے ”توحید“ کے نام سے ایک رسالہ نکالنا شروع کیا۔ یہ رسالہ ہمارے یہاں بھی آتا تھا، غالباً اسی سہ ماہ کے اخیر میں اس میں مولانا محی الدین صاحب قصوری کے قلم سے ایک سلسلہ مضامین نکلنا شروع ہوا جس کا عنوان تھا ”تیرھویں صدی کا مجاہد اعظم“ یہ حضرت سید احمد شہیدؒ اور ان کے رفقاء کا تعارف اور ان کے مجاہدانہ کارناموں کا تذکرہ تھا۔ برادر معظم ڈاکٹر حکیم مولوی سید عبدالعلی صاحب مرحوم کے حکم سے میں نے اسی زمانہ میں اس کا عربی میں ترجمہ کیا جو ”ترجمۃ السید الامام“ کے عنوان سے مصر کے مشہور رسالہ ”النار“ میں شائع ہوا۔ اس کے کچھ عرصہ کے بعد مئی ۱۹۲۹ء میں میں پہلی مرتبہ لاہور گیا۔ میرے چھوٹے بھائی مولانا سید طلحہ صاحب ایم اے اور ٹیٹل کالج میں پڑھاتے تھے۔ یوں تو لاہور کے ممتاز اہل علم و اہل ذوق سے ان کا تعارف اور ان کے تعلقات تھے اور اس

وقت کی اکثر اہم علمی شخصیتوں سے انہوں نے مجھے ملایا۔ لیکن غزنوی خاندان سے دیرینہ تعلقات کی بنا پر اس خاندان کے بزرگوں سے ان کے خصوصی روابط و مراسم تھے۔ پہلی مرتبہ مولانا داؤد غزنویؒ سے ملنا ہوا۔ ان کی وجاہت، ان کا پُر زور اور دکھتا ہوا چہرہ، افغانی عربی حُسن و وجاہت کا دلآویز امتزاج، ان کی پُرکشش شخصیت اسی وقت سے ذہن میں مرتسم ہے۔ اس زمانہ میں خواجہ عبدالوہید صاحب (جو اب کلچر رہتے ہیں) کے مکان پر مجھے یاد نہیں ہر سفتہ یا مہینہ میں ایک دو بار کسی ممتاز عالم یا کسی نامور شخصیت کی دینی تقریر ہوتی تھی۔ مختصر لیکن منتخب مجمع تھا جس میں زیادہ تر جدید تعلیم یافتہ حضرات ہوتے تھے۔ میں جس صحبت میں شریک ہوا اس میں مولانا داؤد غزنویؒ کی تقریر تھی۔ انہوں نے سورہ بقرہ کی ان آیات پر تقریر کی:

وَإِذْ أَخَذْنَا مِيثَاقَكُمْ لَا تَسْفِكُونَ دِمَاءَكُمْ وَلَا تُخْرِجُونَ أَنْفُسَكُمْ مِنْ دِيَارِكُمْ ثُمَّ أَقْرَدْتُمْ وَأَنْتُمْ تَشْهَدُونَ - ثُمَّ أَنْتُمْ هَؤُلَاءِ تَقْتُلُونَ أَنْفُسَكُمْ وَتُخْرِجُونَ فَرِيقًا مِّنْكُمْ مِنْ دِيَارِهِمْ تَظَاهِرُونَ عَلَيْهِمْ بِالْإِثْمِ وَالْعُدْوَانِ وَإِنْ يَأْتُوكُمْ أُسْرَىٰ فَذُوهُمْ وَهُمْ وَهُوَ مُحَرَّمٌ عَلَيْكُمْ إِخْرَاجُهُمْ أَفَتُؤْمِنُونَ بِبَعْضِ الْكِتَابِ وَتَكْفُرُونَ بِبَعْضٍ فَمَا جَزَاءُ مَنْ يَفْعَلْ ذَٰلِكَ مِنْكُمْ إِلَّا خِزْيٌ فِي الْحَيَاةِ الدُّنْيَا وَيَوْمَ الْقِيَامَةِ يُرَدُّونَ إِلَىٰ أَشَدِّ الْعَذَابِ وَمَا اللَّهُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُونَ -

ان آیات کی تفسیر کر کے انہوں نے اسکی ہندوستان کے مسلمانوں پر منطبق کیا اور بتایا کہ کس طرح ان کا ایک گروہ انگریزوں کے جھنڈے کے نیچے اپنے دینی بھائیوں سے ہندو اور قتل العارہ اور ترکیہ کے میدانوں میں لڑتا تھا اور دوسرا گروہ یہاں ترکوں کے لیے چنہ کرتا تھا اور خلافت اسلامیہ کی بقا و تحفظ کے لیے کوشاں تھا۔ ان کی پُر از اعتماد خطابت مسانت اور تقریر کی شستگی کا نقش دل پر قائم ہے۔

لاہور کے قیام کے زمانہ میں جس کی تقریباً ہر دو برسے تیس برسے سال نوبت آتی تھی، مولانا

سے کہیں نہ کہیں مناہر جاتا تھا اور عید کی نماز تو بالعموم انہیں کے پیچھے منٹو پارک میں پڑھنے کی سعادت حاصل ہوتی تھی۔ مجھے یاد ہے ایک مرتبہ صبح کی ہوا خوری میں کہیں ان سے ملاقات ہوئی۔ اس زمانہ میں وہ شیخ الاسلام ابن تیمیہ کی کتاب ”النبوات“ کا مطالعہ کر رہے تھے اور اس سے بہت متاثر تھے اور متعدد مقامات کی نشاندہی فرماتے اور شیخ الاسلام کی تحقیقات کا بڑے ذوق و شوق کے ساتھ حوالہ دیتے۔ افسوس ہے کہ اپنی طالب علمانہ مصروفیت اور مولانا کی سیاسی اور اصلاحی مشغولیتوں کی وجہ سے پھر سن و علم میں بڑے تغاوت کی بنا پر کچھ زیادہ ہمیشگی و صحبت کا اتفاق نہیں ہوا، البتہ ان کی بزرگانہ شفقت اور عزیزانہ محبت کا کیف ہمیشہ محسوس کرتا رہا۔

لاہور کی ایک حاضری کے موقع پر انہوں نے میری حقیر ذات کے ساتھ اپنی محبت کا خصوصی اظہار فرمایا اور دارالعلوم تقویۃ الاسلام کے ہال میں ایک عصرانہ کا انتظام کیا۔ اس موقع پر نیز مقدمی اور تعارفی تقریر مولانا سید داؤد غزنوی نے فرمائی۔ یہ ان کی بڑی کسرتی، خورد و نوازی اور تواضع تھی اور میرا بڑا اعزاز۔

ع کلاہ گوشہ دہقان بہ آفتاب رسید

میں نے اس کا شکریہ ادا کرتے ہوئے جماعت اہل حدیث کی خصوصیات اور اس جامعیت کا تذکرہ کیا جس کا کامل مظاہرہ حضرت مولانا اسماعیل شہید اور ان کے عالی مقام رفقا نے کیا تھا۔

اس کے بعد عصر تک مولانا سے نیاز حاصل نہیں ہوا۔ مئی ۱۹۶۲ء میں جامعہ اسلامیہ مدینہ منورہ کی دعوت پر حجب حجاز حاضری ہوئی تو مولانا مرحوم سے بار بار ملاقاتیں اور کچھائی رہی وہ بھی جامعہ کی مجلس مشاورت کے رکن تھے۔ مدینہ طیبہ میں بھی جامعہ کے جلسوں میں اور مکہ معظمہ میں بھی رابطہ عالم اسلامی کے جلسوں میں قریب ہی بیٹھنا ہوتا اور ملاقات ہوتی رہتی ہم دونوں کو کاہنہ مصر میں مقیم تھے، مئی میں بھی اسی ہوٹل کی طرف سے جہاں انتظام کیا گیا تھا میں اور

مولانا مقیم ہوئے۔ اتفاق سے جگہ بھی ملی ہوئی تھی۔ مدینہ طیبہ کے زمانہ قیام میں مولانا کو طبعی دورہ پڑا۔ ایک دو راتیں بڑے خطرے اور پریشانی کے ساتھ گزریں۔ علالت کی خبر سن کر جب عیادت کے لیے حاضر ہوا تو ان کو بڑا نڈھال پایا۔ معالجن کی رائے تھی کہ مولانا اپنے مستقر پر واپس تشریف لے جائیں، اللہ تعالیٰ نے انکو خیریت کے ساتھ پہنچا دیا۔ اس کے بعد بھی سال ڈیڑھ سال وہ اسی دُنیا ئے فانی میں رہے (اگرچہ بیماری کے ان پر شدید حملے ہوئے لیکن وہ جانبر ہو جاتے تھے، اچانک ان کی وفات کی اطلاع ملی) نہ صرف خاندان غزنوی اور نہ صرف جماعت اہل حدیث بلکہ اس بزرگ عظیم (پاکستان و ہند) کے دینی و علمی حلقے میں اور علماء کی صفِ اول میں ایک باوقار کرسی خالی ہو گئی جس کا پُرہ ہونا آسان نہیں معلوم ہوتا۔ مولانا کی دلآویز شخصیت، اُن کا فکری توازن اور اعتدال، اُن کے وسیع روابط، ان کی مجاہدہ سرگرمیاں، ان کا علمی ذوق، عقائد اور اپنے مسک میں سختی اور استقامت کے ساتھ سلف کا عمومی احترام خاندانی ذوق اور روحانی چاشنی۔ یہ سب وہ خصوصیات ہیں جن کے حامل بہت کم نظر آتے ہیں۔ اُنہوں نے اپنے خاندان و اخلاف کے لیے بالخصوص اور جماعت کے لیے بالعموم ایک ایسی مثال اور ایک ایسا نمونہ چھوڑا ہے جس کی پیروی اگرچہ مشکل ہے لیکن نہایت ضروری۔ اللہ تعالیٰ ان کے جانشینوں کو اس کی توفیق عطا فرمائے۔

مولانا سید محمد اود غزنویؒ

اسلام اور آزادی کا ایک بلند منزلت مجاہد

مولانا غلام رسول مہر

آزادگاہ بجائے رسیدند و ماہماں زماں رہرواں کہ گرد پس کاڑاں محمد
 مولانا سید محمد داؤد غزنوی مرحوم و مغفور نے اس گھرانے میں آنکھ کھولی تھی جس کے نزدیک
 علم و فضل سب سے بڑی دولت، زہد و تقویٰ سب سے بڑا سرمایہ اور عشق کتاب و سنت گزراں بہا
 توشہ تھا اور اسی فضا میں انہوں نے تربیت پائی اور یہی فضا آفرم تک ان کے قلب و روح کے
 لیے بہترین آرام گاہ بنی رہی۔ ان کے جدِ ماجد مولانا سید عبداللہ غزنوی نے حق و صداقت کی راہ میں
 جو مشقتیں اور آزمائشیں اٹھائیں، ان کا تصور بھی دل پر لرزہ طاری کر دیتا ہے۔ وہ تنہا ایک طرف
 اور پڑری مملکت دوسری طرف تھی، مگر مولانا سید عبداللہ مرحوم و مغفور کے پائے ثبات و استقلال
 میں خفیف سی لرزش بھی رُومانا نہ ہوئی۔ گھر بار چھوڑ دیا، وطن سے نکل آئے، عزیزوں اور عزیزوں
 سے مفارقت گوارا کر لی لیکن جن باتوں کو وہ حق سمجھتے تھے ان سے تنگ برابر قائم رکھا۔ یہی کیفیت
 اپنے اپنے وقت میں ان کے فرزندوں خصوصاً مولانا سید محمد داؤد غزنوی کے والد ماجد مولانا سید
 عبدالجبار غزنوی اور عم محترم مولانا سید عبدالواحد غزنوی کی تھی۔ میں مولانا سید عبدالجبار غزنوی کی
 زیارت سے مشرف نہ ہو سکا۔ مولانا سید عبدالواحد مرحوم کی خدمت میں بارہا حاضر ہوا۔ خدا شاہد ہے
 کہ ان کے فیضِ صحبت سے دل میں حبِّ دین کا چہنہ اُبلنے لگتا تھا۔

یہ نہایت عزیز و گرانقدر میراث تھی جو عنفوانِ شباب میں مولانا سید محمد داؤد غزنوی کے
 حوالے ہوئی۔ انہوں نے اس کا حق ادا کرنے میں تا بہ مقدور سعی کا کوئی دقیقہ اٹھانا نہ رکھا۔ یہ
 واقفِ حال اعتراف کرے گا کہ وہ جوشِ عمل، کمالِ خلوص، ہمت و استقامت اور اقدارِ ثبات

میں اپنے اسلافِ کرام سے قریب تر تھے اور باری تعالیٰ کے لطف و کرم سے امید ہے کہ وہ درجے اور اجر میں بھی قریب تر ہی ہوں گے۔

جامع اوصاف شخصیت

پھر انہوں نے اسلامی زندگی کے جس مقدس ماحول میں تربیت پائی تھی، وہ آج ناپید ہے۔ ان کا علم و

فضل، ان کا نعم و ذکا، ان کی مناسبت و ثقاہت، ان کا تدبیر، ان کی نقاہت، تخریر و تقریر میں کیسا شان و دلآویزی، پھر معاملے میں دین کو مقدم رکھنا اور ہر دینی فرض کو انتہائی اخلاص سے انجام دینا، یہ اور ایسے دوسرے محاسن و فضائل آج ایک شخصیت میں کیونکر جمع ہو سکتے ہیں؟ کہاں جمع ہوئے ہیں؟ تربیت کی کونسی آغوش ہے جس میں یہ اوصاف فروغ پاتے اور پروان چڑھتے ہیں؟ وہ ایک فرد نہیں بلکہ ایک مجلس، ایک انجمن اور ایک جماعت تھے۔ وہ رخصت ہوئے تو نہیں ہوش آیا کہ ہمارے درمیان سے ایک فرد نہیں اٹھا جو بہر حال زندگی کے آخری مراحل میں پہنچا ہوا تھا، بلکہ انسانی خوبیوں اور اخلاص عمل کی زینتوں اور زیبائشوں کا ایک جگمگاتا تھا جو اس کے ساتھ شخصیت ہو گیا۔ وہ ایک شمع نہیں بجھی بلکہ اس کے ساتھ فضائل کی کئی شمعیں بجھ گئیں۔ ہم ان کے خطبات و ارشادات سے ہی نہیں بلکہ ان کی شخصیت سے بھی اندازہ کر سکتے تھے کہ جو بزرگ اس دُنیا میں ہمارے درود سے پیشتر اٹھ گئے، وہ کیسے تھے؟ ان کے طور طریقے کیا تھے؟ وہ کن محاسن و محامد سے مزین ہونے کے باعث اکرام و احترام کے درجے پر پہنچے تھے۔ اب ایسے آئینے بھی شاذ ہی نظر آتے ہیں جن میں ہم اسلاف کی صورتیں دیکھ سکتے ہیں، اَلَا مَا شَاءَ اللہ۔

میں نے اختصاراً جو کچھ عرض کیا، اس کا مقصد مدعا محض یہ ہے کہ ہم سمجھ سکیں مولانا سید محمد داؤد مرحوم کی شخصیت کا مقام و مرتبہ کیا تھا۔

میں نے مولانا داؤد کو سب سے پہلے نومبر ۱۹۴۱ء میں دیکھا جب

دین و آزادی کی راہ میں قربانیاں

تذکرہ مولانا کی تحریک ایک ٹیونز کی شکل اختیار کر چکی تھی اور برٹیلہ ہال لاہور میں جمعیت العلماء

کا اجلاس مولانا ابوالکلام آزاد مرحوم و مغفور کی زیر صدارت منعقد ہوا تھا۔ مولانا داؤد غالب مجلس استقبالیہ کے سیکرٹری تھے۔ وہ اس سے پیشتر قومی وطنی تحریک میں شامل ہو کر ایک ممتاز درجہ حاصل کر چکے تھے۔ ان کے بہت سے رفیق قید ہو چکے تھے اور وہ خود بھی اجلاس سے کچھ مدت بعد گرفتار ہوئے۔ مقدمہ چلا اور قید کی سزا پا گئے۔

وہ کانگریس میں بھی شامل تھے کیونکہ آزادی وطن کے لیے جہاد ان کے نزدیک ایک اہم ملکی فرض ہی نہیں تھا دینی فرض بھی تھا۔ وہ مجلسِ خلافت کے سیکرٹری اور وہ رہنماؤں میں گنے جاتے تھے کیونکہ جزیرۃ العرب کی تقدیس اور مملکتِ ترکیہ کی حفاظت کو ایک مقدس اسلامی خدمت سمجھتے تھے اور جمعیتہ العلماء کے بھی اکابر میں شمار ہوتے تھے کیونکہ مسلمانوں کی دینی رہنمائی اس ذریعے سے بہتر طریق پر انجام پاسکتی تھی اور مذہبی تنظیم کا صحیح راستہ یہی تھا۔

پہلی قید کے بعد بھی مولانا کو بار بار دینی، ملی اور وطنی فرائض کی بجا آوری میں قید و بند کی مشقتوں سے سابقہ پڑتا رہا۔ انہوں نے ہر فائدہ کا مقابلہ بے مثال صبر و استقامت سے کیا۔ ہر مرحلے پر وہ استقلال کی چٹان بنے رہے۔ عزیمت کی راہ پر چلنا ان کے خاندان کا ایک نہایت عزیز و فرزند تھا۔ یہ راہ انہوں نے زندگی بھر نہ چھوڑی۔ ہر انسان کی موت کا ایک دن مقرر ہے اور اس میں تقییم و تالیف نہیں ہو سکتی، لیکن اگر کہا جائے کہ ان کی صحت انہیں قیدوں اور راہِ حق کی مشقتوں میں تباہ ہوئی، تو یقیناً یہ مبالغہ نہ سمجھنا چاہیے۔

واضح رہے کہ آج یہ حالات محض ایک سرگزشت کے طور پر عرض کیے جا رہے ہیں اور یہ ایک مقالہ ہے کتاب

جہادِ آزادی میں سبقت

نہیں۔ جن اصحاب نے اپنی آنکھوں سے یہ سب کچھ دیکھا ہے یا خود ان مشقتوں کے خار راز سے گزرے ہیں وہی مذکورہ بالا قریبانیوں کا صحیح اندازہ کر سکتے ہیں۔ جو بھائی یہ دور گزر جانے کے بعد پیدا ہوئے یا جنہوں نے بعد میں ہوش سنبھالا، وہ محض الفاظ کی بنا پر حقیقی کیفیت کا تصور نہیں کر سکتے۔ آج فضا کا نقشہ بالکل بدلا ہوا ہے بلکہ پچیس برس پیشتر بھی اس میں خاصا تغیر پیدا ہو چکا تھا، لیکن

جب مولانا داؤد اور ان کے ہزاروں رفیقوں نے ترکِ موالات کے پروگرام کو لباسِ عمل پہنایا تھا اور قربانیوں کی امتحان گاہ میں مردانہ وار قدم رکھا تھا، تو حکومتِ برطانیہ پہلی عالمی جنگ میں کامیابی حاصل کر کے دُنیا کی ایک بے پناہ قوت بنی ہوئی تھی اور اس قوت کے غرور و تکبر پر ضربیں لگانا درحقیقت ایک آہنی دیوار سے سرخڑانا تھا جن مجاہدوں نے اس حصار کی بنیادوں میں تزلزل پیدا کرنے کا بیڑا اٹھایا تھا ان کی غیرت و حمیت، شانِ استقامت، کمالِ عزیمت اور بے لوث ایثار میں کسی کے لیے بھی کلام کی گنجائش نہ تھی۔ تاہم مادی قوت کے ہمالیہ کو زریزہ زریزہ کر ڈالنا آسان نہ تھا۔ ان مجاہدوں کے سامنے یہ امر نہ تھا کہ نتیجہ مقصد کے مطابق برآمد ہوگا یا نہ ہوگا۔ محض یہ تھا کہ ادائے فرض کا تقاضا کیا ہے۔ البتہ وہ جانتے تھے اور یقین رکھتے تھے کہ باطل لظاہر کتنا ہی مضبوط و مستحکم کیوں نہ ہو وہ حق کے سامنے ٹھہر نہیں سکتا اور یہی ہوا۔ وہی ضربیں تھیں جنہوں نے پہلی مرتبہ یہاں برطانوی تسلط کے حصار میں رخنے پیدا کیے۔ پھر بار بار کے اقدامات سے وہ رخنے بڑھتے اور پھیلنے لگے یہاں تک کہ برطانوی تسلط ایک افسانہ پارینہ بن کر رہ گیا۔

اگر حق و انصاف اس دُنیا سے رخصت نہیں ہو گئے، تو کون ہے جو ان مجاہدوں کے احترام میں ایک لمحے کے لیے بھی متائل ہوگا جو سب سے پہلے آگے بڑھے اور جنہوں نے مہراول میں ہونے کا شرف حاصل کیا۔ یہی لوگ تھے جنہوں نے بجز اور افتادہ زمینوں کو جانفشانیوں اور سر بازوں سے ہموار کیا۔ ان میں نہریں جاری کیں۔ کیا یہ امر محلِ تعجب اور باعثِ حیرت نہیں کہ آج ان زمینوں کی پیداوار سے فائدہ اٹھانے والے لوگ پنشنروڈوں کی محنتوں اور مشقتوں سے بے پروا ہو جائیں یا انہیں فراموش کر دیں؟

مجھے انتہائی افسوس ہے کہ پچھلے دنوں ہمارے ایک بھائی نے غلط مقدمات کی بنا پر ایک غلط نتیجہ پیش نظر

ایک افسوسناک معاملہ

رکھ کر مولانا داؤد کے متعلق ایسے الفاظ استعمال کیے جو موت کی سوگاری کے موقع پر کسی کے لیے بھی زیبا نہیں سمجھے جاسکتے۔ مختلف امور و معاملات کے باب میں رائے کا اختلاف اور فکرو نظر

کائنات کوئی نادیدہ واقعہ نہیں۔ حسب تک انسان اس دُنیا میں موجود ہیں یہ تفاوت و اختلاف موجود رہے گا۔ مگر اس کی بنا پر محکم بنیادی خدمات کو فراموش کر جانا اور جزئیات کو محل نزاع بنا نا اور وہ بھی سراسر غلط مفروضات کی بنا پر نہایت افسوسناک ہے۔

کبھی آپ نے سوچا کہ اس ذہنیت کی بہتیت ترکیبی کیا ہے؟ محض یہ کہ حسب اپنے دامن میں فضائل و محاسن کے وہ جواہر ریزے موجود نہیں جن سے مولانا داؤد مرحوم اور ان کے ہزاروں رفیقوں کے دہن مال مال ہوئے، جب وطنِ ملت اور دین کے لیے ایثار کی وہ متاعِ عزیز نصیب نہ ہو سکی جو مولانا داؤد اور ان کے رفیقوں کی زندگی کا خاص سرمایہ ہے، تو مناسب یہی ہے کہ آج جواہر ریزوں اور اس متاعِ عزیز پر غلط بیانی اور سختی شناسی کا پردہ ڈال کر اپنے لیے ایک مقام پیدا کیا جائے۔ لیکن یہ بُری حرکات ہیں اور اس قسم کی حرکات سے نہ حسنِ عمل کی روشنی ماند پڑ سکتی ہے اور نہ بے عملی کا اندھیرا اجالا بن سکتا ہے۔

میرے سامنے اس مسئلے کے متعدد پہلو ہیں جن پر بحث کروں تو مقالہ بہت طویل ہو جائے گا لیکن میں اپنے غلط بھائی سے صرف یہ پوچھنا چاہتا ہوں کہ شخصیتوں کے موازنے کا جو معیار اس کے پیش نظر ہے اس کی بنا پر وہ کہیں، ملتِ اسلامیہ کے مجاہد قرار دیتا ہے؟ کیا ان لوگوں کو جن کی صفیں مختلف الزامات کے سلسلے میں خاص وقت کے لیے سیاسی دائرے سے باہر نکل چکی ہیں یا نکالی جا چکی ہیں اور آج ان کی مزعوم عظمت کے کھنڈر جا بجا دیکھنے والوں کے لیے سرمایہ عبرت ہیں؟ ان کی خدمات کا جائزہ لے کر فیصلہ کرنے والے بھی موجود ہیں۔ کیا یہی حقیقت کافی بصیرت افزا نہیں؟

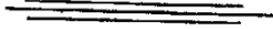
بہر حال میں ایک بلند منزلت عالم، ایک عالی ہمت اور دنیاک مجاہد آزادی و اسلامیت کے تذکرے کو

ایک واجب الاحترام مجاہد

ایسی ناخوشگوار بحث سے آلودہ نہیں کرنا چاہتا۔ مولانا داؤد اس دور کی ایک بہت بڑی شخصیت تھے۔ دورِ روز تک نظر جاتی ہے مگر ایسا جامع اوصاف و وجود کہیں نظر نہیں آتا۔ زندگی میں ان سے بیسیوں افراد کو اختلافات بھی پیش آئے اور خود مجھے بھی بعض اوقات ان سے اختلاف کرنا پڑا۔

لیکن یہ بہت ہی چھوٹی اور حقیر باتیں ہیں۔ ان کا مطلب ہرگز یہ نہیں کہ مولانا کی عظمت، ان کی عزیمت ان کے ایثار، علم و فضل، زُہد و تقویٰ اور عشقِ دین سے قطع نظر کیا جائے۔ انہوں نے عنفوانِ شباب سے کم و بیش تینس برس تک ملک و قوم اور دین کے لیے مجاہدانہ خدمات انجام دیں اور جب ان کی صحت اچھی نہ رہی تو وہ گوشہ نشین ہو گئے اور یہ دور بھی انتہائی سلامت و ہی سے گزارا۔ کبھی کسی سے پر خاشن گوارا نہ کی۔ اچھے اور نیک کاموں میں سب کا ساتھ دیا۔ وہ فطرتاً متوازن اور مستقیم تھے۔ اختلاف رائے کے وقت بھی سب کے ساتھ محبت ایسی خواہی اور زیر گالی کا برتاؤ جاری رکھا۔ عداوت کو ان کے دلی خلوص کی منزل میں کبھی باز نہ ملا۔ وہ اس اسلامی تافلہ کے آخری افراد میں سے تھے جن کی خدمات کے نقوش دورِ حاضر کی تاریخ کا ایک بیش بہا سرمایہ ہیں۔

واخر دعوانا ان الحمد لله رب العالمین والعاقبۃ للمتقین



حضرت مولانا داؤد غزنویؒ

چند تاثرات

مولانا محمد ضیف ندوی

مولانا مرحوم کی زندگی کے متعدد گوشے تھے۔ انہوں نے ایک زمانے میں جہاں مندریں کو زینت بنی تھی اور اپنی چچی ٹلی تقریروں سے ایک نئے اسلوب کی طرح ڈالی تھی اور محرابِ منبر سے کلمہ حق بلند کیا تھا اور وعظ و ارشاد سے دلوں کو گرمایا اور متاثر کیا تھا وہاں انگریزی استعمار کے خلاف معرکہ آرائیوں میں شجاعانہ حصہ بھی لیا تھا۔ سیاسیات کے خازن میں ان کی نیاں اور ابھری ہوئی شخصیت کی حیثیت سے لائقِ صد فخر کردار بھی ادا کیا تھا۔ توحید کے نام سے آپ نے ایک بلند پایہ پرچم بھی نکالا تھا جس کی چند ہی اشاعتوں سے یہ توقع اور آرزو دلوں میں مچلنے لگی تھی کہ شاید اہلحدیث کی تاریخ میں کچھ نئے موڑ آنے کو ہیں اور علم و آگہی کے کچھ نئے ابواب کھلنے والے ہیں، مگر افسوس کہ توقع اور آرزو کی بتابیاں پنپ نہ سکیں اور یہ آفتاب تازہ جس کو اہلحدیث کے تنِ مُردہ میں ایک رُوح پھونکنا تھی چند ہی جھبکیوں کے بعد مغرب کے اتھاہ دھندلوں میں غائب ہو کر رہ گیا۔ شاید اس دور کی سیاسی ضروریات نے اچھی طرح بھانپ لیا تھا کہ اس مردِ عظیم سے قلم و قرطاس کی آسودہ فکری کے بجائے رسن و دادر اور طوقِ زندان کی سختیوں کو جھیل لینے کا کام یقیناً زیادہ موزوں رہے گا۔ قضا و قدر کا یہ فیصلہ اپنی جگہ بالکل صحیح سی۔ آپ نے جمعیت العلماء، خلافت، احرار اور لیگ کی تحریکات میں جو عظیم خدمات انجام دیں بلاشبہ ان کو آنے والا مورخ سنہری حروف میں لکھنے پر مجبور ہوگا مگر اس غلش کا کوئی جواب لفظاً بردل بے قرار سے بن نہیں پڑتا کہ اگر مولانا داؤد جیسا طباع

اور ذہین انسان سیاست میں نہ الجھتا اور علم و عرفان کے اس زفرم سے تشنگانِ ادراکِ فیض کی پیاس بجھانے کی کوشش کرتا جس کو حضرت عبداللہ غزنوی رحمۃ اللہ علیہ اور حضرت الامام عبدالجبار غزنوی رحمۃ اللہ علیہ کے ذوقِ اخلاص و زہد نے بہ ہزار سعی و مجاہدہ جمع کیا تھا، تو اس کے نتائج کس درجہ شاندار ہوتے، توحید و سنت کا غلغلہ کتنا بلند ہوتا۔ اشاعتِ سنت کا کام کتنی تیزی سے آگے بڑھتا اور عرفان و سلوک کے دبستان کس کس دلاویزی کے ساتھ مشامِ جاں کو متاثر کرتے۔ زمانہ کی تیز رفتاریاں بھلا کب فرصت عطا کرتی ہیں کہ اس نوع کی عوامِ نعیمیوں کے اظہار پر اپنی توانائیوں کو ضائع کیا جائے۔ تلافیِ مافات کے لیے اب بہاری نظریں مولانا مرحوم کے جواں سال اور جواں فکر فرزند مولانا ابو بکر غزنوی پر گڑھی ہیں کہ وہ اٹھیں اور دعوت و ارشاد کے اس منصب کو سنبھالیں اور تواضع، انکسار اور محبت و توہود کی ان فراوانیوں کے ساتھ جو تصوف و احسان کا خاصہ ہیں، تبلیغ و اشاعت میں نکلیں اور لسان و قلم کی جنبشوں کو اس اوجِ کمال تک پہنچائیں کہ جس تک پہنچانے کی توقع بجا طور پر ان کے علم و فضل سے کی جاسکتی ہے۔ صرف یہی ایک طریق ہے کہ جس سے تاریخ کی ان ستم ظریفیوں کا انتقام لیا جاسکتا ہے جن کی وجہ سے مولانا داؤد غزنویؒ شدید خواہش اور طلب کے باوصف اپنی بے نظیر علمی صلاحیتوں کے اظہار کے لیے ایسے لمحوں اور ایسی فرصتوں سے بہرہ مند نہ ہو سکے جو ان کے فیوض کے دائروں کو وسیع تر کرنے میں مدد و معاون ثابت ہو سکتیں۔ اس دور کی سیاسی مصروفیتوں نے دراصل موصوف کی شخصیت کو اس درجہ گھیر رکھا تھا کہ انہیں کبھی بھی چین سے بیٹھ کر کام کرنے کا موقع ہی نہ ملا۔ میری رائے میں مولانا داؤدؒ اپنے ذوق و مطالعہ کے لحاظ سے کبھی بھی ان معنوں میں سیاسی آدمی نہیں تھے کہ علم اور طلب و تحقیق کے تقاضوں سے روگرداں ہو کر بس سیاست کے ہی ہورہیں، بلکہ اس کے برعکس واقعہ یہ ہے کہ ان کو جب بھی فرصت ملتی یہ سب کام چھوڑ چھاڑ کر اپنی لائبریری میں گھس جاتے اور فرصت کے عزیز ترین لمحوں کو اپنے رفیقانِ ذوق کے ساتھ جی بھلانے میں صرف کرتے۔ کتبِ بنی، مطالعہ اور فقہ و

حدیث کے غوامض پر فکر و تحقیق ان کا خاص مشغلہ تھا۔ ان کی سیاسی سرگرمیاں اس دور کی مجموعی کا نتیجہ تھیں۔

اول اول میں جب ان سے ملا تو ان کے بارہ میں میرا تاثر یہی تھا کہ میدانِ خطابت میں ان کی شعلہ افشائیاں مسلم لیکن حدود و مطالعہ کے اعتبار سے یہ دوسرے سیاسی لیڈروں سے کچھ زیادہ مختلف نہ ہوں گے، مگر یہ دیکھ کر مجھے حیرت انگیز تعجب ہوا کہ قرآن، حدیث اور فقہ میں یہ ان تمام مقامات و رموز سے آگاہ ہیں جو فہم و ادراک کے لیے اچھی خاصی مجتہدانہ کاوشوں کے طالب ہیں۔ مجھے ان کی لائبریری کا جائزہ لینے کا بھی بارہا اتفاق ہوا۔ میں نے دیکھا ہے کہ کوئی اہم کتاب ایسی نہیں اور کسی کتاب کا کوئی اہم باب ایسا نہیں جس پر ان کے حواشی و تعلیقات کی چھاپ نہ ہو۔ خصوصیت سے فقہ و تفسیر کے مسائل پر ان کی نظر بہت گہری تھی۔ یہی وجہ ہے جب وہ کسی استفتاء کا جواب دیتے تو زیر بحث مسئلہ پر اس طرح دلائل کا انبار لگا دیتے کہ اس کا کوئی گوشہ تشنہ و تحقیق نہ رہتا۔ فتویٰ نویسی کا ذکر چھڑا ہے تو ان کی بیخصوصیت سُن رکھیے جو بھلائے نہیں بھولتی کہ اس سلسلہ میں مرحوم صرف کتابوں کے فنون و نصوص سے استفادہ نہیں کرتے تھے بلکہ یہ بھی دیکھتے تھے کہ نفسِ مسئلہ کی معاملات کی رُو سے کیا اہمیت ہے اور اس بارے میں قائلینِ فطرت یا عام سمجھ بوجھ کے تقاضے کیا ہیں۔

ثرف نگاہی کے پہلو بہ پہلو ان میں روشن ضمیری بھی تھی۔ مجھے یاد ہے جب عائلی قوانین پر جمعیت اہلحدیث کی ایک مقرر کردہ سب کمیٹی میں بحث و تخیص ہوئی، تو انہوں نے صاف صاف کہہ دیا کہ ہمارا نقطہ نظر یہ نہیں ہونا چاہیے کہ حکومت کی طرف سے اصلاحات کے نام پر جو قدم بھی اٹھایا جاتا ہے وہ سرتاپا غلط ہے بلکہ یہ دیکھنا چاہیے کہ اس میں کون سے اقدامات صحیح ہیں اور کون سے غلط۔ مولانا مرحوم کا موقف اس سلسلہ میں یہ تھا کہ ہمیں ان مسائل پر سیاسی اور گروہی تعصبات سے بالا ہو کر خالص کتاب و سنت کی روشنی میں غور کرنا چاہیے۔ چنانچہ ان اصلاحات میں اگر دس فیصد بھی ہمارے نقطہ نظر کے مطابق صحیح چیزیں پائی جائیں

تو ہمیں چاہیے کہ بلا لومۃ لائم ہم جہاں تو سے فیصد مسائل میں حکومت کی مخالفت کریں وہاں دس فیصد صحیح اقدامات پر اس کی تعریف بھی کریں۔

پاکستان بن جانے کے بعد مولانا مرحوم کی تمام تر توجہ جمعیت اہلحدیث کی تنظیم پر مرکوز رہی۔ نامناسب نہ ہوگا۔ اگر میں اس مرحلہ پر نظریۃ اہلحدیث کے مخصوص ذہن و مزاج کے بارے میں ان تصورات کی چہرہ کشائی کا فریضہ انجام دوں جو اکثر خلوتوں میں ہمارے ہاں زیر بحث رہے۔ خلوتوں کے لفظ سے کسی قسم کی غلط فہمی کو نہیں ابھرنا چاہیے۔ بات صرف یہ ہے کہ موت سے پہلے ادھر چند سالوں سے میرے ساتھ مرحوم کے تعلقات خاطر اور رسم، رز، کا یہ انداز قائم ہو گیا تھا کہ میں دوسرے تیسرے روز ضرور حاضری دیتا اور اگر میں کسی وجہ سے نہ آتا، تو بلاواتا اور کبھی کبھی خراماں خراماں خود بھی میرے ہاں تشریف لے آتے۔ بہر حال ہم جب بھی ملتے، یہ اہتمام کیا جاتا کہ گفتگو اور بات چیت کے لیے مشکل کیسوی حاصل ہو۔ اس کے بعد مشروبات کا دور چلتا۔ لطائف کا تبادلہ ہوتا اور خالص علمی مسائل پر بحث و تمحیص کے گونا گوں درجوں پر دستک دی جاتی۔ اس میں صرف و نحو، ادب، تفسیر، علم الکلام، فقہ اور حدیث کے خواص پر کھل کر اظہار خیال ہوتا اور اس اثنا میں یہ محسوس کر کے مجھے بے حد مسرت ہوتی کہ روایت و درایت کے فاصلے سمٹ رہے ہیں اور قدیم و جدید کا تضاد دور ہو رہا ہے۔ بارہا ایسا ہوا کہ مولانا نے اپنی دلاویز اور روایتی مکھاہٹ کے ساتھ نہ صرف میرے بعض تفردات فحوی کی پُر زور تائید کی بلکہ اس کے لیے شواہد بھی متبا کیے۔ خلوت کے یہ لمحے علم و تحقیق کی خشک بختوں سے گزر کر آخر تصوف، احوالِ آخرت اور قلب و رُوح کے جائزہ پر ختم ہو جاتے۔ مجھے یہ یاد نہیں کہ اس اثنا میں ہم میں سے کس کی آنکھیں پہلے اشکبار ہوتیں، البتہ اتنا خوب یاد ہے کہ دونوں روتے اور دیر تک روتے رہتے۔

نظریۃ اہلحدیث سے متعلق ان کے ذہن میں تضادات کا ایک واضح نقشہ تھا اور وہ بہ دل چاہتے تھے کہ اس سے غلطی حاصل کرنے کی جدوجہد میں اہلحدیث علماء کو شرکت کی

دعوت دی جائے مثلاً فکر و نظر کا یہ پیمانہ جسے ہم مسلک الہدیت سے تعبیر کرتے ہیں، ایک طرف تو اس بات کا مقصد یہ ہے کہ ہمارا تعلق پورے اسلام سے ہو، کتاب و سنت کے بیان کردہ مکمل نظام حیات سے ہو جس میں عقائد سے لے کر عبادات اور عبادات سے لے کر معاملات و اخلاق تک ہر ہر شے داخل ہو، اس شرط کے ساتھ کہ ہم اس نظام حیات کو براہ راست کتاب و سنتِ رسولؐ اور سلف کی تصریحات سے اخذ کریں۔ ظاہر ہے کہ یہ نقطہ نظر کسی درجے میں بھی جزوی اسلام کا قائل نہیں اور فرقہ وارانہ تعصبات کا عامی نہیں بلکہ ایک طرح کی کلیت اور وسعت و جامعیت اپنی آغوش میں لیے ہوئے ہے۔ لیکن ہمارا یہ حال ہے کہ ہم بہت بحث و مناظرہ کی وجہ سے مسائل کی ان چند گنی چنی دیواروں میں محصور ہو کر رہ گئے ہیں جن کو گروہی عصبيت اور تنگ نظری نے پیدا کیا ہے۔ چنانچہ آج الہدیت کے معنی ایسے گروہ کے نہیں کہ جن کی نظر اسلام کے پورے حکیمانہ نظام پر ہو، جن کے عمل سے اسلام کی تمام اخلاقی، اجتماعی اور روحانی قدروں کا خصوصیت سے اظہار ہوتا ہو اور جو روزمرہ کی عام زندگی میں ہر قدم پر کتاب و سنت کی تصریحات کے متلاشی ہوں۔ آج الہدیت کے معنی اس کے برعکس ایک ایسے شخص یا جماعت کے ہیں جن کی دلچسپیوں کا محور عموماً صرف چند مسائل، چند بحثیں اور چند فرسودہ مناظرانہ کاوشیں ہیں۔

دوسرا تضاد جس کو مولانا مرحوم تصور الہدیت کے بارے میں شدت سے محسوس کرتے تھے، وہ اس دیرینہ تغافل سے عبارت ہے جس کو ہم نے عدم تقلید کے سلسلہ میں روا رکھا ہے۔ عدم تقلید سے مراد صرف یہ نہیں ہے کہ ہمیں مسائل کے اخذ و قبول میں کسی فقہی مدرسہ، فکر کی پابندی نہیں کرنا چاہیے۔ عدم تقلید کا یہ مفہوم محض سلبی نوعیت کا ہے جس سے کسی تہذیبی خاکے کی تعمیر نہیں ہوتی۔ عدم تقلید کے ایجابی اور تہذیب آفرین معنی یہ ہیں کہ جہاں ہمارے لیے یہ ضروری ہے کہ ہم وقت و زمان کے فاصلوں کو پھیلا لنگ کر سمع و اطاعت کی ایک ہی حبت میں اس پاکیزہ ماحول میں پہنچ جائیں جہاں لسان نبوت اور لفظ پیغمبر براہ راست زمرہ پیرا

ہے، وہاں یہ بھی ضروری ہے کہ اس پاکیزہ ماحول، ان قیمتی اقدار اور فخر و نظریہ کی اس وسیع تر فضا کو موجودہ حالات پر بھی منطبق کرنے کی سعی بلیغ کریں اور سوچنے کا اندازوں کو قائم کریں کہ اگر آج اسلام نازل ہوتا ہے اور سائنس اور ٹیکنالوجی کے موجودہ دور میں آنحضرتؐ تشریف لاتے اور پوری انسانیت کو اپنا مخاطب قرار دیتے، تو اسلام کا تصور تائش و صنو، کی کن کن صورتوں پر مشتمل ہوتا۔ مولانا اکثر لکھتے تھے کہ یہ فرض الہدیت پر عائد ہوتا ہے کہ وہ کتاب سنت کی روشنی میں مسائل زیر بحث پر مجتہدانہ غور کریں اور لوگوں کو بتائیں کہ فقہاء متاخرین کے فیصلہ کے علی الرغم اجتہاد کے دروازے آج بھی کھلے ہیں۔ لیکن افسوس کہ ایک عرصہ سے الہدیت اجتہاد کی اہمیت، ضرورت اور فوائد سے نا آشنا ہیں۔

تضاد کی تیسری صورت جس سے مولانا از حد شاکہ اور پریشان تھے، جماعت الہدیت کے مزاج کی موجودہ کیفیت ہے۔ مولانا کے نقطہ نظر سے اسلام چونکہ تعلق باللہ اور اس کے ان انکسارات کا نام ہے جو معاشرہ اور فرد کی زندگی میں لطائف اخلاق کی تخلیق کرتے ہیں۔ اس لیے تحریک الہدیت کا اولین مقصد یہ ہونا چاہیے کہ جماعت میں محبت الہی کے جذبات کو عام کرے۔ تعلق باللہ کی برکات کو بھیلانے اور اطاعت و زہد، اتقا، و خشیت اور ذکر و فکر کو رواج دے، لیکن ہماری محرومی و تیرہ بختی ملاحظہ ہو کہ عوام تو عوام، خواص تک تصوف و احسان کی ان لذتوں سے نا آشنا ہیں۔ حالانکہ کچھ زیادہ عرصہ نہیں گزرا ہے کہ خواص تو خواص ہمارے عوام تک زہد و روح کا بہترین نمونہ سمجھے جاتے تھے۔ آپ پوچھیں گے کہ مولانا مرحوم کے نزدیک ان تضادات سے چھٹکارا پانے کا طریق کیا تھا؟ بارہا یہ مسئلہ مولانا کے ہاں زیر بحث آیا۔ ان کی اس سلسلہ میں چچی تلی رائے یہ تھی کہ ہمیں تعلیم و تربیت کے پورے نظام کو بدنا چاہیے اور اس کو ایسی شکل دینا چاہیے کہ جو جماعت الہدیت کی تعمیر نو کے لیے زیادہ سازگار ثابت ہو سکے اور اس کے فکر و عقیدہ کو ایسی استوار بنیادوں پر قائم کر سکے کہ جن میں تضاد اور الحاد کی خلل اندازیاں نہ پائی جائیں۔ جو ان میں زندگی کی نئی روح دوڑائے۔

حضرت مولانا محمد اود غزنوی

ڈاکٹر سید عبداللہ صاحب

میری دینی تعلیم کا آغاز مدرسہ نعمانیہ لاہور میں ہوا جہاں منجملہ دوسرے اساتذہ کے، میں نے حضرت مولانا غلام مرشد سے بھی اکتساب فیض کیا۔ لیکن نعمانیہ میں میرا قیام کچھ زیادہ نہ ہوا میں تھوڑے ہی عرصے کے بعد ایک دوسرے مسلک کے مرکز یعنی مسجد چینیال والی میں آ پہنچا جہاں حضرت مولانا عبدالواحد غزنویؒ کے درس میں شریک ہوتا تھا اور مرحوم و منفور حافظ محمد حسین (نابینا) سے مشکوٰۃ شریف پڑھنے لگا۔ حافظ صاحب بطور مؤذن لاہور میں مشہور تھے۔ ان کی اذان کی آواز قلب شہر سے چار اطراف حتیٰ کہ شہر سے باہر مزنگ تک سنائی دیتی تھی۔ بڑی شخصیت کے مالک تھے میں اسی زمانے میں مولانا محمد داؤد غزنویؒ سے متعارف ہوا۔ یہ ۱۹۲۲-۲۱ء کی بات ہے۔ وہ اس زمانے میں امرتسر میں رہا کرتے تھے اور گاہے گاہے اپنے بزرگ حضرت مولانا عبدالواحد غزنویؒ سے ملنے آیا کرتے تھے۔

نولہورت، خوش وضع، خوش لباس، خوش گفتار، خوش رفتار۔ سر پر کبھی سفید عمامہ کبھی پٹاوری ننگی، مردانہ حسن کا مثالی نمونہ۔ بے ادبی تو ہے مگر ان کے جمال و جلال پر حیرت موبہانی کا یہ شعر صادق آتا ہے۔

رعنائی و زیبائی و محبوبی و خوبی

کیا بات ہے جو اس قدر دلجو میں نہیں ہے

یہ تحریک خلافت کا دُور تھا۔ وہ کبھی کبھی لاہور کے جلسوں میں تقریر کرنے کے لیے بھی

آتے تھے اور چونکہ میں خود بھی خادمِ خلافت تھا، اس لیے مجلسِ خلافت کے جلسوں میں تقریریں سننے کے لیے جایا کرتا تھا۔ مجھے مولانا داؤد غزنوی کی تقریر بہت اچھی لگتی تھی۔ مولانا کا اندازِ خطابت منفرد تھا۔ صاحبِ عقداً فرید نے لکھا ہے اعلیٰ خطابت کے لیے چار چیزیں لازمی ہیں۔ خطیب کی وجاہت، خطیب کی فصاحت و بلاغت، خطیب کی گونج دار آواز اور خطیب کی مجمع شناسی اور وسائلِ اثر افزائی۔ میں یقین کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ حضرت مولانا داؤد غزنوی کی خطابت میں یہ چاروں اوصاف موجود تھے۔

تحریکِ خلافت و احرار کا ایک بڑا کارنامہ یہ تھا کہ اُس نے بڑے بڑے خطیب پیدا کیے۔ اس میں اکابرِ ترکیب عام کارکن بھی، خطیبانہ اوصاف کے مالک تھے، مولانا ابوالکلام، علی برادران، ڈاکٹر انصاری، حکیم اجل خان، مولانا ظفر علی خان تو خلافت سے قبل ہی روشناسِ خلق ہو چکے تھے، اب ان کے مقابلے میں نسبتاً جوان اور نوجوان خطیب چکے۔ ان میں حضرت سید عطاء اللہ شاہ بخاری کی خطابت کا تذکرہ تو صدیوں کے پہانے سے ناپا جا سکتا ہے، مگر ان کے رفقاء میں مولانا حبیب الرحمن لدھیانوی، مولانا مظہر علی اظہر، خواجہ عبدالرحمن غازی، قاضی احسان احمد شجاع آبادی، صاحبزادہ فیض الحسن اور بالکل نوجوانوں میں شورش کشمیری اور نواززادہ نصر اللہ خان — اور ان کے ساتھ مگر ان سے افضل حضرت مولانا داؤد غزنوی بھی تھے۔

میں نے انہیں افضل خطیب اس لیے کہا ہے کہ ان میں خطابت کے مذکورہ بالا چاروں اوصاف پائے جاتے تھے۔ باتوں میں ایک آدھ وصف کی کمی نظر آتی تھی۔ اگرچہ ان میں سے ہر ایک گوہرِ آبدار تھا مگر غزنوی صاحب کی سی مکمل خطابت ان میں سے کسی کو ملنے نہ تھی۔ ایک بلند مقام و درجہ شخص، اپنی گونج دار آواز کے ساتھ، فقروں کے زیرِ دم میں، عالمانہ رعب و داب کے ساتھ جب فتحِ محکم ہوتا تھا تو شاعرانہ محاورے کے مطابق عنادل بھی ٹھسک کر ڈجانی تھیں۔

اس گروہ میں چودھری افضل حق سب سے کم درجے کے خطیب تھے، مگر جماعت کا دماغ وہی تھے۔ شورش کشمیری کی عمری میں اس قافلے میں شامل ہوئے، اس لیے ادبائیں ان کا

ذکر بزرگوں کے ساتھ نہیں کرتا۔۔۔۔۔ مگر ان کے بزرگ خود کہا کرتے تھے کہ یہ لڑکا ہمارے بعد ہمارے پلیٹ فارم کو چمکائے گا اور بعد میں واقعی اس نے چمکایا۔۔۔۔۔ مولانا عبدالقادر قسوری اس سارے گروہ کے جدِ امجد تھے۔ ثقہ، متین، مدبر، شفیق، پُر سکون۔ بہر صفت موصوف، تقریب بھی اچھی کرتے تھے، مگر وہ تدبر نہ ہی ہوتی تھی اسے خطیبا نہ نہیں کہا جاسکتا۔

یہ مقابلہ میں اس لیے کر رہا ہوں کہ ایک ایسے گروہ میں جس کا ہر فرد کسی نہ کسی طور بحبان بن وائل تھا حضرت مولانا داؤد غزنویؒ فضحا و زحما کے اس ہجوم میں بھی ایک امتیاز ایک الغرض رکھتے تھے۔ جس کی ایک وجہ ان کے خاندان کی مجاہدانہ تاریخ بھی تھی اور ان کی ذاتی فضیلت علمی اس پر مستزاد تھی۔

اس مضمون میں غزنوی خاندان کی سابقہ کہانی شاید بے محل ہوگی، مگر اتنا تو سب جانتے ہیں کہ حضرت مولانا عبداللہ غزنویؒ اپنے عقائد اور نمک بالسنہ کے بارے میں استقامت کی زندگی کے طور پر اپنے وطن سے ہجرت پر مجبور کر دیے گئے۔ وہ اپنے خاندان سمیت پنجاب میں آگئے اور افراد خاندان نے امرتسر اور لاہور میں قیام کیا اور ردِ بدعت اور اثباتِ سنت میں منہمک ہو گئے۔ دعوت و عمر بیت کی یہ روایت خاندان میں مسلسل جاری رہی، چنانچہ آج تک (نہ نعلِ عزیز سید ابوبکر غزنویؒ کی صورت میں) جاری ہے۔

خاندان کے بزرگوں نے جو کچھ کیا وہ ایک الگ داستان ہے۔ حضرت مولانا داؤد غزنویؒ نے تحریکِ خلافت اور اس کے بعد آزادیِ وطن اور قیامِ پاکستان تک تمام تحریکوں میں اس دایست کو سر بزرگ رکھا۔ بارہا قید ہوئے، نظر بند ہوئے، مصائب برداشت کیے، مگر جس راستے کو اسلام اور مسلمانوں کے لیے مفید خیال کیا اس پر قائم رہے۔

مجلسِ خلافت پنجاب کے انقراض کے بعد تحریکِ اعرار میں شامل ہو گئے، اس کے بعد کانگریس کمیٹی پنجاب کے صدر مقرر ہوئے اور آزادیِ ہند کی تحریک کے اس نازک مرحلے میں یہ ثابت کرنے کے لیے کہ مسلمان آزادیِ وطن کے جہاد میں کسی دوسری قوم سے پیچھے نہیں آئیں

نے پنجاب میں عسرت پند مسلمانوں کی قیادت کی اور اس طرح ہندو سماج کے اس طعنے کی تردید کی کہ مسلمانوں کی قوم انگریزی راج کے دوام کی مؤید ہے، لیکن اس کے بعد تاریخ ایک ایسے موڑ پر پہنچ گئی جس پر یہ یقینی سا ہو گیا کہ انگریز اب اس ملک میں دیزنک رہ نہیں سکتا، تو سوال پیدا ہوا کہ انگریزوں کے رخصت ہو جانے کے بعد اس وطن میں مسلمانوں کی علمی اور سیاسی حیثیت کیا ہوگی؟ سچی بات یہ ہے کہ یہ نہایت اہم سوال تھا، مگر عسرت پند مسلمانوں کی اکثریت اس نکتے کو (پورے خلوص کے باوجود) دیکھ سکی اور کانگریس سے کوئی تعلق بخش تو شوق حاصل کیے بغیر، جنگ آزادی کے ختم ہو جانے اور نیا دور شروع ہونے کے بعد بھی اسی پرانے خیال پر قائم رہی کہ انگریزوں سے جنگ فریضہ اولین ہے، باقی بعد میں دیکھا جائے گا۔

عاجز راقم کے خیال میں ہمارے اکابر سے بس یہیں بھول ہوئی۔ درحقیقت دوسری عالمی جنگ کے خاتمے پر انگریزی استعمار کی چولیں ڈھیلی ہو چکی تھیں اور آزادی ہند کا چہرہ نظر آنے لگا تھا، مگر ہمارے اکابر کی انگریز دشمنی نے ان کے دماغوں کو مغلوب کیا ہوا تھا اس لیے وہ نیک نیتی سے اپنے پرانے طریق کار پر جمے رہے۔ لیکن حضرت مولانا داؤد غزنویؒ نے کانگریس کے اندر اعلیٰ عہدے پر فائز رہنے کے باوجود یہ محسوس کر لیا کہ قائد اعظمؒ مسلمانان ہند کے لیے جس سیاسی حیثیت کی توثیق چاہتے ہیں، وہ اس میں برحق ہیں۔ فی الواقعہ وہ وقت آن پہنچا تھا جب مسلمان اپنی مستقل ملی مہنی کو تسلیم کرانے کے لیے متفق و متحد ہو جانے۔ اس بصیرت کی بنا پر حضرت غزنویؒ کانگریس سے الگ ہو کر مسلم لیگ میں شامل ہو گئے۔ اس پر انہیں اپنے پرانے رفقاء کے طعنے بھی سننے پڑے مگر ان کا وجدان صحیح تھا اور اس کی تائید بعد کے واقعات نے بدرجہ و توق کر دی کہ ان کا اقدام بالکل صحیح تھا۔

قیام پاکستان کے بعد حضرت غزنویؒ نے اس ملک کی اسلامی تشکیل کے لیے بڑی تنگ و دو کی اور تحریک پاکستان میں کیے گئے وعدوں کی تکمیل کے لیے جو کچھ ان سے ہو سکا، انہوں نے کیا مگر انکی رُودادِ حیات کا یہ حصہ شاید دوسرے مقالہ نگار قلمبند کر دیں گے، اس لیے اس باب میں میں زیادہ کچھ نہیں لکھتا۔

عمران مآب غزنوی صاحب کی اس سرگزشت میں اپنے حالات و واقعات کا پسند لگانا مجھے اچھا نہیں لگتا۔ اس لیے میں ان سے اپنے تعلقات کا تذکرہ نہیں کرتا؛ البتہ اتنا بیان کر دینے میں کچھ مضائقہ نہیں کہ ان کی خوش اخلاقی، عارفانہ تواضع اور عالمانہ متانت، اور علمی بحث نظر کے دلنشین انداز اور نکو نگیز اسلوب سے وہ لوگ بھی متاثر ہو جاتے تھے جن پر تاثیر کی کبھی توقع نہ ہو سکتی تھی۔ حیرت ہی کا ایک شعر پھر ان کے بارے میں لکھتا ہوں۔

شوق کی ایک نظر میں ہوئے وہ رکبا کل جن پہ صدیوں نہ ہوئی صدقِ فنا کی تاثیر
کچھ آخر میں پاکستان کے رنگِ سیاست سے اندر اندر بیزار اور بائوس نظر آتے تھے مگر کھل کر کچھ نہ کہتے تھے مجھ سے ایک مرتبہ فرمایا کہ حالتِ دگرگوں ہے میں نے پوچھا، کیسے؟ فرمایا: توقع پوری ہوتی دکھائی نہیں دیتی۔ میں نے کہا: کیونکر؟ فرمایا: اسلام کسی کے مد نظر نہیں۔ قائدِ اعظم سے کھلی تپے و فانی ہو رہی ہے۔ لیکن ہمارا فرض اب بھی خیر خواہی ہے ہم پاکستان کے لیے دعا کرتے ہیں۔

اس کے بعد آخر وقت تک پاکستان کے دعا گو رہنے مگر زیادہ وقت اپنے دینی مدرسہ علوم کی تنظیم اور طلبہ کی تدریس و تعلیم میں گزارنے لگے۔

آخری مرتبہ جب ان سے ملا تو بیچارہ تھے، تاہم لہجے میں وثوق تھا۔ مجھ سے فرمایا:
”دین ہی حق المآب ہے۔ ہم جیسے لوگوں کو پھر دین کی نشر و اشاعت میں لگ جانا چاہیے کیونکہ مجھے پاکستان کے افق پر اتحاد و کفر کی آندھیاں اٹھتی نظر آتی ہیں۔ محنت کچھ رائیگاں ہوتی نظر آتی ہے۔ دین اور اہل دین رسوا ہونے والے ہیں۔ ہاں رحمتِ خداوندی کا سہارا ہے۔ لہذا اسی پر توکل اور اسی پر اعتماد ہے۔“

اس روز کے بعد میں ان سے نہ مل سکا اور وہ اسی آشنا میں واصل باللہ ہو گئے۔ صرف جاننے میں ان کے تابوت سے سرسری سی ملاقات ہوئی، مگر انگبار آنکھوں سے ان کی پُر صلال تصویر اب تک آنکھوں کے سامنے ہے۔ خدا تعالیٰ انہیں مغفرت فرمائے اور ہم سب پر اپنا کرم کرے۔

حضرت مولانا محمد اود غزنوی

مولانا منظر علی اظہر

تمام تعریف اس اللہ کے لیے ہے جو اپنے بندوں کو اکثر بلا استحقاق نوازتا ہے اور بالاستحقاق بھی نوازتا ہے، مگر اس کا شکر زیادہ تو وہی ادا نہیں کرتے جن کو وہ بے استحقاق نوازتا ہے۔

بڑے صغیر پاکستان و ہند کی آزادی کے بعد بہت سے لوگ اپنی آزادی پر فخر کرتے ہیں اور انہیں قسمت نے جو مواقع عطا فرمائے ان سے ہیجت و سرور محسوس کرتے ہوئے اترتے ہیں مگر تخریبِ آزادی میں ان کا یا ان کے بزرگوں کا کوئی حصہ نہ تھا۔ انگریزی عہد میں وہ حکومت کی امداد پر قناعت کرتے تھے اور اپنا کلبہ بھرتے تھے۔ ملازمت جاگیر اور حصولِ اراضی وغیرہ ان کے نصب العین تھے جن کے لیے وہ اپنی زندگیاں اور زندگی کی سب کوششیں وقف کرتے تھے اور انگریزوں کی حکومت کے استحکام میں ہی اپنی زندگیوں کی بہتری اور اپنی فارغ البالی کا انحصار سمجھتے تھے۔

لیکن حضرت مولانا محمد داؤد صاحب غزنوی مرحوم و منظوران بزرگوں میں سے تھے جنہیں زندگی کی سولتوں کی بجائے اس کی صعوبتیں پسند آئیں۔ جن لوگوں کو ۱۹۱۸ء کا زمانہ یاد ہے وہی بخوبی سمجھ سکتے ہیں کہ جب ترکوں کو ۱۹۱۸ء میں برطانیہ اور اس کے اتحادیوں کے ہاتھوں شکست ہوئی اور خلافتِ اسلامیہ کے زوال کا وقت آیا تو بڑے صغیر میں مسلمانوں کا کیا حال تھا۔ ایک طرف انگریز اپنی قوت و جبروت پر نازاں تھا، دوسری

طرف اس کے ہمنوا ہندو اور مسلمان جشنِ فتح منا کر اپنے لیے خوشنودی حکومت کی سند حاصل کرنے اور دولت دنیا سے کچھ نفع کمانے میں منہمک تھے اور انگریزوں کو یہ خیال بھی آنے نہ دیتے تھے کہ انہیں ہندوستان کے مسلمانوں سے کوئی خطرہ نہ کیا کچھ پریشانی بھی ہو سکتی ہے۔ وہ زمانہ تھا جب مولانا محمد داؤد غزنویؒ اپنی جوانی کا چڑھاوا لے کر رادھی وطن اور سر بلندی اسلام کی قربان گاہ کی طرف پیش قدمی کرتے ہوئے گھر سے نکلے۔

آج لوگ بحث کرتے ہیں کہ مولانا مرحوم کو سیاست آتی تھی یا نہیں، مگر وہ یہ سوچنے سے قاصر ہیں کہ جو سیاست ان کو آتی تھی اس کا کوئی شاائبہ بھی ان کے نکتہ چینیوں میں موجود تھا یا نہیں۔ جب دُنیا ئے اسلام کی سب سے بڑی سلطنت، سلطنتِ ترکی شکست کھا چکی ہو اور یورپ کے اتحادی اپنے تمام وعدوں کو بھول کر سرزمینِ ترکی پر ہی نہیں بلکہ تمام جزیرۃ العرب پر قبضہ کر رہے ہوں اور عربوں پر مہربانی کرتے ہوئے بھی ان کے ملک کو ہبت سے مختلف حصوں میں بانٹ کر علیحدہ علیحدہ مگر بے حیثیت بادشاہتیں بنا رہے ہوں تاکہ نیم آزاد عرب آپس کی کش مکش میں مبتلا ہو کر کسی متحدہ اقدام یا حکمتِ علی کے قابل نہ رہیں، جب یہودیوں کے لیے فلسطین کا انعام پیش کیا جا رہا ہو اور شام سے لبنان کو علیحدہ کر کے ایک ضلع کے عیاشیوں کی خاطر ایک مفقود حیثیت میں سمیٹنے کے لیے ایک چھوٹی سی حکومت کی تشکیل کی جا رہی ہو، جب خود ہندوستان میں حکومتِ برطانیہ کے ہوا خواہ مسلمانوں کی کوئی کمی نہ ہو، اس وقت بے توپ و تفنگ میدانِ جنگ میں نکلنا اور حکومتِ وقت کی مخالفت کر کے اپنے آپ کو قید و بند کے لیے پیش کرنا کوئی آسان کام نہ تھا۔

وہ زمانہ تھا جب مولانا داؤد غزنویؒ نے ۲۲، ۲۳ برس کی عمر میں اس میدانِ خاردار میں قدم رنج فرمانا گوارا کیا۔ ۱۹۱۸ء کے کرسمس میں حکومت نے جشنِ فتح منانے کا فیصلہ کیا۔ سرکاری آدمی جشن منانے لگے۔ دلی سے علماء کرام نے جشنِ فتح کے بائیکاٹ کی ہدایت

کی اور مولانا جیسے نوجوان حکومت کی مخالفت کے سنگین کام پُرستعد نظر آنے لگے۔ اُس زمانے میں بعض مرتبہ ہمارے جاننے والے بزرگ ہیں بازاروں میں پکڑ کر کھڑے ہو جاتے اور کندھوں پر ہاتھ رکھ کر فرماتے تھے: ”بزرگوں کو شکست ہو گئی، جرموں کو شکست ہو گئی، آسٹریا کو شکست ہو گئی۔ اب تم نیتے بہادر اُٹھے ہو جو انگریزوں کو ہندوستان سے نکالو گے۔ ہوش بھی ہے یا نہیں۔ کیا عقل جواب دے چکی؟“ ایسے سوالوں کا جواب ملنا کوئی مرتبہ دینا پڑا ہوگا۔ ہر کسی کو ایسے سوالوں کا جواب دینا پڑتا تھا۔ اللہ پر یقین اور اس کی قدرتِ کاملہ پر اعتماد کے مخلصانہ جذبے سے ہی ایسے سوالوں کی بوجھاڑ میں ثابت رہا جاسکتا تھا اور جنہیں یہ نعمت عطا نہ ہوئی ہو وہ اس جذبے کی قدر نہیں کر سکتے، اس لیے ان کی آج کی نکتہ چینیوں پر بھی ناراض نہیں ہونا چاہیے۔

انگریز حکام نے آنے والے ہیجان کے مقابلے کے لیے رولٹ بل تیار کیا تاکہ ہر تحریکِ آزادی ہند و آزادی ممالکِ اسلامی کا مقابلہ جبر و تشدد سے کیا جاسکے۔ اس مجوزہ قانون کے ماتحت ملزموں کو وکیل کرنے کی اجازت نہ تھی، نہ وہ اپیل کر سکتے تھے اور نہ ہی قانونی شہادت کی ضرورت سمجھی جاتی تھی، اس لیے عوام و خواص میں ہی نہیں بلکہ حکومتِ ہند کے نامزد ہندوستانی ممبروں میں بھی اس کی سخت مخالفت تھی۔ سرسکرانہ جیسے ممبر قانون نے اس کی مخالفت کی اور اپنے عہدے سے مستعفی ہو گئے۔ اسی طرح اور بڑے بڑے ہندو سرکاری افسروں نے بھی مخالفت کی۔

کانگریس نے ملک کی آزادی کے نام پر، مسلم علماء اور دیگر رہنماؤں نے آزادی ملک اور تحفظِ خلافتِ اسلامیہ کے نام پر حکومت کے نئے مجوزہ قانون کی مخالفت شروع کر دی۔ گاندھی جی نے ۶ اپریل ۱۹۱۹ء کو سارے ملک میں جلسوں کا اعلان کیا اور لوگوں کو ہڑتال کی تلقین کی۔ پورے ملک میں ہر جگہ کاروبار معطل کیا گیا، لیکن امرتسر میں ۶ اپریل سے پہلے ہی ڈاکٹر سیف الدین کچھو اور ڈاکٹر سنجیو پال کو گرفتار کیا گیا

لوگوں میں ہیجان برپا ہوا۔ وہ اکٹھے ہو کر ڈپٹی کمشنر کی کوٹھی پر جانے لگے تاکہ ان کی ہائی کامطالبع کریں۔ ریل کے پل کے قریب پولیس نے راستہ روکا۔ لوگوں کو آگے بڑھنے نہ دیا گیا بلکہ ہجوم کو منتشر کرنے کے لیے گولی چلا دی گئی جس سے کئی لوگ مارے گئے اور بہت سے زخمی ہوئے۔ فساد کرنے والوں کو موقع ملا۔ شہر میں ٹوٹ مار اور آتشزنی کی وارداتیں ہوئیں اور کئی انگریز جو لوگوں کے ہاتھ آئے انہیں قتل کر دیا گیا۔ شہر میں مارشل لا کا اعلان ہوا، مگر چھ روز تک نظم و نسق لوگوں کے ہاتھ میں رہا۔ جلیانوالہ باغ میں روز جلسے ہوتے تھے اور لوگوں کو پرامن رہنے کی تلقین کی جاتی تھی۔

مگر ۱۳ اپریل اتوار کے روز بلیاکھی کے دن جنرل ڈائر اپنی ہندوستانی فوج لے کر آیا اور اس نے جلیانوالہ باغ کے ایک دروازہ پر پہنچ کر جو شمالی جانب تھا، اپنے سپاہیوں کو گولی چلانے کا حکم دیا۔ سپاہیوں نے گولی چلائی اور حیت تک گولیاں ختم نہ ہوئیں اس وقت تک گولی بند کرنے کا حکم نہ دیا گیا۔ سینکڑوں قتل اور ہزاروں زخمی ہوئے۔ مجمع بے طرح منتشر کیا گیا۔ ڈائر انسانی دلوں پر رعب جانا چاہتا تھا لیکن انزائٹا ہوا ملک کے ایک سرے سے لے کر دوسرے سرے تک جوش و ولولہ اور غم و غصہ کی لہریں دوڑ گئیں تحریک مدہم ہونے کی بجائے تیز تر ہوئی اور روڈ وار ڈائر اور ڈائر کی حکمت عملی کو کامیابی نصیب ہوئی۔ اس ماحول میں حکومت کی مخالفت میں امرتسر کے شہر سے نکلنا اور مستقل کام کے لیے تیار ہو کر اپنی جوانی کو ملک و ملت کی خدمت کے لیے پیش کرنا، وہ سیاست تھی جسے مولانا داؤد مرحوم نے اختیار کیا۔ وہ کبھی تحریکِ خلافت کے سلسلے میں قید ہوئے، کبھی تحریکِ کانگرس کے سلسلے میں پابہ زنجیر دکھائی دیئے۔ وہ مجلسِ خلافت پنجاب کے جنرل سیکرٹری بھی رہے اور پنجاب کانگرس کے جنرل سیکرٹری بھی رہے۔

جب مجلسِ خلافت باہمی اختلافات کا شکار ہوئی اور ۱۹۲۹ء میں مجلسِ احرار بنانے کی نوبت آئی تو وہ مجلسِ احرارِ اسلام ہند کے قائم کرنے والوں میں تھے۔ برسوں وہ انگریزوں

اور انگریز پرستوں سے برسہا برس پیکار رہے۔ حضرت مولانا ابوالکلام آزاد مرحوم نے انہیں فرمایا کہ مجھے کانگریس میں آپ کی ضرورت ہے تو آپ نے مجلس احوار سے علیحدگی اختیار کی اور پنجاب کانگریس کے صدر کی حیثیت سے کام کرتے رہے۔ ۱۹۲۶ء میں جب ملک کی تقسیم کا مطالبہ زوروں پر ہوا تو وہ مسلم لیگ میں شامل ہو گئے اور تقسیم کے بعد مسلم لیگی ایم ایل اے کی حیثیت سے کام کرتے رہے۔ انہوں نے عمر بھر ملک و ملت کے لیے بیٹھ بہاقر بنائیاں دیں۔ ساز و سامان کے ساتھ ہم نے محمود غزنوی کو نکلتے دیکھا اور بے سرو سامانی میں ہم نے داؤد غزنوی کو نکلتے دیکھا۔ وہ قیدی بنانے کے لیے نکلا اور یہ قیدی بننے کے لیے نکلے۔

مولانا نے ہمیشہ اپنے مفید مشوروں سے اپنے ساتھیوں کی رہنمائی کی اور اپنی بساط سے بڑھ کر کام کیا۔ مسجد نشید گنج کی تحریک کے زمانے میں انہوں نے ماسٹر تارا سنگھ جی کی صلح کی پیش کش کو قبول کرنے کا مشورہ دیا جس کی تائید سید حبیب مرحوم نے کی، لیکن مولانا ظفر علی خان مرحوم نے کسی ”ذمہ دار افسر سرکار“ کے مشورہ کو مشعل راہ بنایا اور رضی نامہ سے انکار کیا۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہم آج تک منزل مقصود کو حاصل نہ کر سکے۔ اسی طرح اور مسائل میں ہمارے بہت سے دوستوں کو سلجھانے کی بجائے الجھانے کا بہت شوق ہے جس کے باعث مزعومہ ”کامیاب سیاستدان“ اپنی ناکامیوں کے باوجود کامیاب سیاستدان سمجھے جاتے ہیں۔ یہ خدا کی شان ہے کہ آزادی کی جنگ لڑنے والے انگریز کے جانے کے بعد بھی ناکام سمجھے جائیں اور انگریز کے بے دام و بادام غلام اپنی ناکامیوں کے باوجود کامیاب سمجھے جائیں۔

اللہ تعالیٰ مولانا کو اپنے جوار رحمت میں جگہ دے اور ہماری اور

ان کی خطاؤں کو معاف فرمائے۔

سید محمد اود غزنوی

جنگِ آزادی کے سالارِ اول

آغا شورش کاشمیری

۶ دسمبر ۶۲ء کی صبح کو میں نے خواب دیکھا کہ مولانا داؤد غزنویؒ سید عطاء اللہ شاہ بخاریؒ سے معاف فرما رہے ہیں۔ معا آنکھ کھل گئی، مؤذن پکار رہا تھا الصلوٰۃ خیب من النوم — نماز نیند سے بہتر ہے۔ میں خوابوں کے معاملہ میں کچھ زیادہ پریشان ہونے کا عادی نہیں۔ اپنے رتب سے پناہ مانگتا ہوا اٹھ بیٹھا۔ خیال تھا یا ایک دُھندلا سا تصور کہ کوئی کسی بجلی کسی شاخ پر گرنے والی ہے۔ خوابوں کی تعبیر کے بارے میں جو کچھ میں نے پڑھا ہے اس سے مختلف کیا ہو سکتا تھا۔ کوئی دس بجے صبح دفتر میں بیٹھا کام کر رہا تھا کہ ماسٹر تاج الدین الصاری نے یہ خبر بد سنائی کہ مولانا داؤد غزنوی انتقال فرما گئے ہیں۔

مولانا علیہ الرحمہ ہی کے مکان سے فون آیا تھا کہ نونہ کے صبح ایک ایسی حرکتِ قلب بند ہونے سے اُن کا سفر حیات ختم ہو گیا ہے۔ انا ینہ وانا الیہ راجعون۔

خبر اچانک ضرور تھی لیکن غیر متوقع نہ تھی، وہ جانتے ہی والے تھے اور کئی مہینوں سے رختِ سفر باندھ رہے تھے موت نے اُن کے چہرے کو لٹکا جھانکنا شروع کر دیا تھا۔ دل کا پہلا دورہ ہی انہیں ہلا گیا تھا۔ وہ مرنے کے لیے تندرست ہوتے رہے۔ اسی دن کے لیے وہ جی رہے تھے۔ معلوم ہوتا تھا جیسے بیماری اُن کو چاٹ گئی ہے۔ ہڈیوں کا ایک ڈھانچ رہ گیا ہے جس میں نفس کی آمد و رفت کا سلسلہ جاری ہے۔ بیچارہ تو وہ کئی برس سے تھے۔ مگر پچھلے ایک برس سے پتہ چھڑکا موسم شروع ہو چکا تھا۔ ابھی

دو چار ماہ پہلے عبداللہ ملک کی والدہ مرحومہ کا جنازہ پڑھانے تشریف لائے تو چلا نہیں جاتا تھا نہ پہچان سکتے تھے نہ بول سکتے تھے۔ بس جو اس ختمہ کا جھاؤ بھرم باقی تھا۔ دو آدمیوں کے سہارے آئے جنازہ پڑھایا اور چلے گئے۔ میں نے اسی وقت محسوس کیا تھا کہ ایک چلتی پھرتی قبر ہے۔ — مہمان بیک دو نفس۔

نام تو اس صوبہ میں اُن کا اس وقت بھی گونج رہا تھا جب ابھی اس پودے کے نوجوان بساطِ ہستی پر بھی نہیں تھے۔ کوئی پتلا لیس برس پبلک لائف میں بسر کیے، کئی چیٹیوں کے جامع تھے۔ جماعتِ اہلحدیث مغربی پاکستان کے امیر تو تھے ہی، لیکن بہت سے گوشے ایسے تھے جہاں ان کا احترام یکساں جذبے کے ساتھ موجود تھا۔ قرآن کے معانی و مطالب سے کما حقہ آگاہ تھے۔ جتنی تفسیریں بھی کلام اللہ کی لکھی جا چکی ہیں انکے مندرجات سے نہ صرف بخوبی واقف تھے بلکہ ان کے معنوی اختلاف پر بھی تنقیدی نظر رکھتے تھے۔ اسی طرح حدیث و فقہ میں انہیں کمال حاصل تھا۔ اس ضمن میں ان کی تشریحات و تہذیبات کو بھی درجہ اسناد حاصل رہا۔ مرتے دم تک دین کو اپنا ظاہر و باطن بناٹے رکھا۔ غرض ہی اُن کا اوڑھنا بچھونا تھا۔ اسی کے لیے پیدا ہوئے، جوان ہوئے، بوڑھے ہو گئے، حتیٰ کہ اپنے معبودِ حقیقی سے جا ملے۔ اصلاً وہ اُس وہابی تحریک کی گمشدہ تصویروں میں سے ایک تصویر تھے جنہیں انگریزوں نے دار پر کھینچا اور جن کی بدولت برصغیر میں ولولہٴ حریت پیدا ہوا۔ معنًا شاہ اسماعیل شہیدؒ کی جاں ہار فوج کے ایک سپاہی تھے۔

اس حقیقت سے شاید کہ لوگ واقف ہوں گے۔ پنجاب کے علماء میں سے وہ پہلے عالم دین تھے جنہوں نے تحریکِ خلافت کے زمانہ میں انگریزی حکومت کے خلاف اپنا پرچم کھولا۔ پہلے شخص تھے جنہوں نے امرتسر میں انگریزی حکومت کے خلاف وعظ و ارشاد کا سلسلہ شروع کیا اور یہ نثری تاریخ نے اُن کے سپرد کیا کہ وہ سید عطاء اللہ شاہ بخاری کو منبر و محراب کے جہود سے کھینچ کر جہاد و غزوا کے میدان میں اُٹھالائے۔ خود شاہ جی بھی

اعتراف فرماتے تھے۔ یہ واقعہ ہے کہ امرتسر کی دینی زندگی میں سیاسی پہلے ڈالنے کا آغاز انہی کی بدولت ہوا۔ انہیں پنجاب میں علماء کی جنگ آزادی کا پہلا سالار کہا جاسکتا ہے وفات کے وقت اُن کی عمر ستر برس تھی۔ اخباری روایتوں کے مطابق ۱۸۹۶ء میں پیدا ہوئے۔

آپ کے دادا مولانا عبدالغفر نومی افغانستان سے جلاوطن ہو کر آئے تھے۔ ابتداءً دہلی رہے، پھر لاہور چلے آئے۔ آخر امرتسر کو اپنی مستقل قیام گاہ بنا لیا اور وہیں کے ہو کے رہ گئے۔ اُن کی نیک نفسی، روحانی بلندی اور جرأت و استغناء کے متعلق بے شمار واقعات زبانِ نوحا ہیں۔ دو روایتیں علامہ اقبالؒ نے کی ہیں۔

دہلی میں تھے تو ۱۸۵۷ء کی ساڑھ سستی کا زمانہ تھا۔ گورافوج نے چاروں طرف گولیوں سے ہلاکت کا طوفان اُٹھا رکھا تھا۔ مسجدیں اور ان کے گرد و نواح کا علاقہ خصوصیت سے اس قتل عام کا مرکز تھا۔ ظہر کی نماز کا وقت ہوا تو آپ مسجد کے حوض پر آ گئے۔ گویاں چلتی رہیں، راٹی برابر کھٹکا محسوس نہ کیا۔ اس معجزناجرات کو دیکھ کر مقتدیوں نے بھی حوصلہ کیا اور گولیوں کی بوچھاڑ میں وضو کر کے نماز میں لگ گئے۔

دوسرا واقعہ علامہ اقبالؒ نے ایک مکتوب میں لکھا ہے :

”حدیث کا سبق پڑھا رہے تھے کسی نے مطلع کیا۔ آپ کا بیٹا قتل ہو گیا ہے۔ آپ نے یہ اندوہناک خبر سنی، ایک منٹ خاموش رہے پھر درس دینے لگے۔ مولانا داؤد غزنویؒ اسی مومن و مجاہد اور عالم و اشجع انسان کے پوتے تھے۔ اس خاندان کو امرتسر میں جو امتیاز و شرف حاصل ہوا، اسی کا نتیجہ تھا کہ غزنویوں کے نام سے ایک محلہ منسوب ہو گیا۔ اسی محلہ میں مولانا داؤد غزنویؒ نے مدرسہ غزنویہ جاری کیا۔ یہیں سے مہفت روزہ ”توحید“ نکالا۔ پھر اپنے چچا عبدالواحد غزنویؒ کی وفات کے بعد لاہور آ گئے اور یہاں جامع مسجد چینیاں والی میں خطابت کا منصب سنبھالا۔

تحریکِ خلافت میں سیاسی زندگی کی راہ پر نکلے اور اس وقت کلمۃ اللہ اور آوازِ حق بلند کیا جب آزادی کا نام لینے پر زبانیں کاٹ لی جاتیں اور انقلابِ زندہ باد کہنے کی پاداش میں کوڑے لگتے تھے۔ پہلی دفعہ صوبہ میں جمعیتۃ العلماء کی بنیاد رکھی، خلافت کیٹیجی بنائی۔ نتیجہً تین سال بامشقت قید ہو گئی۔ دوسری دفعہ ۱۹۲۵ء میں پھڑے گئے۔ تیسری دفعہ ۱۹۲۷ء میں سائٹن کیشن بائیکاٹ کی تحریک میں دھریے گئے۔

مجلس احرار قائم ہوئی تو اس کے بانیوں میں سے تھے۔ مدت العمر جنرل سیکرٹری رہے۔ تحریکِ کشمیر میں جو سختی دفعہ قید ہوئے۔ دوسری جنگِ عظیم شروع ہوئی تو ڈیفنس آف انڈیا ایجٹ میں گرفتار ہو گئے۔ اور ہندوستان چھوڑ دو کی تحریک میں تقریباً تین سال جیل میں رہے۔ ۱۹۴۵ء میں صوبہ کانگرس کے صدر چنے گئے۔ ایکشن لڑا اور دھاریوال کی لیبر سیٹ سے منتخب ہو گئے۔ ۱۹۴۶ء کے وسط میں کانگرس سے الگ ہو کر مسلم لیگ میں چلے گئے۔ پاکستان بنا تو عوامی لیگ میں آ گئے اور دوبارہ صوبائی اسمبلی کے ممبر منتخب ہوئے۔ غرض اس اعتبار سے وہ ایک سرگرم، مستعد، پُر جوش اور سنگام پُر زندگی رکھتے تھے۔ قدرت نے ان میں ایک بہادر انسان کی بہت سی خوبیاں رکھ دی تھیں۔ وہ سردے سکتے تھے، لیکن ضمیر کا سودا نہیں کر سکتے تھے۔ اس قسم کا کاروبار ان کے خُون ہی سے خارج تھا۔

روایتی علماء کی طرح نہ تو بیوست سے ان کا خمیر اٹھاتا تھا اور نہ وہ اپنے اوپر سختی عاجزی طاری کیے رکھنے کے قائل تھے۔ وہ عاجزوں میں عاجز تھے اور متکبروں میں متکبر۔ وہ ایک سچے موحد تھے۔ انہوں نے شرک سے لے کر برکاز تک کا خوف اپنے دل سے نکال رکھا تھا۔

میرے ساتھ ان کے مراسم ایک زمانہ سے تھے۔ ان تعلقات کی عمر پچیس سال ہو گئی۔ وہ ایک رہنما بھی تھے، بزرگ بھی تھے۔ درست بھی تھے۔ شفیق بھی تھے۔ معلم بھی تھے،

اجلاس کے وہ صدر تھے اور میں آخری مقرر۔ ایک لاکھ سے زائد مجمع۔ مجھ ایسا گنہگار ڈاڑھی مونچھیں صاف، کہاں کہاں سے اللہ والے اور دین والے نہیں آئے تھے۔ میں بول رہا تھا اور مولانا اشکبار تھے۔ اُن کی کورانی ڈاڑھی پرائسوں کے موٹے موٹے قطرے بہ رہے تھے اور کس کس اداسے وہ دعائیں دے رہے تھے۔

غور کرو، رات کہاں سے کہاں آگئی، کتنی گہری ہو گئی۔ دکھیتی آنکھوں اُن لوگوں کا قافلہ ہی رُوپوش ہو گیا، جو ہمارے قافلہ کو آزادی کی منزل پر لائے تھے۔ انہوں نے کتنی جدوجہد کی، کتنی مصیبتیں اٹھائیں، کتنے غم سے، کتنے صدمے برداشت کیے۔ رات اُن کی، دن کسی کا۔ ہمارے ہاں اردو نثر میں پنجابی شعور رچ کرنے کی عادت نہیں کیونکہ قلعہ معلیٰ کی زبان پر آئینج آتی ہے، ورنہ بردا کا یہ مصرع کتنا خوب حال تھا: ع
 بردا سیاں درختوں دی کرے راکی میوہ پکتے نے کھان نصیب والے
 (بردا سیگڑوں درختوں کی آبیاری کرتا ہے مگر جب پھل لگتا ہے تو دوسرے کھا جاتے ہیں) نصیب والے، یعنی محنت اس کی اور حاصل محنت دُوروں کا ہوتا ہے)

مولانا داؤد غزنویؒ

سید رئیس احمد جعفری

مولانا داؤد غزنوی کو دیکھ کر یہ ساختہ اللہ جمیل و یحییٰ الجمال کے الفاظ زبان پر آجاتے تھے، وہ خوب صورت اور خوب سیرت بھی تھے۔ اُن کی شخصیت میں جمال تھا۔ اُن کے لفظ میں جمال تھا، ان کے کردار میں جمال تھا۔

مولانا کا علم و فضل ایک مستقل عنوان کا طالب ہے۔ آپ بڑھئی کے ایسے دو دماغی عالمی سے تعلق رکھتے تھے، جس کے علمی و روحانی فیوض سے پاک و سہل کے لوگ کبھی سبکدوش نہیں ہو سکتے۔ مولانا کو جو علمی اور روحانی میراث ملی تھی وہ اس کے سزاوار بھی تھے اور اہل بھی۔ مولانا نے اگر سیاست کے ہنگاموں سے دامن نہ اُلجھایا ہوتا یا سیاست نے مولانا پر دھاوا نہ بولا ہوتا اور ان کی سرگرمیاں صرف علمی حدود تک محدود رہتیں تو بلاشبہ ان کے فیوض و کمالات لازماً صورت اختیار کر لیتے۔ ہمہ وقتی سیاسی اور جماعتی مصروفیتوں کے باوجود علمی خدمات سے وہ کبھی غافل نہیں ہوئے، ان کے خطبات جمعہ اور فتاویٰ جو مختلف اوقات میں میری نظر سے گزرے، اس حقیقت کے شاہد ہیں کہ ان کا مطالعہ کس درجہ عمیق تھا، آپ معاملات و مسائل پر کس درجہ گہری نظر رکھتے تھے اور جو استفسار ان کے سامنے آتا تھا، اس کے تمام پہلوؤں پر غور کر کے اپنے جواب میں کیسے کیسے علمی نکات پیدا کرتے تھے۔

مولانا کی تعمیری صلاحیتیں بھی کچھ کم باعثِ رشک نہ تھیں۔ ۱۹۴۷ء کے عالم آ

عہد میں انہیں اپنا وطن چھوڑنا پڑا، اور وطن کے ساتھ بہت سی نایاب چیزوں سے بھی دستبردار ہونا پڑا۔ لیکن ان کی عزیمت و استقامت میں کوئی فرق نہیں آیا، انہوں نے خطبات کا سلسلہ بھی جاری رکھا، جماعتی سرگرمیوں میں بھی قائدانہ طور پر حصہ لیتے رہے۔ ساتھ ہی ساتھ شیش محل روڈ پر انہوں نے ایک بلند پایہ عربی درسگاہ پوری شان کے ساتھ پھر قائم کر دی۔

مولانا کا ذاتی کتب خانہ متعدد اعتبارات سے گنجینہ گوہر کہلانے کا مستحق تھا۔ ہر علم و فن سے متعلق بہترین کتابوں کا ذخیرہ ان کے پاس موجود تھا اور جو کچھ تھا وہ اس پر قانع نہیں تھے، ہر ماہ اس میں گراں بہا اضافہ ہوتا رہتا تھا۔ مصرا اور بیروت وغیرہ کی تازہ ترین مطبوعات گراں قیمت پر وہ خریدتے تھے اور بڑے ذوق و شوق سے ان کا مطالعہ کرتے تھے، یہیں نہیں کہہ سکتا اپنے نایاب کتب خانے سے عاریتہ وہ دوسروں کو کتابیں دیتے تھے یا نہیں؟ لیکن دو تین مرتبہ مجھے بعض مصری مطبوعات کی ضرورت پیش آئی اور مولانا نے ازراہ کرم فوراً مطلوبہ کتاب مجھے مرحمت فرمادی۔

مولانا سے میری ملاقات کم تھی۔ صرف چند مرتبہ شرفِ نیاز حاصل ہوا لیکن جب کبھی ملاقات ہوتی ان کے حُسنِ اخلاق اور لطف و کرم کا نہ مٹنے والا نقش لے کر اٹھا آخری مرتبہ اس وقت ملاقات ہوئی جب وہ مرض الموت میں مبتلا ہو چکے تھے اور نجلی منزل میں قیام کا انتظام کر لیا تھا۔ مولانا محمد صلیف کے ساتھ ایک روز رات کو عیادت کے لیے مجھے ان کی خدمت میں حاضر ہونے کا اتفاق ہوا۔ میں خود بھی دل کا مریض ہوں، لیکن مولانا کے پاس جب تک بیٹھا رہا، وہ اس دلچسپی اور بے پروائی کے ساتھ باتیں کرتے رہے کہ میں یہ محسوس کرنے لگا کہ مولانا دل کے مریض ہیں نہ میں! ————— مجھلا دل کے مریضوں میں یہ اُمنگ اور ترنگ کہاں ہوتی ہے؟ میں گیا اس نیت سے تھا کہ اپنے تجارب کی روشنی میں مولانا کو پرہیز وغیرہ کے سلسلے میں کچھ مشورے دوں گا،

لیکن جب واپس آیا تو اپنے ذہنیہ تجربات کو عملِ نظر سمجھ کر ان پر نظر ثانی کی ضرورت محسوس کرنے لگا۔

مولانا نے جس جماعت کو بھی شرفِ قبولیت بخشا، پورے خلوص کے ساتھ اس کی خدمت کرتے رہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہر مکتبِ فکر میں وہ عزت اور احترام کی نظر سے دیکھے جاتے تھے۔ ان کی دیانتِ فکر ہر طرح کے اختلافات کے باوجود اصولِ موضوعہ کی طرح اپنی جگہ مسلم تھی، اس زمانے میں کسی شخص کا یہ مقامِ رفیع حاصل کر لینا بہت بڑی بات ہے اور یہ بات اس شخص میں پیدا ہو سکتی ہے جو واقعی بڑا ہوا در کوئی شبہ نہیں آپ ہر اعتبار سے عظیم و جلیل تھے۔

صبح تک وہ بھی نہ چھوڑی تو نے اے بادِ صبا
یادگارِ شمع تھی محفل میں پروانے کی خاک

حضرت مولانا
سید محمد داؤد غزنویؒ

میاں محمد شفیع دم-یش)

مولانا سید محمد داؤد وغرنوئی کے نام نامی سے میں اس صدی کے تیسرے عشرے کے اواخر میں شناسا ہوا۔ جب کہ میں نے اپنے ایک استاد چودھری سردار خاں کے نام آنے والے ایک ہفتہ دار اخبار ”التوحید“ کا مطالعہ شروع کیا۔ یہ اخبار امرتسر سے حضرت مولانا کی زیرِ اہانت شائع ہوتا تھا۔ میں اُن دنوں گورنمنٹ ہائی سکول راموں ضلع جالندھر میں نویں جماعت کا طالب علم تھا۔ اس کے بعد مجھے حضرت مولانا کو احرار کانگریس اور مسلم لیگ کے پلیٹ فارمز سے سرگرم عمل دیکھنے کے مواقع ملتے رہے۔ میں نے ان کی پنجاب اسمبلی میں معرکہ آراء تقریروں کی ”سول اینڈ ملٹری گزٹ“ ”ڈان“ اور ”نوائے وقت“ میں رپورٹنگ بھی کی۔ اسمبلی میں اُن کے آنے سامنے بیٹھنے کا لطف بھی اُٹھایا۔ آخر کار ۱۹۵۳ء میں میں ان کے شانہ نشانہ پنجاب اسمبلی میں حزب اختلاف کے بنچوں پر بیٹھنے کے اعزاز سے معزز بھی ہوا۔ حضرت مولانا میرے بیچ فیڈر تھے۔ ۱۹۶۲ء کے دورِ ریویچی کے پہلے انتخابات کے موقع پر اُنہوں نے اداکارہ کی البم ریٹ تنظیم کو میری حمایت پر آمادہ کرنے کے لیے انجمن کے ایک عہدہ دار جناب مولانا معین الدین لکھوی کو اپنے دستخطوں سے ایک رفقہ لکھا جس میں حضرت مولانا نے فرمایا:

”میاں محمد شفیع اسمبلی کے شیر ہیں، ان کی مدد سے گریز نہ کیا جائے۔“

یہ مولانا کی کریم النفسی تھی کہ وہ مجھ سے ایک نیاز مند کی اس طرح تالیفِ قلب فرماتے تھے۔ حضرت مولانا سید محمد داؤد وغرنوئی ایک انتہائی خوبصورت، ارعنا اور متوازن انسان تھے۔

مجھے یاد ہے کہ جب وہ پنجاب میں کانگرس کے صدر منتخب ہوئے تو ہندوستان ٹائمز کے نامور
 متنبہ لاہور (مسٹر آندر سوپ) نے مولانا کے حسن و جمال پر نصف کالم کے برابر ڈیپچ لکھا۔
 مولانا علم و فضل کے سمندر تھے۔ وہ ایک عظیم مقرر تھے۔ پارلیمانی آداب سے خوب آگاہ تھے۔
 انہیں اللہ تعالیٰ نے حسن صورت کے ساتھ حسن سیرت سے بھی بے پناہ طور پر نوازا تھا۔ حضرت
 اور شرافت کا یہ عالم تھا کہ عبداللہ ملک کی والدہ کا انتقال ہوا تو دل کے عارضے میں مبتلا ہونے کے
 باوجود ایک دور دراز قبرستان میں ناز جنازہ پڑھانے کے لیے تشریف لائے۔ انہیں بستر عیالات
 پر یہ بتایا گیا تھا کہ مرحوم نے وصیت کی تھی کہ ان کی ناز جنازہ حضرت مولانا پڑھائیں۔ میں
 اہل سنت و الجماعت میں بریلوی مکتب فکر کا پیرو ہوں اور اس لحاظ سے دیوبندی مکتب فکر
 کا کسی حد تک نقاد رہا ہوں۔ حضرت مولانا نے مجھے انتہائی شفقت اور محبت سے یہ سمجھانے کی
 کوشش فرمائی کہ دیوبندی بھی اسی طرح مسلک امام ابوحنیفہ کے پیرو ہیں جس طرح بریلوی ان
 کے عقیدہ ہیں۔

ایک مرتبہ میرے اخبار اقدام میں بریلوی، وہابی کے موضوع پر ”مکتبہ“ حضرت مولوی محمد ابراہیم
 علی چشتی، اور ”اکھتصام“ کے ایڈیٹر کے درمیان بحث چل نکلی، تو ایک دن حضرت مولانا نے مجھے بلا
 کر نصیحت فرمائی کہ اس بحث کو بند کر دیا جائے، اس لیے کہ آزاد مملکت پاکستان میں مسلمانوں میں
 تفرقہ بازی سے نئی مملکت کے استحکام میں رخنہ اندازی ہوگی۔

حضرت مولانا ایک عظیم انٹی امپریلسٹ تھے۔ انہوں نے یہ اچھی طرح سے محسوس فرمایا تھا کہ
 اسلام اور مسلمانوں کی سب سے بڑی دشمن برطانوی امپریزم ہے جس نے ان کے دین کو SUBVERT
 کرنے کے کسی موقع کو ہاتھ سے جانے نہیں دیا اور جس نے ملائیشیا سے لے کر مغرب اقصیٰ تک
 مسلمانوں کی سیاسی آزادیاں سلب کر رکھی ہیں، اس لیے مسلمانوں کو سیاسی آزادی سے بہرہ ور کرنے
 اور اسلام کو ان کی انفرادی اور اجتماعی زندگی میں مؤثر، بھرپور اور انقلابی کردار ادا کرنے کے لیے
 یہ ضروری ہے کہ انگریزوں کو سرزمین ہند سے باہر نکال دیا جائے۔ چنانچہ انہوں نے ایک مرد مجاہد

کی سی آن بان کے ساتھ برطانوی امپیرلزم کے سنگین حصار کے خلاف معرکہ میں حصہ لیا اور اس راستے کی صعوبتوں کو خندہ پیشانی سے برداشت کرتے ہوئے قید و بند کی آزمائشوں میں ثابت قدم رہے۔ انہوں نے "احرار" اور کانگرس کے پلیٹ فارم کو اپنی انٹی امپیرلسٹ (سامراج دشمن) سرگرمیوں کا مرکز بنایا، لیکن جب ان پر یہ واضح ہو گیا کہ انٹی امپیرلزم کی جگہ ختم ہونے کو آرہی ہے اور اب نئے ہندوستان میں مسلمانوں اور اسلام کے حفظ و بقا کے لیے جدوجہد کرنا اسی طرح ضروری ہے جس طرح انیسویں صدی کے اواخر اور بیسویں صدی کے آغاز سے انگریزی سامراج کے خلاف جہاد میں حصہ لینا ضروری تھا تو انہوں نے ایک مرد مسلمان کی سی بصیرت کا مظاہرہ کرتے ہوئے مسلم لیگ میں شمولیت کا اعلان کیا۔ ۱۹۳۶ء سے ۱۹۴۷ء تک مسلم لیگ کا پلیٹ فارم مسلمانوں کی انقلابی سیاسی جدوجہد کا نشان بن چکا تھا۔ مسلم لیگ اپنے قائد کی زیر قیادت برصغیر میں مسلمانوں کے لیے سچی خود ارادیت کے لیے جگہ جاری کر چکی تھی۔ مولانا نے اس جہاد کی اہمیت اور نوعیت کا احساس فرماتے ہی اپنی ان پیش ہما قربانیوں کے ریکارڈ کو جوہ احرار اور کانگرس کے پلیٹ فارم سے استخلاص وطن کے لیے تعمیر کر چکے تھے، فراموش کرتے ہوئے قائد اعظم کے شانہ بشانہ تحریکِ کھٹان کو کامیابی سے ہم کنار کرنے کے لیے بھرپور حصہ لینے کا اعلان کیا۔ ان کے اس اعلان سے مسلم لیگ کو بے حد تقویت حاصل ہوئی۔

حضرت مولانا کی مسلم لیگ میں شمولیت کے بعد میں نے لاہور میں ان کی پہلی میٹنگ میں ان کی تقریر "ڈان" دہلی میں رپورٹ کی تھی۔ انہوں نے اس موقع پر فرمایا کہ ہم نے کانگرس کے پلیٹ فارم سے اس لیے قربانیاں نہیں دی تھیں کہ آج اپنی آنکھوں کے سامنے اپنے ہم مذہبوں کو غیر مسلموں کے ہاتھوں اتنی بے دردی سے ذبح ہونے دیکھیں اور انگریز کے جانے کے بعد اب تک کے لیے ہندوؤں کی غلامی میں چلے جائیں۔ انہوں نے مسلمانوں کو اپیل کی کہ وہ برصغیر میں اسلام کی سر بلندی کے لیے آپس میں متحد ہوں۔

جب ۱۹۴۷ء میں خضر وزارت کے مستفی ہونے کے بعد پنجاب میں فرقہ وارانہ فسادات کی

آگ بجھاک اٹھی تو حضرت مولانا نے پنجاب کے مختلف اضلاع کا وسیع دورہ کر کے انسانی غم بہائے جانے کے خلاف بہت درد مندی سے دن رات کام کیا۔

مجھے حضرت مولانا کو قریب ترین زاویہ سے دیکھنے کا موقع اس وقت ملا جب پنجاب میں مارشل لا کے نفاذ کے بعد میاں ممتاز دو تانہ کی وزارت کو ختم کر کے ملک فیروز خاں نون کو اقتدار سونپا گیا۔ اس سے پہلے میں حزب اقتدار کے بچوں پر اور مولانا حزب اختلاف کے بچوں پر آنے سامنے بیٹھا کرتے تھے۔ دو تانہ کے رخصت ہوتے ہی اپوزیشن کے وہ تمام اراکین جن کا تعلق جناح مسلم لیگ یعنی ممدوٹ گروپ سے تھا راتوں رات حزب اختلاف سے حزب اقتدار کے قاسب میں ڈھل گئے اور سرکاری بچوں پر جا بیٹھے، لیکن جن لوگوں نے اپوزیشن بچوں پر میاں عبدالباری مرحوم کا ساتھ دینے کا فیصلہ کیا، ان میں حضرت مولانا سید محمد داؤد غزنوی بھی شامل تھے۔ حضرت مولانا ایسے وسیع دار انسان کے لیے یہ یکن نہ تھا کہ ایک غیر جمہوری عمل کے تحت وزارت میں تبدیلی سے وہ بھی اپنے سیاسی موقف میں مصلحت کے زیر اثر تبدیلی کر لیتے۔ ادھر میں نے حزب اقتدار کے بچوں کو چھوڑ کر حزب اختلاف میں بیٹھنے کا فیصلہ کیا۔ میں ایک غیر جمہوری عمل کے ذریعے وزارت میں تبدیلی کے خلاف ہونے کے علاوہ یونی لستوں کے ہاتھ پر سیاسی ہجرت کرنے کے لیے کسی قیمت پر تیار نہیں تھا۔ چنانچہ حزب میاں ممتاز دو تانہ اور ان کے دائرہ حافی درجن ساتھی مسلم لیگ سے نام نہاد و فاشناری کے ڈھکوسلے کی بنا پر بدستور حزب اقتدار کی بچوں پر بیٹھے رہنے میں حضرت مولانا کے بیچ پران کے ساتھ والی سیٹ پر آ بیٹھا۔ حالانکہ میں اپوزیشن کے بچوں پر نورد تھا لیکن اپوزیشن نے مجھے اپنا سیکرٹری جنرل چُن لیا۔ میاں عبدالباری اس ننھی ننھی اپوزیشن کے قائد منتخب ہوئے۔ پارٹی میں گل گیارہ اراکین تھے جن میں دو غیر مسلم مٹر سی ای گبن اور مٹر سنگھ بھی شامل تھے۔ اس ننھی ننھی اپوزیشن نے اکثریتی پارٹی کو بار بار ناکوں چنے چبولئے۔ اس ڈیڑھ دو سال کے عرصے میں میں نے حضرت مولانا کو بہت قریب سے دیکھا اور میں اگلے انداز فکر اور طریقہ عمل سے بے حد متاثر ہوا۔ وہ پارٹی کی میٹنگ میں ہمیشہ مقررہ وقت

پر تشریف لاتے اور اگر کسی وجہ سے تشریف نہ لاسکتے، تو اس کے متعلق پیشگی اطلاع دیتے۔ جب پارٹی کی میٹنگ میں شرکت کرتے تو بات ہمیشہ مدلل اور سلیقہ سے کرتے، ہمیشہ تعمیری رخ اختیار کرتے۔ دین کے معاملات میں کبھی نفاق برداشت نہ کرتے۔ عوامی مسائل پر ہمیشہ محروم طبقوں کی ترجمانی فرماتے۔ اسمبلی کی کارروائی میں بے حد مستعدی دکھاتے اور جب بھی کسی موضوع پر زبان کھولتے تو ان کے منہ سے پھول جھڑتے تھے۔ ختم نبوت کی تحریک میں عوام پر کیے گئے ظلموں پر بھید ملول اور ہرافروز تھے۔ انہوں نے اسمبلی میں ایک قرارداد پیش کی جس کا مفہوم یہ تھا کہ جن لوگوں کو فسادات کے دوران نقصان اٹھانا پڑا تھا، انہیں حکومت کی طرف سے معقول معاوضہ دلایا جائے۔

آخر میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ حسب پنجاب اسمبلی کے اراکین کو آئین ساز اسمبلی کے اراکین منتخب کرنے کے لیے کہا گیا تو مولانا کی خدمت میں بڑے بڑے سرمایہ دار اُمیدوار کوڑے چیک لے کر حاضر ہوتے رہے، لیکن مولانا نے ان کی بات سُننا بھی گوارا نہ کی۔ انہوں نے اپنے پارلیمانی لیڈر میاں عبدالباری کو بھی نہایت صفائی سے بتایا کہ ان کا ووٹ مجاہد ملت مولانا عبدالنار خاں نیازی کے لیے وقف ہے۔ چنانچہ مولانا اپنی سواری کا انتظام کر کے اسمبلی چیمبر تشریف لائے اور اپنے ووٹ کا *FIRST PREFERENCE* مولانا نیازی کے حق میں دیا اور دوسرے *PREFERENCE* (تزیح) میاں عبدالباری کے حق میں۔ اس کے بعد مجھے گلے لگانے کے بعد اپنے دفتر واپس تشریف لے گئے۔ اللہ تعالیٰ سے دُعا ہے کہ وہ اپنے انتہائی رحم سے حضرت مولانا کی مغفرت فرمائیں اور ان کے روحانی مقامات بلند کریں۔

اٰمِیْن اللّٰهُمَّ اٰمِیْن

مولانا داؤد غزنویؒ چند یادیں

ڈاکٹر اسرار احمد

راقم الحروف اگرچہ ۲۷ سے ۵۴ تک یعنی مسلسل سات سال سلسلہ تعلیم لاہور میں مقیم رہا، لیکن ایک مخصوص نقطہ نظر کے شدید غلبے کے سبب سے صورت حال کچھ ایسی رہی کہ ایک خاص حلقے سے باہر کے کسی صاحب فضل و کمال سے ملاقات کی خواہش کبھی پیدا نہ ہو سکی۔ آج جب یہ خیال آتا ہے کہ اسی لاہور میں مولانا مفتی محمد حسن صاحب، مولانا احمد علی صاحب اور مولانا داؤد غزنوی علیہم الرحمہ جیسی شخصیتیں موجود تھیں جن کی پُر تائثر صحبت سے استفادہ کیا جا سکتا تھا، لیکن نہ کیا گیا تو شدید محرومی کا احساس ہوتا ہے اور اس میں مزید یعنی اس شاہد سے پیدا ہوتی ہے کہ غالب کے اس قول کے مطابق کہ :

”دیکھنا ان بستیوں کو تم کہ ویراں ہو گئیں!“

آج کالاہور ان تینوں بزرگوں سے محروم ہو جانے کی بنا پر واقعہ ویران نظر آتا ہے اور اب اللہ ہی بہتر جانتا ہے کہ وہ صورت کب پیدا ہو کہ :

”کریں گے اہل نظر تازہ بستیاں آباد!“

تعلیم سے فراغت کے بعد جب منٹگری (حال ساہیوال) میں اقامت پذیر ہوا تو کچھ ہی عرصے بعد بعض وجوہات کی بنا پر دل و دماغ پر اس مخصوص نقطہ نظر کی گرفت ڈھیلی پڑنی شروع ہوئی اور لگا بہ اس خاص حلقے سے باہر کے لوگوں کی جانب بھی متوجہ ہوئیں اتفاق

سے ان ہی دنوں منگھری میں ایک بڑی اہم حدیث کا لفرنس مولانا عبدالحمید صاحب کی بیعت و عرض مسجد میں منعقد ہوئی۔ اس کا لفرنس میں پہلی بار مولانا داؤد غزنویؒ کو دیکھنے کا موقع ملا اور نہ معلوم کیوں محض رویت ہی سے دل ان کی جانب کھینچتا سا محسوس ہوا۔ مولانا نے اس موقع پر مجھ کو کانٹھیا ارشاد فرمایا۔ میرے دل نے اس خطبے سے گمراہی تڑپ کر قبول کیا اور میرے دماغ پر اس کا ایسا پختہ نقش ثبت ہوا کہ آج کم و بیش گیارہ سال گزر جانے کے بعد بھی کیفیت یہ ہے کہ جیسے میں مولانا کو خطبہ دیتے ہوئے دیکھ رہا ہوں۔

میرے لیے اس خطبے کی سب سے زیادہ مؤثر چیز وہ بلا کا سوز اور اتھا کا درد تھا جو اس کے ایک ایک لفظ میں رچا اور سہا ہوا تھا۔ تقریب کے دوران مولانا کی آنکھوں میں نمی تو از ابتدا اتنا رہی، لیکن دو ایک بار تو فطر رقت سے جذبات بالکل ہی بے قابو ہو گئے۔ خصوصاً مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ ان صحابیؓ کا تذکرہ کرتے ہوئے جنہوں نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے اپنی اس خواہش کا اظہار کیا تھا کہ ”میں جنت میں آپ کے ساتھ رہنا چاہتا ہوں“ اور جن کے جواب میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا تھا کہ اطمینان رکھو ”اَلْمَوَدَّةُ مَعَ مَنْ أَحَبَّ“ مولانا نے یہ کہہ کر بے اختیار زار و قطار رونا شروع کر دیا تھا کہ ”ہائے افسوس انہیں صحابہؓ کو، کن باتوں کی خواہش و تمنائیں اور ہم کن خواہشات کے پیچھے پڑے ہوئے ہیں!“ راقم الحرف کا اس سے پہلے کا عام مشاہدہ چونکہ یہ تھا کہ عام واعظین و ناصحین عموماً اور اہل حدیث علماء خصوصاً سوز و درد کی دولت سے تہی دامن ہوتے ہیں اور اس کے برعکس ان کی تقریبوں پر غنط اور خشونت کا غلبہ ہوتا ہے لہذا میرے لیے یہ ایک بالکل خلاف توقع بات تھی۔ بعد میں جوں جوں روابط استوار ہوئے اور مولانا کو مزید قریب سے دیکھنے کا موقع ملا، معلوم ہوا کہ رقت اور سوز مولانا کی طبیعت کا مستقل جزو بن گئے تھے اور تواضع و انکسار کا ہر وقت تبدیلیہ غلبہ رہتا تھا اور اس کے باوجود کہ اپنے مسلک کے معاملے میں ادنیٰ درجے میں بھی مداخلت گوارا نہ تھی، لیکن قلب انتہائی فرخ تھا اور خیر اور خوبی جہاں اور صحتی نظر آتی تھی

کھلے دل کے ساتھ اس کا اعتراف فرماتے تھے (وَصَدَقَ بِالْحُسْنَى) اور اس معاملے میں چھوٹے بڑے کی کوئی تیزان کی راہ میں حامل نہ ہوتی تھی۔

ایک انتہائی تلخ احساس جو مولانا پر ہر وقت طاری رہتا تھا اور جس کا بار بار اظہار ہوتا تھا وہ یہ تھا کہ زندگی کا بیشتر حصہ ایسی سرگرمیوں کی نذر ہو گیا جن میں 'خارج' کی مصروفیات کے غلبے نے 'باطن' کی جانب اتنا متوجہ نہ ہونے دیا جتنا ہونا چاہیے تھا اور اپنے احساس کے مطابق اس میدان میں مولانا اپنے عظیم اسلاف کی روایات کو برقرار نہ رکھ سکے۔ اس خیال کا اظہار مولانا اکثر انتہائی حسرت کے ساتھ کیا کرتے تھے اور بسا اوقات اس تذکرے میں ان کی آنکھوں سے آنسو بہنے شروع ہو جاتے تھے۔ خاص طور پر مسجد نبویؐ میں میں نے مولانا پر اس حسرت کی وجہ سے جو رقت طاری دیکھی وہ میں کسی طرح نہیں بھول سکتا۔

منٹگرمی کے خطبہ جمعہ میں ایک انتہائی اہم بات جو مولانا نے فرمائی اور جس کی جانب تمام اہل حدیث حضرات کو خصوصی طور پر متوجہ ہونا چاہیے! وہ یہ تھی کہ "اگرچہ ہم ائمہ اربعہ سے اختلاف کرتے ہیں لیکن اس کا یہ مطلب بر گز نہیں ہے کہ ہم ان کی عزت نہیں کرتے یا ان کی قدر و منزلت سے آگاہ نہیں ہیں۔ خدا شاہد ہے کہ ہمارے دلوں میں ان کا اسی قدر احترام موجود ہے جس قدر ان کے مقلدین کے دلوں میں ہے، لیکن ہم ان سے اختلاف کرنے پر مجبور اس لیے ہو جاتے ہیں کہ حدیث رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی قدر و منزلت ہمارے دلوں میں ان کے اقوال سے بہر حال زیادہ ہے"

اس سلسلے میں مولانا نے سامعین (جو اکثر و بیشتر اہل حدیث تھے) کو سخت الفاظ میں تنبیہ کی کہ دوسرے لوگوں کی یہ شکایت کہ اہل حدیث حضرات ائمہ اربعہ کی توہین کرتے ہیں بلاوجہ نہیں ہے اور میں دیکھ رہا ہوں کہ ہمارے حلقہ میں عوام اس گمراہی میں مبتلا ہو رہے ہیں اور ائمہ اربعہ کے اقوال کا تذکرہ حقارت کے ساتھ بھی کر جاتے ہیں۔ یہ رحمانِ سخیل گمراہ کن اور

خطرناک ہے اور یہیں سختی کے ساتھ اس کو روکنے کی کوشش کرنی چاہیے۔“

اس ضمن میں مولانا نے فرمایا کہ ”حضرت محی الدین ابن عربیؒ کے نظریۂ وحدت وجود پر سب سے سخت تنقید حضرت مجدد الف ثانیؒ نے فرمائی اور شدید ترین اختلاف کا اظہار کیا، لیکن اس کے باوجود ان کا ادب و احترام جس درجہ انہوں نے ملحوظ رکھا اس کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ مکتوبات میں ایک مقام پر آپ تحریر فرماتے ہیں کہ ”من زلہ برداروخان ایشام، لکن چو کخم؟ معالہ صفات باری تعالیٰ است۔ اسی طرح ہم یہ کہتے ہیں کہ ہم ان ائمہ دین کے دسترخوان کے جھوٹے ٹکڑے کھانے والے ہیں، لیکن کیا کریں جب معاملہ حدیث رسولؐ کا آ جاتا ہے تو ہم مجبور ہو جاتے ہیں کہ ان کے قول کو چھوڑ کر حدیث رسولؐ پر عمل کریں۔“

راقم الحروف کے لیے اول تو یہ فراموشی قلب ہی بہت غیر متوقع تھی کہ جمعیت اہل حدیث کے صدر اپنی جمعیت کے لوگوں کو ائمہ اربعہ کی تعظیم و تحکیم کی اس درجہ شدت کے ساتھ تلقین کریں، لیکن شیخ محی الدین ابن عربیؒ کے ساتھ حضرت کا تعظیم آمیز کلمہ تو بہت ہی حیرانی کا موجب ہوا۔ چنانچہ جمعہ کے بعد جب ایک جگہ کھانے پر ملاقات ہوئی تو مجھ سے نہ رہا گیا اور میں نے عرض کر ہی دیا کہ ”حضرت! آپ نے ابن عربیؒ کا تذکرہ تعظیم و تحکیم کے ساتھ کیا حالانکہ امام ابن تیمیہؒ کی رائے ان کے بارے میں بہت سخت ہے۔“ اس کا جو جواب مولانا مرحوم نے دیا وہ اس قابل ہے کہ سنہری عروں سے لکھا جائے اور دین کے تمام خادم اس کو عزیز جان بنالیں۔ میری بات سن کر مولانا نے قدرے توقف کے بعد فرمایا:

”ڈاکٹر صاحب! ابن تیمیہؒ اور ابن عربیؒ دونوں ہی ہمارے بزرگ ہیں۔ اپنے آپس کے اختلاف کو وہ جانیں! ہم خورد ہیں اور خورد رہنے ہی میں عافیت سمجھتے ہیں!“ مولانا نے یہ الفاظ اتنے شدید تاثر کے ساتھ فرمائے کہ ساتھ ہی ان کی آنکھوں میں آنسو آ گئے! واقعہ یہ ہے کہ میں عرض نہیں کر سکتا کہ مولانا کے اس منکرانہ قول سے میرے دل میں ان کی عزت میں ایک دم کس قدر اضافہ ہوا اور ان کا احترام کتنا بڑھ گیا!!

کاش کہ ہماری تمام دینی جماعتوں کے رہنما اور فرقوں کے پیشوا فرخی قلب کی اس نعمت سے بہرہ ور ہو جائیں اور اعجاب السرد بنضہ اور اعجاب کلّ ذی دایٰ برایہ کے منک امراض سے شفا یاب ہو کر تواضع اور انکسار کو اپنا شعار بنالیں اور اپنے اپنے ملک پر سختی سے عمل پیرا ہونے کے باوجود دوسروں کے اکرام و تحکیم کی اس روش کو اختیار کر لیں تو تلخیاں ختم ہو کر رہ جائیں اور صرف وہ اختلاف باقی رہ جائے جسے حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے امت کے حق میں رحمت قرار دیا ہے !!

ایک مختصر سے خطبے اور ایک چھوٹی سی ملاقات سے دل و دماغ نے اس قدر اثر لیا کہ اس کے بعد جب بھی کبھی لاہور آنا ہو مولانا کی خدمت میں حاضری ضرور دی۔ خود مولانا مرحوم کو بھی راقم الحروف سے ایک خصوصی تعلق خاطر قائم ہو گیا تھا اور وہ مجھ پر شفقت فرمانے لگے تھے۔

چنانچہ ایک بار جب میں نے مولانا سے مکتوبات حضرت مجدد الف ثانیؒ کی جلد اول عاریۃ مانگی تو مولانا نے فرمایا: ”ڈاکٹر صاحب! اس کتاب کو میں نے آج تک کبھی اپنے سے جدا نہ کیا اور میں کسی دوسرے شخص کو یہ کتاب عاریۃ نہ دیتا، لیکن آپ سے ایک خصوصی محبت ہو گئی ہے جس کی بناء پر انکار نہیں کر سکتا۔“ چنانچہ ایک ماہ کے لیے میں وہ نسخہ منگوا لیا گیا۔ پھر جب میں اسے واپس لیا تو اس پر نئی چرمی جلد بندھوا لیا جسے دیکھ کر مولانا بہت خوش ہوئے اور فرمانے لگے: ”میرا پہلے ہی سے یہ اندازہ تھا کہ آپ اس کتاب کے واقعی قردان ہیں۔“

۱۲ھ میں والدین کے ہمراہ حج بیت اللہ کی سعادت نصیب ہوئی تو مکہ مکرمہ پہنچنے پر معلوم ہوا کہ مولانا بھی رابطہ عالم اسلامی کے تاسیسی اجلاس میں شرکت کی دعوت پر تشریف لائے ہوئے ہیں، چنانچہ فوراً فندقِ مصر حاضر ہو کر ملاقات کا شرف حاصل کیا۔ مولانا بھی مجھے

وہاں دیکھ کر بہت خوش ہوئے۔ دوسرے ہی روز رابطہ کا پہلا اجلاس تھا۔ مولانا نے فرمایا کہ تم اس میں میرے ساتھ میرے سیکرٹری کی حیثیت سے شرکت کرو۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا اور میں رابطہ کی دو نشستوں میں شریک ہوا جن میں سے ایک میں ملک سعود ابن عبدالعزیز نے خطاب کیا۔ اس اجلاس کی روداد ایک علیحدہ موضوع ہے۔ یہاں صرف اس قدر ذکر مناسب ہے کہ تقریر سے قبل شاہ سعود نے مختلف شرکاء کا تعارف کرایا گیا۔ تو میں نے دیکھا کہ مولانا سے ملنے ہوئے شاہ کے چہرے پر عقیدت و احترام کی ایک جھلک نمودار ہوئی جو خاندانِ غزویہ کے ساتھ آل سعود کے قدیم قلبی تعلق کی آئینہ دار تھی۔

منیٰ میں قیام کے دوران بھی متعدد بار مولانا سے ملاقات کا موقع ملا۔ مولانا کی بڑی صاحبزادی جو اس مبارک سفر میں ساتھ تھیں، منیٰ میں علیل ہو گئیں میری تشخیص کے مطابق ٹائیفائیڈ کا حملہ تھا، چنانچہ علاج بھی میں نے ہی کیا اور سرکاری ہسپتال سے ادویہ بھی میں ہی حاصل کرتا رہا۔ مولانا اس سلسلے میں ایک ایک قدم پر ازراہ شفقت تشکر و امتنان کا اظہار فرماتے رہے۔ ادھر میں ان کی اس خدمت کی توفیق پانے پر اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرتا رہا۔ عرفات سے واپسی پر مولانا کی اپنی طبیعت بھی ناساز ہو گئی تھی، چنانچہ ان کی جانب سے قربانی بھی میں نے ہی کی۔ قیام منیٰ کا ایک واقعہ جو اگرچہ براہ راست مولانا کی ذات سے متعلق تو نہیں ہے، تاہم بہت سبق آموز ہے۔ عرض کرتا ہوں:

میرے ایک عزیز جو ایک طویل عرصہ سے سعودی عرب ہی میں مقیم ہیں اور مسکاکا اہلحدیث ہیں، مولانا کی جانب سے قدرے سوءظن میں مبتلا تھے اور حافظ عبداللہ صاحب روپڑی مرحوم سے گہری عقیدت رکھتے تھے۔ میں نے مکہ مکرمہ کے قیام کے دوران ان سے متعدد بار کہا کہ چلیے میں آپ کو مولانا سے ملاؤں لیکن وہ ٹال جاتے رہے، منیٰ میں ان سے اتفاقاً ملاقات ہوئی تو انہوں نے فرمایا کہ چلو قریب ہی شیخ المعلمین کی منزل میں حافظ عبداللہ صاحب روپڑی تشریف فرما ہیں ان سے ملاقات کراؤں۔ مجھے کیا عذر ہو سکتا

نحان کے ساتھ حافظ صاحب کی خدمت میں حاضر ہو گیا۔

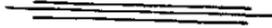
حافظ صاحب مرحوم کے اردگرد اس وقت پچاس ساٹھ افراد کا مجمع تھا اور حافظ صاحب خود خاموش بیٹھے تھے لیکن ادھیڑ عمر کے ایک صاحب پاکستان میں جماعت المدینہ کے آپس کے اختلافات اور مولانا داؤد غزنوی مرحوم سے اپنی شکایات کا تذکرہ کر رہے تھے۔ میں کچھ دیر تو صبر کے ساتھ سنتا رہا، لیکن پھر مجھ سے نہ رہا گیا اور میں نے قدرے درشتی کے ساتھ عرض کیا۔ ”حضرات! آپ یہاں پاکستان سے دوڑ رہا ہٹی ہزار میل دور ایک مقدس مقام پر تشریف رکھتے ہیں۔ کیا اس جگہ بھی یہ ممکن نہیں کہ وہاں کے اختلافات کو بھلا کر باہمی اتحاد اور اعتماد کی فضا پیدا کی جاسکے؟“ میرے اس طرح اچانک توجہ دلانے پر مجمع سناٹے میں آ گیا اور سب لوگ حافظ صاحب مرحوم کی طرف دیکھنے لگے۔ لیکن خدا رحمت نازل فرمائے ان کی رُوح پر کہ انہوں نے میری مشکل تائید کی اور حکم دیا کہ ان معاملات کا تذکرہ دوران حج نہ کیا جائے۔ ساتھ ہی گفتگو کا رخ موڑ کر کچھ وعظ و نصیحت کا سلسلہ شروع فرما دیا!

مدینہ منورہ میں مولانا کی صحت زیادہ خراب ہو گئی تھی اور دل کا دورہ پڑ گیا تھا۔ لہذا کچھ نمازیں بھی مولانا نے مجبوراً اپنی قیام گاہ ہی پر ادا فرمائیں، لیکن مسجد نبوی کی جماعت سے خرومی پر شدید رنج اور افسوس مولانا کو ہوتا تھا اور جب بھی طبیعت ذرا سنبھلتی تھی مولانا ضرور مسجد نبوی میں حاضر ہو کر جماعت کے ساتھ نماز ادا فرماتے تھے۔

ایک مرتبہ مسجد نبوی میں مغرب کی نماز کے لیے میں مولانا کے بالکل ساتھ ان کے کندھے سے کندھا ملا کر کھڑا ہوا اور اپنی پرانی عادت کی بناء پر میں نے تجسیمِ تحریمہ سے قبل ہی بطور نیت اپنی وجہت و حسی ۱۰۰۰۰۰ الخ پڑھا تو مولانا نے فوری طور پر تصحیح کی اور فرمایا کہ یہ دُعا تجسیمِ تحریمہ کے بعد پڑھا کرو، چنانچہ اسی وقت سے میرا معمول بدل گیا اور اب اکثر ایسا ہوتا ہے کہ نماز کے لیے کھڑا ہوتا ہوں، تو مولانا کی یہ نصیحت اور اس کے ضمن میں خود مولانا یاد آجاتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان پر رحم فرمائے، ان کی فرودگذاشتوں سے درگزر کرے اور ان کے درجات

کو بلندتر فرمائے۔ آمین۔

واقعہ یہ ہے کہ اس دور میں مولانا کی شخصیت بہت غنیمت تھی اور اس میں اسلام کے قرنِ اول کی بہت سی خصوصیات موجود تھیں خصوصاً اتباعِ سنت کے مکمل اہتمام کے ساتھ قلب و روح کی حیاتِ باطنی کا جو حسین امتزاج ان کی شخصیت میں پایا جاتا تھا وہ تو اس دور میں جب کہ تصوف میں بہت سی نئی باتیں بطورِ لوازم داخل ہو گئی ہیں بہت ہی قابلِ قدر تھا اور میری ناچیز رائے میں اس دور میں شدید ترین ضرورت اسی چیز کی ہے



حضرت مولانا سید داؤد غزنویؒ

مولانا حکیم فضل الرحمن سواتی

مولانا داؤد غزنویؒ ایک جید عالم دین ہونے کے باوجود تحریکِ آزادیِ ملک کے سربراہ اور علمبردار تھے۔ اسی سلسلے میں آپ کو انگریزی حکمرانوں نے کم دہیٹن دس بار جیل بھیج دیا تھا۔ ۱۹۱۹ء میں جلیانوالہ باغ کے حادثہٴ فاجحہ کے سلسلے میں جو مارشل لا قائم ہوا اُس میں ڈاکٹر سیف الدین کچلہ کے ساتھ آپ کو بھی جیل بھیج دیا گیا تھا۔ دسمبر ۱۹۱۹ء میں مسلم لیگ اور کانگریس کے اجلاس امرتسر میں منعقد ہوئے تھے۔ لیگ کے صدر مسیح الملک حکیم اجمل خاں تھے اور کانگریس کے صدر موتی لال نہرو۔ اس موقع پر گورنمنٹ نے تمام سیاسی نظر بندوں اور قیدیوں کو رہا کر دیا۔ چھند واڑہ سے مولانا شوکت علی اور مولانا محمد علی رہا ہو کر امرتسر تشریف لے گئے تھے۔ پہلے تو یہ دونوں بھائی کانگریس کے اجلاس میں شریک ہوئے اور تقریریں بھی کیں، پھر لیگ کے اجلاس میں شریک ہوئے۔ رات کا وقت تھا۔ جناب ڈاکٹر اقبالؒ نے ان دونوں کے خیر مقدم میں مندرجہ ذیل اشعار سنائے:

ہے لیری اعتبار افزا جو ہو ہمت بلند قطرہ نیساں ہے زندانِ صدقہ کبرہ مند
 مشکِ اذفر چیز کیا ہے اک لو کی بوند ہے مشک بن جاتی ہے ہو کر ناذ آہو میں بند
 ہر کسی کی تربیت کرتی نہیں فطرت مگر کم ہیں وہ طاہر جو ہیں قیدِ قفس سے لرزند

شہپر زانغ و زغن زیبائے قید و عید نیست

کیں کرامت ہمو شہباز و شاہیں کردہ اند

یہ اشعار پڑھنے سے تمام مجمع پر سکتے جیسی کیفیت طاری ہوگئی۔ میرے سامنے ایک خوش شکل نوجوان بیٹھے تھے وہ داد دینے میں سب سے آگے تھے اور ہر شعر پر زور سے پکار پکار کر کہتے تھے "مگر کہیے"۔ یہ سن کر ڈاکٹر صاحب پھر اسے دہرا دیتے تھے۔ میں نے ایک آدمی سے پوچھا کہ یہ جوان کون ہیں؟ انہوں نے کہا کہ سید داؤد غزنوی ہیں۔ میں نے کہا وہی داؤد غزنوی جو مارشل لاک کی گرفت میں آئے تھے؟ انہوں نے کہا ہاں وہی داؤد غزنوی ہیں کل ہی رہا ہونے ہیں۔ اجلاس کے اختتام پر میں ان سے ملا اور ہائی پر مبارک باد دی۔ یہ میری پہلی ملاقات تھی جو مولانا سید داؤد غزنوی سے ہوئی تھی۔ ایک مہینے کے بعد یہی میں خلافت کانفرنس زیر صدارت غلام محمد بھیرگری منعقد ہوئی۔ حضرت مولانا آزادؒ بھی اس میں شریک تھے اور مولانا سید داؤد غزنویؒ مع چند ہمراہیوں کے امرتسر سے آکر شریک ہوئے تھے۔ مظفر آباد ہال جس میں کانفرنس کی بجٹ کمیٹی کے اجلاس ہوا کرتے تھے، اس میں تمام ڈپٹی گیٹ اقامت پذیر تھے۔ مولانا غزنویؒ بھی اس میں مقیم تھے اور راقم الحروف بھی اسی ہال میں اقامت تھا۔ رات اور دن ان سے ملاقات ہوتی رہتی تھی۔ دس دن تک ہم سانچہ رہے۔ آپ کو حضرت مولانا ابوالکلام آزادؒ سے کمال عقیدت مندی تھی اور مولانا کا زیادہ رجحان بھی مولانا سید داؤد غزنویؒ کی طرف تھا۔ اس کا اندازہ اس واقعے سے بخوبی ہو سکتا ہے۔

کانفرنس کے اجلاسوں میں مولانا آزادؒ نے کوئی تقریر نہیں کی تھی۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ ایک ماہ قبل مولانا محمد علی جوہر خلافت کے تماندہ بن کر لندن تشریف لے گئے تھے، تاکہ مسٹر لائیڈ جارج وزیر اعظم برطانیہ سے درخواست کر کے ملاقات کریں اور خلافت کا مسئلہ انہیں سمجھا دیں۔ یہ کانفرنس ان کی تائید میں منعقد کی گئی تھی لیکن مولانا آزادؒ کو اس قسم کی وفد بازیوں اور درخواستوں سے اتفاق نہیں تھا۔ آپ کا نظریہ تھا کہ خدا پر اعتماد کرنا چاہیے اور اپنے آپ کو کامیابی کا ذریعہ بنا دینا چاہیے۔ مولانا شوکت علی صاحبؒ اور دوسرے متعدد لیڈروں نے مولانا آزادؒ سے درخواست کی کہ آپ کوئی مؤثر تقریر فرمائیں لیکن مولانا آزادؒ تقریر کرنے سے انکار کر رہے تھے۔ تمام

ڈیلیٹ اور خاص کر پنجابی نمائندے مولانا آزاد کی تقریر سننے کے لیے ماہی بے آب کی طرح تڑپ رہے تھے۔ امرتسر والے ڈیلیگیٹوں نے مولانا غزنوی سے کہا کہ آپ ہی مولانا آزاد سے کہیے کہ تقریر فرمائیں۔ مولانا غزنوی صاحب نے میرے سامنے مولانا آزاد سے کہا کہ لوگ آپ کی تقریر سننے کی بہت خواہش رکھتے ہیں۔ مولانا آزاد نے کہا کہ جب آپ کہتے ہیں، تو ضرور آج رات کو عام اجلاس میں تقریر کر دوں گا؛ چنانچہ رات کے ۹ بجے سے ۱۰ بجے تک مولانا آزاد نے پُر خالق اور ولولہ انگیز تقریر فرمائی۔ مسئلہ خلافت کی اہمیت اور وضاحت بڑی عمدگی کے ساتھ کی۔ مسٹر لائیڈ جارج کی وعدہ خلافت کی قلعی کھول دی اور صاف اور غیر مبہم الفاظ میں فرمایا کہ لائیڈ جارج کی یہ وعدہ خلافتی آزاد ہند کا پیش خیمہ ہے۔ انگریزی حکومت سے دو تعطیلات سرزد ہوئی ہیں۔ ایک تو اس کے وزیر اعظم مسٹر لائیڈ جارج کی وعدہ خلافتی جو ترقی حکومت کے ساتھ کی گئی ہے اور دوسری غلطی جلیانوالہ باغ کی گولہ باری ہے۔ اول الذکر سے مسلمان ہند جو انگریزی حکومت کے دل سے وفادار تھے سُخت برا فروخت ہو گئے ہیں اور ثانی الذکر سے تمام باشندگان ہند کے دلوں میں انگریزی حکومت کے خلاف جذبات جھڑک گئے ہیں۔

ع خدا شکر ہے برا انگریزوں کے خیرے ماہراں باشد

مولانا آزاد کی اس پُر مغز تقریر سے تمام حاضرین بہت ہی متاثر ہوئے۔ اختتام جلسہ پر لوگ مولانا سید داؤد غزنوی کا شکر یہ ادا کر رہے تھے کہ ان کے کہنے سے مولانا آزاد نے تقریر فرمائی، ورنہ وہ تقریر کرنا نہیں چاہتے تھے۔

تین مہینے کے بعد مدراس میں خلافت کانفرنس زیر صدارت مولانا شوکت علی منعقد ہوئی۔ اس موقع پر میں نے مولانا سید محمد داؤد غزنوی کو خط لکھا کہ کانفرنس میں آکر شریک ہو جائیے آپ نے جواب دیا کہ میں ابھی مولانا آزاد سے مل کر دہلی سے آیا ہوں۔ مولانا آزاد کا ارادہ مدراس کانفرنس میں شرکت کا نہیں ہے؛ اس لیے میں شریک نہیں ہوں گا۔

تین ماہ کے بعد کلکتہ میں کانگریس کا اپینٹل اجلاس زیر صدارت لالہ لاجپت رائے

منتہ ہوا۔ اس میں مولانا سید داؤد غزنوی شریک تھے۔ میں بھی جا کر شریک رہا۔ چار دن ہم برابر ملتے رہے۔

چار مہینے کے بعد ناگپور میں کانگریس کا سالانہ اجلاس زیر صدارت وجے راگو چاریہ منعقد ہوا۔ اس موقع پر پھر مولانا سید داؤد غزنوی چند ہمارہوں کے ساتھ شریک اجلاس تھے ہیں بھی شریک تھا۔ کانگریس کمیٹی میں ہم سب ایک ہی جگہ میں قیام پذیر تھے۔ مہاتا گاندھی آنجنائی کی نان کو آپریشن (ترک موالات) والی تحریک اس اجلاس میں بالاتفاق پاس ہوئی۔ صرف ہندوؤں میں سے مدین موہن مالویہ نے اور مسلمانوں میں سے صرف مٹر محمد علی جناح نے مخالفت کی تھی۔ یہ دونوں کانگریس سے نکل گئے۔ جناح صاحب تو اخیر عمر تک پھر کانگریس میں شریک نہیں ہوئے لیکن مالویہ جی ۱۹۲۷ء میں جو مدراس میں کانگریس کا اجلاس زیر صدارت جناب ڈاکٹر مختار احمد انصاری منعقد ہوا تھا، اس میں آکر شریک ہوئے۔

ناگپور کانفرنس کے موقع پر مولانا سید داؤد غزنوی سے دس دن تک مجھے ملاقات کا موقع ملا تھا۔ اس موقع پر ایک عجیب و غریب مذہبی واقعہ بھی پیش آیا تھا۔ کانگریس کمیٹی میں چند مسلمانوں نے مغرب کی نماز پڑھنے کی خواہش ظاہر کی۔ اقامت تو میں نے کہہ دی اور امامت مولانا غزنوی نے کی۔ نماز میں وہ اپنے مسلک کے مطابق باقاعدہ رفع یدین کرتے رہے۔ سلام پھیرتے ہی میرے ساتھ ایک حیدرآبزی صاحب تھے۔ انہوں نے مجھ سے پوچھا کہ کیا ہماری یہ نماز صحیح ادا ہوئی؟ میں نے کہا ہاں! درست ہے۔ انہوں نے کہا کہ امام تو وہابی ہیں، وہابی کے پیچھے حنفیوں کی نماز درست نہیں ہے۔ مولانا داؤد نے کہا:

”میں وہابی نہیں ہوں بلکہ اہلحدیث ہوں۔ خفی مذہب میں اور اہلحدیث میں کوئی فرق نہیں ہے حضرت امام ابوحنیفہ بھی تو اہلحدیث تھے۔“

اس شخص کو بہت غصہ آیا۔ مولانا نے فرمایا کہ سنو بھائی امام اعظم کا یہ قول ہے:

”اذا صح الحدیث فهو مذہبی۔“ اس قول کی آپ نے اچھی طرح تشریح فرمائی

تمام نمازیوں نے مولانا غزنویؒ کا نظریہ قبول کیا اور وہ شخص بھی قائل ہو گیا۔ مولانا کی تشریح و توضیح سے لوگوں کے دلوں میں غیر مقلدین کے خلاف جو شکوک تھے، وہ سب رفع ہو گئے۔

گاندھی جی کی تحریک ترک مولات کے پاس ہونے کے بعد پبلک میں حکومت کے خلاف جذبات برانگیختہ ہو گئے اور سخت و تیز تقریریں شروع ہونے لگیں۔ لوگوں میں بہت جوش و خروش پیدا ہو گیا۔ گورنمنٹ بھی سختی پر اتر آئی اور گرفتاریاں شروع کر دیں۔ کراچی میں مولانا شوکت علی، مولانا محمد علی، مولانا سید حسین احمد مدنی اور مولانا شاد احمد صاحب کی سربراہی سے مسلمانوں میں بہت جوش پیدا ہو گیا۔ اس کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ ایک خاتون کی ایک نظم روزنامہ زمیندار میں شائع ہوئی جس کے ایک دو شعر جو اس وقت نوکِ زبان تھے سنئے:

سہ جو کچھ پڑے گی مجھ پر مصیبت اٹھاؤں گی

خدمت کروں گی ملک کی اور جیل جاؤں گی

جا کر کراچی جیل میں کوٹوں گی رام باس

شوکت علی کے ساتھ میں چکی چلاؤں گی

ساتما جی بھی بروادہ جیل بھیج دیے گئے۔ میں بھی جیل چلا گیا۔ میری گرفتاری سے ایک مہینہ قبل مولانا سید داؤد غزنویؒ بھی جیل جا چکے تھے۔ رہائی کے بعد ۱۹۲۴ء میں کانٹاڈا میں کانگریس اور خلافت کانفرنس کے اجلاس منعقد ہوئے۔ خلافت کانفرنس کے صدر مولانا سید حسین احمد مدنی تھے اور کانگریس کے صدر مولانا محمد علی جوہر تھے۔ اس موقع پر مولانا سید داؤد غزنویؒ بھی مع چیمبر ساتھیوں کے شریک اجلاس تھے۔ میں بھی شریک تھا اور کانگریس کمیٹی میں ان کے ساتھ مقیم تھا اور ہر وقت تبادلہ خیالات ہوتا رہتا تھا۔ خلافت کانفرنس میں میرا ایک رزلوشن عدن کے بارے میں جس کا اعلان پہلے اخبارات میں پیش ہو چکا تھا، پیش ہونے والا تھا۔ مولانا داؤد نے نجی طور پر مجھ سے کہا کہ تم میری ترمیم قبول کر لو تو پھر میں تمہارے رزلوشن کی تائید کروں گا۔ چونکہ ترمیم رزلوشن کے منافی نہیں تھی، اس لیے میں نے اطمینان خاطر قبول کر لی، پھر عام جلسے

میں آپ نے بڑے عمدہ پیرایہ میں میری تحریک کی تائید فرمائی، جس سے میری شخصیت بہت نمایاں ہوگئی۔ اخبار "دکیل" امرتسر نے مولانا داؤد پیر ایک دفعہ سخت تنقید کی تھی کہ یہ سیکنڈ کلاس میں سفر کرتے ہیں جس سے قوم کا پیسہ یوں ہی برباد ہو جاتا ہے۔ میں نے اس بارے میں ان سے ذکر کیا تو انہوں نے کہا کہ ٹھیک ہے کہ میں کبھی دُور درواز کا سفر کرتا ہوں تو سیکنڈ کلاس کے ڈبے میں بیٹھتا ہوں عیش و آرام کی خاطر نہیں بلکہ نماز کی خاطر، اب جو آیا ہوں تو سیکنڈ کلاس میں آیا ہوں اور جاؤں گا بھی سیکنڈ کلاس میں (انشاء اللہ تعالیٰ)۔ سیکنڈ کلاس کے ڈبے میں الطینان سے نماز کا موقع ملتا ہے تھوڑے کلاس میں الطینان سے نماز کا موقع نہیں ملتا۔ میں اپنے پیسے سے سفر کرتا ہوں۔ خلافت کیمٹی کا اگرچہ میں صدر ہوں، لیکن کیمٹی کی رقم میں نے ذاتی مفاد میں کبھی خرچ نہیں کی ہے۔ اخبار "دکیل" امرتسر نے سمرنا فنڈ کی تمام رقم خورد و برد کر دی ہے، اس لیے عجولانے "من رآ فی نفسہ فقد رآ فی غیرہ" دوسروں پر بدگمانی کرتا ہے۔ اخیر میں حافظ کا یہ شعر سنایا ہے

بیا کہ نرقہ من گرچہ وقف میکدہ ہاست

ز مال وقف نہ بینی بنام من درے

کا کناڈا کانفرنس کے بعد خلافت کا مسئلہ بہت سست پڑ گیا کیونکہ مصطفیٰ خاں نے خلافت کا خاتمہ کر دیا۔ ہندوستان میں اب صرف کانگریس کی تحریک چلتی تھی جب کبھی کانگریس کے اجلاس ہوتے تھے اور میں بھی شریک ہوتا تو مولانا داؤد سے ضرور ملاقات ہو جاتی تھی۔ وہ تو باقاعدہ ہر ایک اجلاس میں شریک ہوتے تھے اور میں کبھی کبھار شریک ہو جاتا تھا۔

۱۹۳۷ء میں جامعہ دارالسلام عمر آباد کی دستار بندی کے جلسے میں آپ عمر آباد نشر لپ لائے۔

اس موقع پر بھی ملاقات ہوئی تھی اس کے بعد چھ کوئی موقع ملاقات کا نہیں ملا۔ اب حال میں جب میں مغربی پاکستان گیا تو ۳ دسمبر ۱۹۶۳ء کو ان سے شرف ملاقات کا موقع ملا۔ یکم دسمبر کو تو میں لاہور پہنچا اور مولانا غلام رسول صاحب کے خوشنما بیگلمہ واقع مسلم ٹاؤن میں قیام پذیر رہا۔

پھر حضرت مولانا سید داؤد غزنویؒ سے ملنے کے لیے روانہ ہوا پہلے تو میں مولانا محی الدین احمد مسوی سے جا کر ملا پھر ان سے کہا کہ میں مولانا سید داؤد غزنوی سے ملنا چاہتا ہوں۔ آپ نے کہا کہ وہ ہسپتال میں ہیں میں بھی ان سے ملنے کی خواہش رکھتا ہوں؛ چنانچہ ہم دونوں ہسپتال گئے۔ میں نے نبض دیکھی کہ یہ کہ صُدا کے فضل سے بیماری تو نہیں ہے؛ البتہ نقاہت بہت ہے۔ آپ نے کہا کہ ڈاکٹر کی بھی یہی رائے ہے اور کہتے ہیں کہ اب گھر چلے جاؤ۔ چنانچہ آج گھر جانے کا قصد ہے میں نے کہا کہ نقاہت کی دوا میرے پاس ہے۔ اس وقت تو تیار نہیں ہے لیکن وطن سوات جا کر بناؤں گا اور ایک کورس آپ کی خدمت میں پھجدوں گا۔ آپ نے فرمایا کہ ضرور بھیجیے میں انشاء اللہ تعالیٰ ضرور استعمال کروں گا۔

میں نے مولانا ظفر علی خان کے چند طنزیہ اشعار سنا دیے جن کو وہ سن کر بہت ہنسے۔ بات یہ ہوئی تھی کہ تحریک نمک میں جب پولیس نے آپ کو گرفتار کر لیا تو آپ پولیس کے ساتھ جاتے نہیں تھے۔ پولیس نے مجبور ہو کر آپ کو اٹھا کر موٹر میں بٹھا دیا۔ جب کورٹ پہنچانے گئے تو موٹر سے اترتے نہ تھے، پھر پولیس نے آپ کو کپڑا کر جج کے سامنے لاکر کھڑا کر دیا جب سزا سنائی تو جیل جاتے نہ تھے پھر پولیس نے پکڑ کر موٹر میں بٹھا دیا۔ جیل پہنچے تو اترتے نہ تھے، پھر پولیس نے پکڑ کر موٹر سے اتارا۔ مولانا ظفر علی خان صاحب بھی جیل میں تھے۔ یہ کشمکش دیکھ کر چند اشعار فی البدیہہ موزوں کر دیے۔ ان میں سے چند اشعار یہ ہیں :

دی مولوی داؤد کو چڑی جو پولیس نے	احباب نے پوچھا بے تعجب کہ یہ کیا ہے
کیوں لہر کے چلے دوش حکومت پر حضور آج	حضرت کی سواری کا طریقہ یہ نیابت
زمانے لگے ہنس کے کہ میں عالم دین ہوں	اور مرتبہ سہ کار میں عالم کا بڑا ہے
اس واسطے کہ مجھ کو عرض فرط ادب سے	خود اپنے تئیں آپ حکومت سے کیا ہے
ہے فخر یہ مجھ کو کہ مری ران کے نیچے	خود حضرت عیسیٰ کی سواری کا گدھا ہے

پھر آپ نے جامعہ دارالسلام عمرا آباد کے متعلق دریافت کیا۔ میں نے کہا کہ اچھی ہے۔

جب سے علامہ مولانا عبدالواحد صاحب ناظم جامعہ بنے ہیں، مدرسہ ترقی پر ہے پھر میں نے جامعہ کے اساتذہ اور دوسرے عملے کی جانب سے السلام علیکم کہا کہ سب آپ کی خدمت میں السلام علیکم عرض کر رہے تھے اور آپ کی صحت کے لیے دست بردار ہتے ہیں۔ مولانا شعیب عمری کو جب معلوم ہو گیا تھا کہ میں پاکستان جا رہا ہوں تو انہوں نے مجھے لکھا کہ میرا بھائی پاکستان جانے کا ارادہ تھا کیونکہ اخبارات کے ذریعے سے مولانا سید داؤد غزنوی کی علالت کی وحشت ناک خبر سماع خراش ہوئی ہے ان سے نیاز حاصل کرنے کا ارادہ تھا، لیکن پاسپورٹ نہیں ملا۔ آپ میری طرف سے سلام کیے؛ چنانچہ میں نے مولانا شعیب کی جانب سے خاص طور پر ان کی خدمت میں السلام علیکم عرض کیا۔ مولانا نے پوچھا کہ وہ کیا کر رہے ہیں؟ میں نے کہا کہ وہ بنگلور میں سی عبدالحکیم صاحب کے پوتے حاجی صدیق حسن صاحب کے ساتھ مل کر تجارت کر رہے ہیں ان کے نانا مولانا فقیر اللہ صاحب ^{رحمہ} ہیں۔ یہ سننے ہی فوراً کہنے لگے کہ مولانا فقیر اللہ صاحب میرے والد کے نانا گرو تھے۔ میں بچپن سے ان کو جانتا ہوں۔ میری طرف سے بھی محمد شعیب صاحب عمری کو السلام علیکم کیے۔

میں جب سوات پہنچا تو نندرت، سردی کی دہرے سے سخت طویل ہوا، اس لیے میں دو تیار نہ کر سکا۔ ایک روز میرا سہ روز نامہ جنگ کراچی مجھے سنا رہا تھا جس میں حضرت مولانا سید داؤد غزنوی کے انتقال پر طلال کی خبر سننے میں آئی۔ سن کر بہت متاثر ہوا اور مغفرت کی دعا کی۔

حضرت مولانا سید محمد اود غزنوی

سیاسی زندگی کی ابتداء اور
ملک کا سیاسی پس منظر

ملک حسن علی بی اے (جامعی، شرقپوری

۴ اگست ۱۹۱۴ء کو پہلی عالمگیر جنگ کا نثرارہ وسطیورپ میں پھکا اور دیکھتے ہی دیکھتے تمام مغربی ممالک اس کی پیٹ میں آگئے۔ اس لڑائی کی فوری وجہ یہ ہوئی کہ آسٹریا کا ولیعهد اہائی ۱۹۱۴ء کو سربیا میں مارا گیا۔ آسٹریا نے سربیا کو کڑی شرائط پیش کیں جنہیں سربیا نے پورا کرنے سے انکار کر دیا۔ اس پر آسٹریا نے سربیا کے خلاف اعلانِ جنگ کر دیا۔ روس نے سربیا کا ساتھ دیا اور جرمنی نے آسٹریا کی حمایت کی۔ فرانس پرانے معاہدہ کی رُو سے روس کا طرف دار ہو گیا۔ کچھ دنوں بعد جرمنی نے فرانس پر حملہ کرنے کی غرض سے اپنی فوجیں بلجیم میں سے گزارنا چاہیں، بلجیم نے جرمنی کی فوجوں کو راستہ دینے سے انکار کر دیا۔ جرمنی نے بلجیم پر حملہ کر دیا۔ برطانیہ نے بلجیم کی حمایت میں اپنی فوجیں فرانس بھیج دیں، اس طرح یورپ میں عالمگیر جنگ چھڑ گئی۔ اس جنگ میں جرمنی، آسٹریا، ہنگری، بلغاریہ اور ترکی ایک طرف تھے اور دوسری طرف روس، فرانس، بلجیم، برطانیہ، اٹلی، رومانیہ، سربیا، پرتگال، یونان اور ریاست ہائے متحدہ امریکہ تھے۔ جرمنی کے پاس سامانِ جنگ کافی مقدار میں تھا۔ ۱۹۱۶ء تک اس کا اور اس کے حلیفوں کا پلہ بھاری رہا۔ سربیا، بلجیم اور رومانیہ پر جرمن فوجوں کا قبضہ ہو گیا۔ فرانس کے مشرقی حصے اور اٹلی کے شمال مشرقی حصے بھی جرمن فوجوں نے فتح کر لیے۔ روس میں انقلاب ہو گیا۔ روس کی نئی گورنمنٹ نے جرمنی کے ساتھ صلح کرنی اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ جرمن فوجیں فرانس پر تالین ہو جائیں گی، مگر ۱۹۱۶ء

میں ریاست ہائے متحدہ امریکہ کی جنگ میں بروقت شرکت نے لڑائی کا سارا نقشہ بدل دیا۔ امریکہ کی تازہ دم فوجوں اور کثیر سامان جنگ کے مقابلہ کی جرمنی تاب نہ لاسکا۔ آخر جرمنی اور اس کے حلیفوں نے ۱۱ نومبر ۱۹۱۸ء کو اتحادیوں کے سامنے ہتھیار ڈال دیے۔

ہندوستان اور جنگِ عظیم

ہندوستان کے لوگوں نے اس جنگِ عظیم میں جی کھول کر برطانیہ کی فوجی و مالی امداد کی ہندوستانی سپاہی شام، فلسطین، فرانس، عراق، عرب اور مشرقی افریقہ میں نہایت بہادری سے لڑے۔ تقریباً دس لاکھ ہندوستانی سپاہی جنگِ یورپ میں شریک ہوئے۔ جن میں سے ۳۶ ہزار مقتول اور ستر ہزار مجروح ہوئے۔ ہندوستانی خزانہ سے ایک سو پچیس کروڑ روپے ہندوستانی فوج کے اخراجات کے لیے حکومت ہند نے ادا کیے اور ایک سو کروڑ روپے حکومت برطانیہ کو بطور نذر پیش کیے۔ ہندوستان کے والیان ریاست نے بھی دامنے درمنے اور دیگر طریقوں سے بڑھ چڑھ کر مدد کی۔ جنگ کے دوران ہی میں لارڈ ہارڈنگ وائسرائے ہند اپنے عہدہ سے سبکدوش ہو کر ولایت چلا گیا اور اس کی جگہ لارڈ چیچسٹرفورڈ ہندوستان کا وائسرائے بن کر آیا۔

لارڈ چیچسٹرفورڈ کی آمد کے وقت جنگِ یورپ زوروں پر تھی۔ لارڈ مونسون نے ہندوستان سے زیادہ سے زیادہ مالی اور فوجی امداد بھیجی۔ حکومت برطانیہ نے اس شاندار خدمت کے صلہ میں ہندوستان سے وعدہ کیا کہ جنگ کے بعد ہندوستان کو خودمدارانہ حکومت دے کر ہندوستان کو آزاد کر دیا جائے گا۔ اس وقت کے وزیر ہند لارڈ مائلنگونے گورنمنٹ کی پالیسی کا واشگاف الفاظ میں اعلان کیا۔

چونکہ ترکی کے شامل جنگ ہونے کی وجہ سے گورنمنٹ برطانیہ کو خطرہ تھا کہ شاید ہندوستان کے مسلمان اس جنگ میں جو خلیفۃ المسلمین کے ساتھ بے شرکت نہ کریں گے۔

ہندوستان کے مسلمانوں کو مطمئن کرنے کے لیے نہایت شاندار اور خوش کن اعلانات کیے اور کئی نہری وعدے کیے۔ ترکی کے جنگ میں شامل ہونے کے بعد ۲ نومبر ۱۹۱۴ء کو سب سے پہلا اعلان گورنمنٹ آف انڈیا نے جو کیا اس کا خلاصہ یہ ہے :

ہنر کی سلسلی وائسرائے ہند ہنر کی سلسلی کی گورنمنٹ کے حکم کے مطابق عرب کے مقامات مقدّسہ کے بارے میں جن میں عراق کے بڑے مقامات اور ہندو گاہِ جدہ بھی شامل ہے مندرجہ ذیل اعلان کرتے ہیں تاکہ ہنر کی سلسلی کی نہایت وفادار مسلم رعایا کو غلط فہمی پیدا نہ ہو۔ اس جنگ میں مذہبی جنگ کا کوئی سوال نہیں ہے۔ ان مقامات مقدّسہ اور ہندو گاہِ جدہ پر برطانوی بڑی و بحری طاقتوں سے کبھی حملہ نہ ہو گا نہ ان کو ستایا جائے گا۔ جب تک کہ سجان و وزیرین ہند سے جو ان مقامات مقدّسہ میں جائیں کوئی چھیڑنے کی جلے۔

ہنر کی سلسلی کی گورنمنٹ کی استدعا پر گورنمنٹ فرانس و روس نے بھی اس طرح کا یقین دلایا۔

۵ جنوری ۱۹۱۸ء کو مسٹر لائیڈ جارج وزیر اعظم انگلستان نے اپنی مشہور تقریر میں کہا:

”ہم اس لیے جنگ نہیں کر رہے کہ ترکی کو اس کے دار الخلافت سے محروم کر دیں، یا ایشیائے کوچک اور تھرس کے زرخیز و شہرہ آفاق علاقے لے لیں، جن میں ترکی النسل آبادی کا بڑا غالب ہے۔“

وزیر اعظم نے اپنی اسی تقریر میں مزید یقین دلانے کے لیے کہا:

”میں دیکھنے کے ساتھ اس بات کا دعویٰ کر سکتا ہوں کہ میں صرف گورنمنٹ کے ہائی افسیوں ہی کی نہیں، بلکہ تمام قوم اور نسلوں کی یقینیت مجموعی ترجمانی کر رہا ہوں۔“

پہلی سٹیٹس امریکہ مسٹرو سن نے ۸ جنوری ۱۹۱۸ء کو جن چودہ شرطوں کا اعلان کیا تھا، جو

بر اتفاق و یقین صلح کے لیے بنیادی شرطیں قرار پائی تھیں، ان میں بارہویں شرط یہ تھی:

”موجودہ سلطنت عثمانیہ میں ترکی کا جو حصہ ہے، اس کو یقین دلایا جائے گا کہ اس کی وہ سلطنت محفوظ رہے گی، لیکن دوسری اقوام جو سلطنت ترکی کے زیر حکومت ہیں، ان کو بھی اس

کا اطمینان دلایا جائے گا کہ ان کی جان و مال محفوظ ہے اور ان کی ترقی میں کوئی رکاوٹ نہ ہوگی۔

بد عہدی کی حد ہو گئی

ان مواعید کو کس طرح پورا کیا گیا یہ ایک دردناک داستان ہے۔ جو بد سلوکی ٹرکی کے ساتھ کی گئی، وہ نہ جرمنی کے ساتھ کی گئی نہ آسٹریا کے ساتھ اور نہ کسی دوسرے فریق جنگ کے ساتھ۔ برٹش فوجوں نے دارالسلطنت قسطنطنیہ پر قبضہ کر لیا اور خلیفہ المسلمین کی حیثیت ایک نظر بند کی سی کر دی۔ عراق پر برطانیہ نے حکم برداری کا دعویٰ کر دیا۔ شام کو ٹرکی سے الگ کر کے فرانس کی حکم برداری و بالادستی ماننے پر مجبور کر دیا؛ چنانچہ فرانس کی فوجوں نے شام پر جبراً قبضہ کر لیا۔ بصرہ، بغداد، بیت المقدس، کوفہ، کربلائے معلیٰ، نجف اشرف پر گورنمنٹ برطانیہ نے قبضہ کر لیا۔ سمرنا جو ایشیائے کوچک کا مشہور وزیر خیز مقام ہے، ٹرکی سے علیحدہ کر دیا گیا۔ وہاں کی مسلمان آبادی پر یونانیوں نے بے پناہ مظالم کیے۔

۵۔ جون ۱۹۱۶ء کو خالص سرزمین حجاز میں سازش کر کے شریف مکہ سے بغاوت کرائی گئی۔ اس بغاوت کی وجہ سے اس مخم دارالامن میں کشت و خون کا بازار گرم ہوا اور صدرِ عدم میں گولہ باری ہوئی۔ جدہ پر بھی گولہ باری ہوئی۔ برطانوی ہوائی جہاز نے مدینہ طیبہ کی فضا میں چکر لگائے۔

ٹرکی کو تنہا کے نکل علاقہ سے مع ایڈریا نوپل کے محروم کر دیا گیا۔ ادھر ہندوستان میں جنگ کے دوران میں ہندوستان کے لیڈروں، سیاسی رہنماؤں اور ذی اثر علماء کو گورنمنٹ برطانیہ نے نظر بند کر دیا اور ان کی نقل و حرکت پر کڑی پابندیاں عائد کر دیں۔ گورنمنٹ برطانیہ کی نیت بد تھی، وہ کسی قیمت پر اپنے مواعید نہ اہل ہند کے ساتھ اور نہ مسلمانان ہند کے ساتھ پورا کرنے پر آمادہ تھی۔ ملک میں بے چینی بڑھ گئی۔ انقلابی تحریکیں کوڑیں لینے لگیں۔ حکومت ہند نے ان تحریکیوں اور سازشوں کی روک تھام کے لیے ہندوستان کی مجلس قانون ساز میں دل

ایکٹ کے نام سے ایک بل پیش کیا۔ غیر سرکاری اراکین کی مخالفت کے باوجود یہ بل پاس ہو گیا۔ مسٹر گاندھی کے زیرِ نگرانی ہندوستان کے تمام سیاسی لیڈروں نے جن میں ہندو مسلمان سیکھ سبھی شامل تھے، ستیہ گرہ یعنی عدم تعاون کی تحریک جاری کر دی جس کا اصل مقصد یہ تھا کہ رولٹ ایکٹ کے بل کا نفاذ نہ ہو سکے۔ یہ تحریک پُر امن طریقہ پر جاری نہ رہ سکی۔ دہلی، احمد آباد اور بمبئی میں اس تحریک کی وجہ سے فسادات ہوئے۔ امرتسر اور لاہور دو شہر پنجاب کی سیاسی تحریک کا مرکز بن گئے۔ امرتسر میں عوام کے ہجوم نے مشتعل ہو کر سبک عارتوں کو آگ لگا دی۔ چند ایک انگریز قتل بھی ہو گئے کئی اور مقامات پر بھی فسادات ہوئے۔ گورنمنٹ نے مارشل لا نافذ کر دیا۔ فوجی عدالتیں قائم کی گئیں۔ ہر قسم کے جلسے اور جلوس ممنوع قرار دیئے گئے۔ امرتسر میں اس قانون کی مخالفت کرتے ہوئے جلیانوالہ باغ میں ایک جلسہ منعقد کیا گیا۔ اہل جلسہ پر جنرل ڈائر نے بغیر تنبیہ اور اطلاع کے گولی چلا دی۔ سینکڑوں لوگ مر گئے۔ اس قتل عام نے اہل ہند کے دلوں میں انتہائی بدظنی اور نفرت پیدا کر دی۔ ستیہ گرہ کی تحریک، مارشل لا کے نفاذ اور جلیانوالہ باغ کے ہولناک واقعات نے بہت زیادہ بے چینی پیدا کر دی۔ دوسری طرف سقوطِ خلافت نے اور تمام مواعید کی خلاف ورزیوں نے مسلمانوں کو برا فوختہ کیا ہوا تھا۔ انگلستان کی حکومت نے ٹرکی کو نہایت ذلیل شرائط پر صلح کرنے کے لیے مجبور کیا تھا۔ سلطانِ ٹرکی ہندوستان کے مسلمانوں کے نزدیک خلیفہ اسلام تھا۔ ٹرکی کی تباہی اسلامی خلافت کی تباہی تھی۔

ان حالات میں ملک میں بیک وقت دو تحریکیں شروع ہو گئیں۔ ایک تحریک کا سربراہ مسٹر مہاتما گاندھی تھا دوسری تحریک خلافتِ اچھی پیش تھی۔ کانگریس اور مجلسِ خلافت کے اتحاد نے ہندوستان میں قومی وحدت کی صورت پیدا کر دی۔ ملک نے عدم تعاون کی تحریک شروع کی۔ اس تحریک کا منشا یہ تھا کہ انتظامی معاملات میں گورنمنٹ کے ساتھ تعاون نہ کیا جائے۔ لوگوں کو تلقین کی گئی کہ وہ سرکاری خطابات اور جاگیروں اور انعامات کو واپس کر دیں۔ سرکاری سکولوں کا بائیکاٹ کر دیا گیا۔ بدلتنی کپڑا چھوڑا گیا۔ جمعیت العلماء ہند نے اہل اسلام

کے لیے پولیس اور فوج کی نوکری کو حرام قرار دیا۔ وکلاء نے عدالتوں کا بائیکاٹ کیا۔ یہ تحریک ایک دفعہ نازک مرحلہ پر پہنچ گئی۔ گورنمنٹ نے ہندوستان کے تمام لیڈروں کو گرفتار کر لیا۔ بڑی بڑی طویل سزائیں دیں۔ ہزار ہا آدمی جیلوں میں چلے گئے۔

۱۹۲۱ء میں لارڈ ریڈنگ ہندوستان کے دائرے بن کر آئے۔ ہندوستان کی سیاسی فضا عدم تعاون اور خلافت کی تحریک کی وجہ سے کافی مکدر تھی۔ راعی اور رعایا کے باہمی تعلقات نہایت کیندہ تھے؛ چنانچہ نومبر ۱۹۲۱ء میں حسب پرنس آف ویلز بیٹی اترے تو وہاں سخت فساد ہو گیا۔ کئی آدمی مارے گئے اور سینکڑوں زخمی ہوئے۔ کانگریس نے ہندوستان کے استقبال میں کسی جگہ حصہ نہ لیا۔

دریں اثنا مسٹر گاندھی نے کاٹھیاواڑ کے ضلع باردولی سے عدم ادائیگی ٹیکس کی تحریک جاری کی یعنی لوگ گورنمنٹ کو کسی قسم کا ٹیکس اور لگان ادا نہ کریں۔ مسٹر گاندھی نے ساتھ ہی پرنس رہنے کی تاکید کر دی۔ عوام مسٹر گاندھی کے اصولوں کو نہ بیاہ سکے۔ تشدد پورا تر آئے۔ مسٹر گاندھی نے ناراض ہو کر عدم ادائیگی ٹیکس کی تحریک کو واپس لے لیا۔ گورنمنٹ نے مسٹر گاندھی کو چھ سال کے لیے قید کی سزا دے دی۔ دیگر سیاسی لیڈروں کو بھی سزائیں ملیں۔ مسٹر گاندھی نے اس تحریک کو بند کر کے لوگوں کے حوصلوں کو بہت پست کر دیا۔ لارڈ ریڈنگ کو موقع مل گیا۔ اس نے ایک طرف عدم تعاون کی تحریک کو ناکام بنایا، دوسری طرف ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان فرقہ وارانہ فسادات شروع ہو گئے جن میں فریقین کا کافی نقصان ہوا۔

مولانا داؤد غزنوی

ان ہی دنوں مسجد دارالہور کے باہر ہندو مسلمانوں کا ایک ملاحلا احتجاجی جلسہ ہوا۔ لالہ گورداس ایک ہندو لیڈر نے تقریر کی۔ کچھ اور تقریریں ہوئیں۔ رات کا سماں تھا اور شاہد ۱۹۲۲ء کا ستمبر اکتوبر کا مہینہ تھا کہ مولانا داؤد غزنوی اور مولانا

عطاء اللہ شاہ بخاریؒ ایک سیاسی شلیج پر نمودار ہوئے۔ اس اجلاس میں سب سے آخری تقریریں انہی دونوں حضرات نے کیں۔ دونوں نوجوان، وجیبہ صورت، سحر طراز مقرر اور انقلابی خطیب تھے۔ اس پہلی صحبت میں ہی دونوں کے زور بیان اور نیرنگی گفتار نے پبلک کا دل ہوا لیا۔ ان کی زبانوں میں ذریعہ کی روانی، جلال میں تلواروں کی کاٹ اور جمال میں صبا کی لہلاہ پائی جاتی تھی۔

زندگ تا بقدم ہر کجا کہ مے نغم

کرشمہ دامن دل مے کشد کہ با اینجا بست

اس کے بعد لاہور کے ہر سیاسی جلسے میں دونوں اکٹھے شمولیت فرماتے۔ دونوں میں کچھ اوصاف مشترک تھے۔ دونوں فصیح اللسان، مجاہد، ہمہ تن زینار، سراپا اخلاص، سرفروش غازی، جامع شرافت، نسی و شرافت ذاتی، طلیق الوجہ، خوش گفتار، بلند اخلاق، حسین صورت، لطیف تہمت تھے۔ علوم مذہبی میں دستگاہ اور علوم عصری سے آگاہ؛

بہار عالم حنش دل و جان تازہ میدارد

برنگ اصحاب صوت را بہر اصحاب معنی را

یہ تھا ان دونوں سرفروشنوں کی زندگی کا آغاز علمی مشاغل سے بھی لگاؤ رکھا اور اسلامی و ملی سیاست سے بھی گہری دلچسپی رہی۔ ملکی اور وطنی تحریک میں کئی بار جیل گئے، بلکہ دونوں کی جوانی کا زمانہ جیلوں میں گنا۔ ان کے پائے استقلال میں کبھی لغزش پیدا نہ ہوئی۔ آخری دم تک اپنے اصول پر ڈٹے رہے۔

مولانا محمد داؤد غزنویؒ کچھ خاص خصائص کے حامل تھے۔ وہ علاوہ خطیب اور مقرر

ہونے کے ایک پختہ کار عالم دین تھے۔ تفسیر، حدیث، رجال، فقہ اور تصوف میں کامل دستگاہ تھی۔ ان کی تقریر متین و مدلل، پرمغز و پر معانی، حشو و زوائد سے پاک ہوتی تھی۔ نقشبندی صوفیاء کے سلسلہ سے منسک تھے۔ ایک دفعہ نیلا گنبد کی مسجد میں اپنا طریقت کا سلسلہ یوں بیان

فرمایا کہ سلسلہ نقشبندیہ میں میری بیعت اپنے والد حضرت مولانا عبدالجبار رحمۃ اللہ علیہ سے ہے اور حضرت مولانا عبدالجبار رحمۃ اللہ علیہ کی بیعت اپنے والد حضرت مولانا عبداللہ غزنویؒ سے ہے۔ حضرت مولانا عبداللہؒ کی بیعت شیخ وقت حضرت مولانا حبیب اللہ قندھاریؒ سے ہے۔ حضرت مولانا حبیب اللہ قندھاریؒ کی بیعت حضرت سید احمد شہیدؒ سے ہے۔

مولانا شباب الدین فاضل دیوبند خطیب جامع گورنمنٹ کوارٹرز چورجی گارڈز لاہور نے ایک واقعہ بیان کیا کہ میں جب دیوبند میں زیر تعلیم تھا تو ایک دفعہ ایک ماہ کی رخصتوں کے لیے دارالعلوم بند ہو گیا۔ منتم دارالعلوم نے طلبہ کو اپیل کی کہ واپسی کے وقت اپنے اپنے علاقوں سے دارالعلوم کے لیے امدادی رقم فراہم کر کے لائیں میں امرتسر کے سٹیشن پر اتر پڑا اور رات گزارنے کے لیے غزنویوں کی مسجد میں جا بٹھا۔ رات کے دو بجے تہجد کی نماز کے لیے ایک شخص مسجد میں آیا خشیت و خوفِ الہی کی وجہ سے اس کی آنکھوں سے آنسو مسجد کی چٹائی پر اس طرح ٹپک رہے تھے جس طرح بارش کی وجہ سے چھت سے قطرات پگھلتے ہیں۔ چونکہ مسجد میں اندھیرا تھا میں نے دیاسلائی جلا کر معلوم کرنا چاہا کہ یہ کون صاحب ہیں؟ معلوم ہوا کہ مولانا عبدالجبار صاحب غزنویؒ ہیں۔ مولانا عبدالجبار صاحبؒ اس وقت نماز ختم کر کے مسجد سے نکل گئے تھے۔ صبح میں ان کی خدمت میں حاضر ہوا اور مدعا بیان کیا کہ حضرت میں دیوبند سے آیا ہوں، طالب علم ہوں، اپنے دارالعلوم کے لیے کچھ امداد کا طالب ہوں۔ حضرت مولانا عبدالجبارؒ نے جمعہ کے خطبہ میں چندہ کے لیے اپیل کی، چندہ جمع ہوا اور میرے حوالے کیا۔ حضرت مولانا عبدالجبارؒ کے برادر خرد حضرت مولانا عبدالواحد صاحب غزنویؒ مدظلہ العالی چینانوالی مسجد کے خطیب رہے۔ مجھے کئی دفعہ حضرت مولانا عبدالواحدؒ کی اقتداء میں نماز پڑھنے کا موقع ملا۔ بہت رقیق القلب تھے۔ جب قرأت میں آیاتِ نعبہ و آیاتِ نستعین پڑھتے تو بے اختیار آواز بھرا جاتی اور آنکھوں سے آنسو جاری ہو جاتے۔ حافظ ابن قیمؒ کے عاشق زار تھے۔ ان کی تصنیفات سے انہیں بہت مناسبت تھی۔ مولانا عبدالواحدؒ کی

وفات کے بعد چنیا نوالی مسجد کی خطابت کے فرائض مولانا محمد داؤد غزنویؒ ادا کرتے رہے۔
 مجھے کئی دفعہ مولانا مرحوم کے درس قرآن میں شرکت کا موقع ملا۔
 الغرض حضرت مولانا مرحوم بے شمار محاسن کا مجموعہ تھے۔ بہت سے کمالات و اوصاف سے
 قدرت نے انہیں نوازا تھا۔

داماں نگہ تنگ گلِ حسن تو بسیار

گلِ چین نگاہ تیز داماں گلہ دارد

مکتوبات حضرت مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ بالعموم حضرت مولانا کے زیر مطالعہ رہتے۔ ایک
 دفعہ فرمایا کہ میں جیل کے زمانہ کا زیادہ وقت مکتوبات کے مطالعہ میں گزارتا ہوں۔ نماز کے بارے
 میں شیخ مجدد کے مجملہ مکاتیب حضرت مولانا نے یکجا ایک مسودہ کی صورت میں جمع فرمائے تھے۔
 اس کی اشاعت چاہتے تھے مگر بیماری کی طوالت نے آپ کی یہ خواہش پوری نہ ہونے دی۔

یادِ رفتگان

حضرت مولانا کی وفات کے سلسلے میں مجھے ایک ایک کر کے وہ تمام بزرگ مجاہد سرفروش
 غازی اور شہید یاد آ رہے ہیں جنہوں نے اس ملک میں اسلام کی برتری کے لیے اور اپنے ملک
 کی آزادی کے لیے قید و بند کی مصیبتیں برداشت کیں۔ ان کی ایک طویل فہرست ہے بعض ان
 میں بڑی بلند ہستیاں ہیں حضرت مولانا اسی سلسلہ کی آخری کڑی تھے۔ اب شاید جو باقی ہیں اور
 بقید حیات ہیں انگلیوں پر گنے جاسکتے ہیں۔ ان بزرگواروں کے قدر دان بھی دُنیا سے رخصت
 ہو رہے ہیں کیسی کیسی بابرکت ہستیاں تھیں۔ ان کی صحبتوں میں ایمان تازہ ہوتا تھا۔ وہ سب کے
 سب مجسمہٴ اخلاص تھے۔ اللہ کریم ان سب کی قبول کو نذر سے بھر دے۔ ان کی خطاؤں سے
 درگزر کرے، ان کی قربانیوں کو قبول کرے اور جنت الفردوس میں ان کو جگہ دے۔ دُنیا میں
 حضرت مولانا محمد داؤد غزنویؒ کی ان لوگوں سے رفاقت رہی بلا واسطہ یا بالواسطہ ان سے مربوط

رہے۔ میں یقین کرتا ہوں کہ عالمِ آخرت میں بھی ان کی رفاقت قائم رہے گی۔

حضرت مولانا مسکاف سلفی العقیدہ اہل حدیث اور متبع کتاب و سنت، مگر منتقد دینی تھے۔ آمدِ نجدتین بالخصوص حضرت امام ابوحنیفہؒ کا پورا پورا احترام کرتے تھے۔ فروعی مسائل میں کبھی نہیں اُلجھتے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ دیوبندی علماء آپ کو عقیدت کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔ خود مولانا صاحب کا اپنا بیان ہے کہ مولانا مفتی کفایت اللہ صاحب مرحوم کے بعد جمعیت علماء ہند کے صدر مولانا حسین احمد مدنی شیخ الحدیث دارالعلوم دیوبند بنے اور نائب صدر کا عہدہ مجھے تفویض ہوا۔ یہ معلوم ہے کہ مولانا حسین احمد مدنیؒ مذہب کے بارے میں نہایت متقشف اور سخت گیر تھے، مگر نماز کے وقت امامت کے لیے مولانا حسین احمد مرحوم مجھے آگے کر دیتے اور میری اقتدا میں نماز پڑھتے۔ حضرت مولانا محمد علی مرحوم امیر انجمن خدام الدین لاہور، تمام عمر عیدین کی نماز حضرت مولانا داؤد غزنوی مرحوم کی اقتدا میں پڑھتے رہے۔

مولانا نے شباب کا زمانہ ملکی اور سیاسی تحریکوں میں قربان کیا، مگر پاکستان بن جانے کے بعد اپنی تمام تر توجہ جمعیت اہل حدیث پاکستان کی کامیابی کے لیے مبذول کر دی۔ باوجود علالت اور بڑھاپے کے لمبے اور طویل سفر آپ کو کرنے پڑتے۔ جماعتی الجھنوں کو نہایت صحتاً تدبیر سے حل فرماتے۔

و اسفا علی فراق قوم

ہم المصابیح و الحصون

ہائے افسوس ان لوگوں کی جہانی پر جو روشن چراغ تھے اور ہمت کے قلعے تھے

و المدن و المزن و السواسی

و الخید و الامن و السکون

وہ شہر تھے اور بادل تھے اور پہاڑ تھے۔ خیر و برکت تھے امن تھے اور سکون تھے

لم تتغیر لنا اللیالی حتی توفہم المنون

مے لیے زمانہ نے اس وقت تک رنگ نہیں بدلا جب تک کہ موت نے
ان کو اپنے قبضہ میں نہیں کر لیا)

وكل جمر لنا قلوب

وكل ماء لنا عيون

(اب یہ حال ہے کہ دل انکار ہے تو آنکھیں پانی بہا رہی ہیں یعنی اس آگ کے
سوا ہمارے پاس کوئی آگ نہیں اور اس پانی کے سوا کوئی پانی نہیں ہے)

دارالعلوم تقویۃ الاسلام

ان تمام گونا گوں مصروفیتوں کے باوجود جن کا ان چند پریشان اوراق میں ذکر کر چکا ہوں،
مولانا کا ایک کارنامہ یہ ہے کہ انہوں نے تقسیم ملک کے بعد دارالعلوم تقویۃ الاسلام یعنی مدرسہ
غزنویہ کو جس کی بنیاد مولانا کے والد مولانا عبدالجبار غزنوی نے امرتسر میں رکھی تھی بدستور جاری رکھا
اور باوجود بے شمار مشکلات کے اس چشمہ فیض کو بند نہیں ہونے دیا۔ سچ تو یہ ہے کہ اہل پنجاب
پر بالخصوص ادرپور سے بڑے بڑے پیکر و ہند پر بالعموم غزنوی خاندان کا بہت بڑا احسان ہے جماعت
کی سعادت مندی اور حسن شناسی کا تقاضا یہی ہے کہ جماعت پیش از پیش مالی امداد سے اس
دارالعلوم کو مالی مشکلات سے بے نیاز کر دے۔ لاہور میں جماعت اہل حدیث کا یہ مدرسہ بڑی
خدمات سرانجام دے رہا ہے۔ حضرت مولانا اپنی مسلسل بیماری و ضعف کی وجہ سے مدرسہ کی کاغذ
سرپرستی نہیں کر سکے۔ اب مولانا کے بعد وفاق شاعری اور احسان شناسی کا تقاضا یہی ہے کہ اس
درگاہ کی طرف جس درگاہ نے قال اللہ وقال الرسول کا غنمہ بلند کر کے ملک میں علم و بصیرت
کے چراغ روشن کیے اور جہالت و بدعت سے اس خطے کو پاک کیا پوری توجہ منڈول فرمائیں:

در دلد دارم بے از فوٹے آن زیبا نگار
فرصتے یار سب کہ دل برا پیش دے خالی کتم
بلند مرتبہ زیں خاک آستان شدہ ام
غبار کوٹے تو ام گرد آسمان شدہ ام

مولانا غزنوی رحمۃ اللہ علیہ سے ایک مُلاقات

مولانا محمد داؤد راز
سابق ناظم اعلیٰ آل انڈیا اہلحدیث کانفرنس
(دہلی)

زعیم الملت شہید القوم حضرت العلام مولانا سید محمد داؤد صاحب غزنوی قدس اللہ سرہ کی عظیم ترین شخصیت پر جس قدر بھی لکھا جائے کم ہے۔ درحقیقت مرحوم ان نادر روزگار ستیوں میں سے تھے جن کے لیے خلاق عالم کی نوازشاتِ رفعتِ انسانی کا اعلیٰ ترین مقام مہیا کرتی ہیں۔ جن کے حق میں کہا گیا ہے:

ليس الله بمستنكر ان يجمع العالم في الواحد

یوں تو اس پاک ترین خاندان (غزنوی) کے جلد اکابر اپنے اپنے وقت کے آفتابِ دین اور ماہتابِ شرعِ متین ہیں جن کے فیوضِ روحانی سے برصغیر کے کونہ کونہ نے روحانی تروتازگی حاصل کی لیکن اس سلسلۃ الذہب میں حضرت مولانا محمد داؤد غزنوی کا وجود گرانی بہت سی نمایاں خصوصیات کا حامل نظر آتا ہے۔ آپ ایک پختہ مذہبی انسان تھے اور احیاءِ دینِ متین آپ کا از اول تا آخر نصب العین رہا۔ حضرت مولانا سید محمد شہید اور حضرت مولانا شاہ محمد اسماعیل شہید رحمۃ اللہ علیہم اجمعین نے احیاءِ ملت کا جو کام شروع کیا تھا حضرت مولانا غزنوی رحمہ اللہ نے اسی کو اپنا مسلک قرار دیا۔ انگریزی اقتدار کو آپ قوم اور وطن کے لیے ایک منتقلِ لعنت سمجھتے تھے، اسی لیے جنگِ آزادی کے لیے آپ کی قربانیاں تاریخ میں ہمیشہ سُہری حروف سے لکھی جائیں گی۔ آپ نے خلافتِ کیٹی، کانگریس، جمعیتہ العلماء ہند، مجلسِ احرار وغیرہ تمام تنظیموں میں شرکت فرما کر استخلاصِ وطن کے لیے پیش ہوا

خدمات انجام دیں، بارہا قید و بند کے مصائب کو برداشت کیا۔ حادثہ جلیا نوالہ باغ جس کے باعث پورا پنجاب قبرستان بنا ہوا تھا اور سارے ملک میں ماتم ہوا تھا، اس وقت آپ نے انگریزی اقتدار کے خلاف ایک شور مچا کر دیا۔ یہ زمانہ اس قدر مہیب تھا اور اس وقت انگریزی استبداد اس قدر ظلم پر کمر بستہ تھا کہ حتیٰ والصفاء کے لیے زبان کھولنا اور آواز بلند کرنا صرف ان ہی لوگوں کا کام ہو سکتا تھا، جو شیروں جیاد ل رکھتے تھے اور جنہیں قدرتِ کاملہ نے اس لیے وجود بخشا تھا کہ وہ ظالم انگریز کو کیفرِ کردار تک پہنچائیں، ملک کو ان کے مظالم سے نجات دلائیں اور ہندوستان کی سپہاۓ اقوام کو غلامی کی ذلت سے نکال کر آزادی و حریت کی عزت سے سرفراز کریں۔ الغرض وطن اور ملی خدمات کے سلسلہ میں مولانا مرحوم کا نام ہمیشہ یاد رہے گا۔

مجھ ناچیز کو حضرت مولانا غزنوی رحمۃ اللہ علیہ کی زیارت کے کئی مواقع ملے اور تقسیم ملک سے قبل کئی مرتبہ آپ کے دیدار پر ازار اور آپ کے خطباتِ عالیہ سننے کی سعادت نصیب ہوئی، مگر ۱۳۸۱ھ میں بتقریب حج غالباً ۴ اذی الحجہ کی ملاقات تاحیات یاد رہے گی۔ اس سال حضرت ۴۱ حکومتِ سعودیہ کی دعوتِ خصوصی پر حجاز تشریف لائے تھے اور بحیثیت ایک معزز رکن کے آپ مدینہ یونیورسٹی کی مجلسِ مشاورت میں شرکت فرما رہے تھے۔ مکتہ المکرمہ و حجاز کے دیگر اخبارات میں آپ کی تشریف آوری اور آپ کے خطباتِ عالیہ کا کافی تذکرہ تھا۔ میرے کئی ایک مخلصین نے جب یہ باتیں معلوم کیں تو سب نے بالاتفاق زور دیا کہ حضرت مولانا مدظلہ سے ملاقات کی جائے۔ اس سے بہتر موقع اور نہ مل سکے گا۔ تقسیم ملک کی وجہ سے جو کچھ دُوری حضرت مولانا سے ہو گئی وہ ظاہر ہے۔ معلوم ہوا کہ حضرت مولانا مصری ہوٹل میں قیام پذیر ہیں؛ چنانچہ میں بعد مغرب اپنے پانچ سات مخلص رفقاء کے ہمراہ مصری ہوٹل کی جانب روانہ ہوا۔ وہاں پہنچنے پر بڑا بے تلبا لیا کہ مولانا کہیں باہر تشریف لے گئے ہیں اور جلد ہی واپس آنے والے ہیں۔

ہم لوگ انتظار میں وہاں بیٹھ گئے۔ صرف دس بارہ منٹ گزرے ہوں گے کہ میرے ساتھیوں نے دیکھا ایک بہت ہی نورانی شکل والے بزرگ تشریف لارہے ہیں جن کی شکل و صورت سرتاپا آیت کریمہ سیما ہم فی وجوہ ہم من اثر السجود کا منظر پیش کر رہی ہے۔ میں نے فرط مسرت میں اپنے ساتھیوں کو بتلایا کہ جن بزرگ کی زیارت کے لیے آپ حضرات تشریف لائے ہیں وہ آپ ہی ہیں چنانچہ سب سے پہلے میں نے اپنا تعارف کراتے ہوئے مصافحہ کے لیے ہاتھ بڑھایا جس پر حضرت مولانا قدس سرہ العزیز نے مجھ کو اپنے سینے سے لگالیا اور آپ کے یہ الفاظ مبارکہ میرے لیے باعثِ صد فخر ہیں جو ہمیشہ مجھے یاد رہیں گے۔ آپ نے بڑی ہی محبت آمیز آواز میں فرمایا:

”بھئی آپ سے ملنے کی ایک عرصہ سے آرزو تھی اللہ کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ آج حرم شریف میں اللہ پاک نے ملاقات کرا دی۔“

یہ فرماتے ہوئے کافی دیر تک سینہ سے لگا کر دعائیں دیتے رہے پھر سب ساتھیوں سے فرداً فرداً مصافحہ فرمایا اور میں نے سب کا تعارف کرایا۔ اب ہم سب حضرت کے ساتھ ایک بیچ پر بیٹھ گئے مولینا نے اپنی طبیعت کا حال سنایا پھر عائتہ المسلمین ہند خصوصاً جماعتی کوائف دیر تک دریافت فرماتے رہے۔ دہلی کے اکابر حضرات کا فرداً فرداً حال پوچھا۔ اہمڈیٹ کانفرنس اور حضرت مولانا آرمی مدظلہ العالی و دیگر حضرات کے احوال دریافت فرماتے رہے۔ اس ملاقات سے ہماری خوشی کا کوئی اندازہ ہی نہ تھا، مگر عوم بھی سجد خوش ہوئے۔ تقریباً نصف گھنٹہ آپ کے ساتھ یہ بابرکت نشست رہی۔ رخصت کرتے وقت فرمایا کہ ہندی مسلمانوں بالخصوص جماعت اہمڈیٹ ہند کو میرا سلام اور خیریت پہنچا دینا اور یہ بھی فرمایا کہ شاید ابھی ایک دو روز قیام رہے۔ میں مغرب کے بعد بابِ سعود کے پاس بیٹھا کرتا ہوں، وہاں مجھ سے پھر ملنا۔ دوسرے دن بڑے اشتیاق

سے میں آپ کی ملاقات کے لیے بعد مغرب باب مسجد کے پاس پہنچا تو حضرت مولانا
 کہیں نظر نہ آئے معلوم ہوا کہ موصوف شاہی طبیارہ میں مدینہ منورہ تشریف لے گئے
 ہیں، وہاں جامعہ اسلامیہ کی جنرل کونسل کا اجلاس شروع ہے، آپ وہاں شرکت فرمان
 کے لیے بلا لیے گئے ہیں۔ دوسرے دن اخبارات کے ذریعہ آپ کی خیریت اور مدینہ منورہ
 بعافیت پہنچنے کی خبر معلوم ہوئی۔ مرحوم نے یہ بھی فرمایا تھا کہ اللہ کو منظور ہوا تو کبھی ہندوستان
 آکر سب سے ملاقات کی کوشش کروں گا۔ صد افسوس کہ مرحوم کی یہ تمنا پوری نہ ہو سکی
 اور وہ جو ار رحمت میں پہنچ گئے۔ امسال میں نے آپ کی زیارت کے لیے پاکستان
 حاصل کیا ہی تھا کہ آپ کے وصال کی خبر آگئی، انا للہ وانا الیہ راجعون۔

اللہ پاک مرحوم کو فردوس بریں میں جگہ دے، الغرضوں کو معاف کرے۔ آپ
 کے اخلاف کو آپ کا سچا جانشین بنائے اور پوری ملت اسلامیہ کی طرف سے آپ کو
 بہترین جزاؤں سے نوازے آمین۔

حضرت مولانا سید محمد اود غزنوی رحمۃ اللہ تعالیٰ

چند واقعات و تاثرات

مولانا محمد اسحاق بھٹی

سابق مدیر "الاعتصام" لاہور

سُرخ و سپید رنگ، باوقار و پُر جلال چہرہ، کشادہ پیشانی، فکر و تدبیر کی لکیروں سے مزین، ستوانِ ناک، تیز آنکھیں، ذہانت و فطانت کی عمارت، سفید براق سی خوبصورت ڈڑھی، معتدل جسم، میانہ قد، گرجدار اور بارِ شعب آواز، گفتار و کردار میں جلال و جمال کا حسین امتزاج، متانت و سنجیدگی کا پیکرِ دل نواز، چال میں نمکنت، گفتگو میں اعتدال، رائے میں توازن، صاف سُتھرے لباس میں تن پوش، وقت کے پابند، قاعدہ و ضابطہ میں بندھے ہوئے، تکلفات سے پاک، تصنع سے نفور، دوستوں کے بہادر، ساتھیوں کے خیر خواہ، چھوٹوں پر دُستِ شفقت رکھنے والے، علماء کے قدر دان، بزرگانِ دین سے محبت اور تعلقِ خاطر میں بے مثلِ علم و فضل میں یکتا، فکر و دانش میں بے نظیر، تحقیق و کاوش میں منفرد، فہم مسائل میں یگانہ اور ان کی تعبیر میں درجہ ممتاز پر فائز، وظائف و اواراد کے شوگر، آزادیِ وطن کے قائد، سیاسیات کے نباض اور اس کے نشیب و فراز پر نگاہِ عمیق رکھنے والے، عالمانہ وقار، صوفیانہ عادات، بزرگانہ اطوار، شاہانہ مزاج، بہادرانہ خصال، مجاہدانہ کردار، شجاعانہ بلینارہ۔

یہ تھے حضرت مولانا سید محمد داؤد غزنوی رحمۃ اللہ تعالیٰ رحمۃ واسعۃ۔

مولانا کی پہلی تقریر جو میں نے سنی

مولانا داؤد غزنوی کی تقریر سننے کی سعادت پہلی دفعہ مجھے ۱۹۳۷ء یا ۱۹۳۸ء میں حاصل

ہوئی۔ اُن دنوں میری عمر تیرہ چودہ سال تھی۔ اگر میرا حافظہ غلطی نہیں کرتا تو ضلع فیروز پور کی عمت اہل حدیث نے مولانا محمد علی لکھوی لدنی کے اہتمام و انصرام میں ایک بہت بڑی کانفرنس کے انعقاد کا انتظام کیا۔ مولانا غزنویؒ اس کانفرنس کے صدر تھے۔ مجھے یاد ہے مولانا غزنویؒ لاہور سے بذریعہ موٹر کار فیروز پور تشریف لے گئے تھے۔ جو سنی وہ ہندال میں داخل ہوئے فضا لغروں سے گونج اُٹھی اور لوگ عقیدت و مسرت کے جذبات سے ان کی طرف دوڑے۔ مولانا نے عشاء کی نماز کے بعد بہت بڑے اجتماع میں تحریری خطبہٴ صدارت پڑھا۔ سامعین نہایت اہمک و توجہ سے ان کے خیالات و افکار سن رہے تھے۔ یہ بات اب تک میرے ذہن میں محفوظ ہے کہ انہوں نے اپنے خطبے میں علمی و سیاسی اعتبار سے فیروز پور کی بعض معروف شخصیتوں کا ذکر کیا تھا، جن میں سے بعض وفات پا چکے تھے۔ اس کے علاوہ مسئلہ فلسطین، اسلامی ممالک کی رفتار سیاست اور انگریزی کی اس سے دلچسپی کی وجوہ پیلانی قومی حالات، ملک کی تحریکِ حریت، اس کے سیاسی کوائف، برطانوی حکومت کے ظلم و استبداد کے واقعات، اس بزرگ عظیم میں علمائے کرام اور زعمائے اہل حدیث کی انگریز دشمن سرگرمیوں کی تفصیلات بیان کی تھیں اور لوگ کامل توجہ اور غور سے ان کے افکار عالیہ سے مستفید ہو رہے تھے۔ اگرچہ ان کی باتیں میرے فہم دشواری کی گرفت میں نہیں آسکیں مگر میں اس پر بہت ہی خوش تھا کہ میں نے اتنے بڑے آدمی کی تقریر سنی اور ان کو دیکھا۔

زیارت کا دوسرا موقع

مولانا غزنویؒ کی زیارت کا دوسرا موقع ۱۹۳۹ء میں ملا۔ جنگِ عظیم شروع ہو چکی تھی۔ مولانا ابوالکلام آزاد لاہور تشریف لائے۔ اخبارات میں اعلان ہوا کہ وہ دہلی دروازے کے باہر جلسہٴ عام سے خطاب کریں گے۔ مجھے ان کو دیکھنے اور ان کی تقریر سننے کا بے حد شوق تھا۔ لاہور آیا جلسہ گاہ میں پہنچا تو بہت ہجوم تھا۔ مولانا ابھی جلسہ گاہ میں نہیں آئے تھے۔

جمع دُور تک پھیلا ہوا تھا اور بڑا شور تھا۔ میں طبع کے بالکل قریب تھا۔ اتنے میں سُرخ و سفید رنگ کے ایک صاحب نہایت صاف سُتھرے کھدر کا لباس پہنے، سفید عامر باندھے ہوئے بہت وجیہ اور بارعجب طبع پر نمودار ہوئے۔ لوگوں نے کہا: ”مولانا ابوالکلام آگئے۔“ وہ مولانا داؤد غزنوی تھے۔ اس موقع پر انہوں نے جو الفاظ کہے وہ اب تک میرے کانوں میں گونج رہے ہیں :

”حضرت! مجھے معلوم ہے، آپ امام الہند مولانا ابوالکلام آزاد کی تقریر سننے کے لیے تباہ ہیں اور آپ کی یہ بیباکی اور جوش و خروش بالکل صحیح ہے۔ چند منٹ میں مولانا تشریف لارہے ہیں۔ آپ خاموشی سے مولانا کی تقریر سنیں گے۔ اگر آپ نے خاموشی اختیار نہ کی تو مولانا کے افکار عالیہ سے مستفید نہیں ہو سکیں گے۔“ اتنے میں مولانا ابوالکلام تشریف لائے، مولانا نے آگے بڑھ کر ان کا استقبال کیا۔ دونوں بزرگ ایک ساتھ کرسیوں پر تشریف فرما ہوئے۔ فضا میں نعروں کی آوازیں بلند ہوئیں۔ مولانا داؤد غزنوی نے کرسی سے ہو کر دوبارہ لوگوں کو خاموش رہنے کی تلقین کی۔

جمعیتہ علمائے ہند کا اجلاس لاہور

غالباً ۱۹۴۲ء کے مارچ میں جمعیتہ علمائے ہند کا سالانہ اجلاس لاہور میں مولانا حسین احمد کی زیر صدارت منعقد ہوا۔ مولانا سید داؤد غزنوی صدر استقبال تھے۔ مولانا نے کثیر مدد میں علماء و زعماء کو دعوت نامے بھیجے۔ ہمارے علاقے کے بھی بہت سے لوگوں کو دعوت نامے دی گئی تھی۔ دعوت نامے پر مولانا کی دستخطی نمونہ ثبت تھی جس میں داؤد غزنوی کا خطاب و نقش تھے۔ لوگوں کے ساتھ میں بھی لاہور آیا۔ اس میں ایک عجیب واقعہ یا حادثہ یا جس کی مختصر الفاظ میں تفصیل یہ ہے کہ مولانا حسین احمد کے خطبہ صدارت کے بعض پر پڑنا میں اچانک مخالفانہ نعرے بلند ہونے لگے۔ مولانا مدنی متین اور دھیمے انداز

کے بزرگ تھے انہوں نے لغرے لگانے والوں سے خاموش رہنے کی اپیل کی، مگر سیدلہ بند نہ ہوا۔ مولانا داؤد غزنویؒ صدر استقبالیہ کی جنیت سے طمع پر تشریف فرما تھے۔ وہ کھڑے ہوئے اور مولانا مدنیؒ سے اجازت لے کر مخالفانہ لغرے لگانے والوں سے کہا:

”حضرات! خاموش ہو جائیے۔ مولانا کا خطبہ اطمینان سے سنیے۔ اگر اس میں آپ کے نزدیک کوئی اعتراض کی بات ہے تو بعد میں بیان کیجیے گا۔ آپ کو مطمئن کرنے کی کوشش کی جائے گی“ لیکن اس کا بھی کوئی اثر نہ ہوا۔ مخالفین میں پنجاب کے مشہور مسلم لیگ لیڈر عبدالباری مرحوم بھی شامل تھے۔ جب کوئی اپیل کارگر نہ ہوئی، تو مولانا غزنویؒ نے پورے رعب و جلال کے ساتھ اعلان کیا:

”میں کتنا ہوں آپ خاموش ہو جائیے۔ اگر آپ خاموش نہیں ہوں گے تو آپ کو خاموش کر دیا جائے گا۔“

گھڑی دیکھ کر کہا: ”میں آپ کو پانچ منٹ کی مہلت دیتا ہوں۔“ وقت گزرتے لگا اور مولانا نے کہنا شروع کیا: ”دیکھیے اب چار منٹ باقی رہ گئے ہیں، تین منٹ باقی رہ گئے ہیں، دو منٹ باقی رہ گئے ہیں۔ ہر منٹ گزر جانے کے بعد یہی اعلان کرتے جاتے۔ جب ایک منٹ باقی رہ گیا۔ تو کہا: ”دیکھیے اب ایک منٹ باقی رہ گیا ہے۔“ جب ایک منٹ بھی بنگامے کی نذر ہو گیا، تو رضا کاروں سے مخاطب ہوئے:

”والیغیر ز تیار ہو جاؤ اور انہیں خاموش کر دو۔“ اکثریت احرار رضا کاروں پر مشتمل تھی۔ انہوں نے اس تیزی اور مستعدی سے تعیل حکم کی۔ دس منٹ کے اندر اندر جلسے میں بالکل امن تھا۔

یہ قصہ خود مولانا بھی بیان کیا کرتے تھے اور اس میں ایک ایسا واقعہ بھی پیش آیا جس کا ذکر زبانِ قلم پر لانا مناسب نہیں۔ اس کا تعلق ایک مشور لیڈر سے ہے جو دفاتر پانچکے ہیں۔ اس وقت وہ مولانا کے مخالف تھے، لیکن بعد میں بہت بڑے دوست

بن گئے تھے۔

آل مسلم پارٹیز کا نفرنس

۱۹۴۵ء میں دوسری جنگ عظیم ختم ہوئی تو برطانوی حکومت نے ہندوستان کے سیاسی قیدیوں کو رہا کر دیا اور آزادی وطن کے مسئلہ پر گفتگو شروع ہوئی۔ کچھ عرصہ بعد ملک میں عام انتخابات کے انعقاد کا اعلان کر دیا گیا۔ سیاسی جماعتیں میدان میں اُتر آئیں۔ ۱۹۴۶ء کے مارچ میں جمعیتہ علماء ہند نے اپنے دفتر واقع گللی قاسم جان دہلی میں، انتخاب کے سلسلے میں آئندہ لائحہ عمل طے کرنے کے لیے ’مسلم لیگ‘ کو چھوڑ کر تمام مسلمان سیاسی جماعتوں کا اجلاس بلا دیا۔ اس اجلاس میں ملک کے مشہور مسلم زعماء نے شرکت کی، جن میں مولانا حسین احمد مدنی، مولانا مفتی کنایت اللہ، مولانا احمد سعید دہلوی، پروفیسر پٹیلوں کبیر (جو بعد میں مولانا ابوالکلام آزاد کے سیکرٹری مقرر ہوئے) مولوی فضل الحق، مولانا حفظ الرحمن سیوہاروی، خواجہ عبدالمجید (سابق چانسلر مسلم یونیورسٹی علی گڑھ)، مولانا محمد میاں، مولانا بخش سومرو، مولانا عبدالمجید سوہاروی مرحوم، مولانا عطاء اللہ عقیق وغیرہ بے شمار حضرات شریک ہوئے۔ میں بھی اس اجلاس میں شریک تھا۔ اجلاس مولانا حسین احمد مدنی کی صدارت میں منعقد ہوا۔ یہ جمعیت کے صدر تھے اور مولانا سید داؤد غزنوی اس زمانے میں جمعیت علماء ہند کے نائب صدر تھے۔ اجلاس شروع ہوا تو مولانا غزنوی دہلی نہیں پہنچے تھے۔ میں نے دیکھا کہ ان کا شدید انتظار ہو رہا ہے اور بار بار مولانا مدنی اور دیگر حضرات ایک دوسرے سے بے تابی کے عالم میں پوچھتے تھے کہ مولانا داؤد غزنوی نہیں آئے ہیں یا نہیں معلوم ہوتا تھا کہ ان کے بغیر تمام فیصلے ادھورے پڑے ہیں۔ دوسرے روز مولانا غزنوی تشریف لائے۔ سب حضرات ان کے استقبال کو آگے بڑھے۔ مولانا نے تاخیر سے پہنچنے پر معذرت کی۔ ان کے آتے ہی مولانا مدنی نے اپنی مسند چھوڑ دی اور مولانا سے اجلاس کی مسند صدارت پر تشریف لانے کی درخواست کی۔ یہ سارا نقشہ میری آنکھوں کے سامنے ابھی گھوم رہا ہے۔

تین روزا اجلاس جاری رہا اور تمام قراردادیں اور کارروائی مولانا لکھواتے رہے۔ مولانا حفظ الرحمن سیوہاروی جمعیت کے ناظم اعلیٰ تھے۔ وہ بار بار مولانا غزنوی کے پاس آتے اور ضروری مشورے لیتے۔ اس اجلاس میں مولانا غزنوی ایک مرکزی شخصیت تھے۔ نماز کا وقت آیا تو مولانا مدنی نے مولانا سے امامت کی درخواست کی، مگر انہوں نے مولانا مدنی ہی کی اقتداء میں نماز پڑھنے کو ترجیح دی۔

ایک ریزولوشن جس کا عنوان ہے ”دوسرا“

جمعیت علمائے ہند کے دفتر میں ایک بزرگ صوفی نذیر احمد کاشمیری قیام پذیر تھے۔ یہ اگرچہ ان دنوں جمعیت کے دفتر میں رہائش رکھتے تھے، مگر انکار و خیالات کے اعتبار سے جمعیت کے سخت مخالف تھے اور اس کا برعلا اظہار کرتے تھے۔ یہ اجلاس میں شریک نہیں ہوئے اور دروازے پر بانس کی چارپائی بچھائے بیٹھے رہے۔ شرکائے اجلاس کے سامنے جمعیت سے اشتراک کے مضمر پہلوؤں کی نشاندہی کرنا انہوں نے اپنے آپ پر یوں سمجھے کہ فرض قرار دے لیا تھا۔ انہوں نے چارپائی پر صفحات پر مشتمل ایک تحریر مولانا غزنوی کو دی اور کہا یہ ایک ریزولوشن ہے جو میں اس اجلاس میں پیش کرنا چاہتا ہوں۔ مولانا نے وہ ریزولوشن لیا، اس کی چند سطریں پڑھیں اور کھڑے ہو کر فرمایا:

”حضرات! صوفی نذیر احمد صاحب ایک ریزولوشن پیش کرنا چاہتے ہیں، جس کا

عنوان ہے ”دوسرا“

مولانا نے یہ جملہ کچھ اس انداز سے کہا کہ سب حضرات کھل کھلا کر سنبس پڑے اور مولانا مدنی بھی اپنی مناسبت و جلالتِ قدر کے باوجود ہنسی ضبط نہ کر سکے۔ صوفی صاحب بڑبڑاتے ہوئے باہر نکل گئے اور مولانا اپنی جگہ بیٹھ گئے۔

پہلا سفر اور اس کے تاثرات

اب مجھے دفتر میں رہتے اور خدمات انجام دیتے کئی مہینے گزر چکے تھے اور مولانا مجھ پر بہت نہربان تھے۔ ایک روز میرے کمرے میں تشریف لائے اور فرمایا: مولوی اسحاق! (مجھے ہمیشہ مولوی اسحاق کہہ کر بلاتے تھے) میرے ساتھ ہمارے مریدوں کے ہاں چلیں گے؟ میں نے عرض کیا۔ آپ ساتھ لے جائیں گے تو میری خوش بختی ہوگی۔ فرمایا: ”اچھا تیار ہو جائیے۔ کل پہلی ٹرین سے واربرٹن جائیں گے اور دوسرے دن وہاں سے فیروز ٹاؤن چلیں گے۔ یہ میرا ان کے ساتھ پہلا سفر تھا۔ عام طور پر بڑے آدمیوں کے ساتھ سفر ٹرینی اذیت کا باعث ثابت ہوتا ہے۔ وہ اپنے ساتھی کا کوئی خیال نہیں رکھتے اور اس کو صرف اپنا خادم سمجھتے ہیں۔ اس کی ضروریات اور کھانے پینے کا انہیں بالکل کوئی احساس نہیں ہوتا۔ ہم منڈی واربرٹن کے اسٹیشن پر ٹرین سے اترے تو بہت سے لوگ استقبال کے لیے موجود تھے۔ مولانا نے ٹرین سے اترتے ہی میرے متعلق فرمایا: ہمارے سیکرٹری صاحب کہاں ہیں؟“ پھر میری طرف مخاطب ہو کر کہا:

”آئیے مولوی اسحاق! آگے تشریف لے آئیے۔“ ان کے ان الفاظ سے استقبال کرنے والے میری طرف پکے۔ گرمیوں کا موسم تھا، رہائش گاہ پر پہنچے تو غسل کے لیے پانی رکھا گیا۔ مولانا نے فرمایا پہلے مولوی اسحاق غسل کریں گے میں بعد میں کروں گا۔ کھانے کے لیے بیٹھے تو بار بار کہتے: یہ بوٹی لیجیے۔ یہ چاول کھائیے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مین بانوں نے بھی ہر موقع پر میرا پورا خیال رکھا۔ دوسرے روز فیروز ٹاؤن سے لوگ گھوڑے لے کر آئے۔ (اس زمانے میں واربرٹن سے فیروز ٹاؤن تک سڑک تعمیر نہیں ہوئی تھی) گھوڑوں پر سوار ہونے لگے تو فرمایا: ہمارے سیکرٹری صاحب جان ہیں ان کو اچھے گھوڑے پر سوار کرائیں۔ گاؤں میں پہنچے تو وہاں بھی میرا پورا خیال رکھا۔ اس لیے وہاں کے لوگ مجھ سے اس طرح پیش آئے کہ مجھے شرم محسوس ہونے لگی۔

یہ کوئی معمولی بات نہیں اس قسم کے معاملات، سے کسی شخص کی غفلت کا اندازہ ہوتا ہے۔

عقیدت کی وجہ

فیروز ٹوٹاں میں ہمارے اصل میزبان ملک احمد نبر دار تھے۔ اب وہ خود تو فوت ہو چکے ہیں لیکن ان کے بیٹے اور خاندان کے دوسرے لوگ مولانا کے خاندان سے اسی طرح عقیدتاً احترام کے جذبات رکھتے ہیں۔ ملک احمد بڑھے آدمی تھے دراز قامت اور وجہ تھے بڑے نیک تھے۔ وہ حضرت الامام مولانا عبدالجبار غزنوی کے مرید تھے۔ دو تین روز ہی میں مجھ سے مانوس ہو گئے تھے یہیں نے باتوں باتوں میں ان سے پوچھا: آپ اس خاندان کے حلقہ ارادت میں کیسے آئے؟ انہوں نے اس کا جواب ان الفاظ میں دیا:

میں اٹھارہ سال کی عمر کا تھا مجھے کٹھیا کا مرض لاحق ہو گیا۔ والد نے بہت علاج کرائے مگر آرام نہیں آیا۔ کسی نے بتایا کہ امرتسر میں ایک بزرگ مولانا عبدالجبار غزنوی رہتے ہیں، وہ دُعا کرتے ہیں اور لوگ صحتیاب ہو جاتے ہیں۔ اس زمانے میں گھوڑی کے سوا اس گاؤں سے امرتسر جانے کا کوئی ذریعہ نہ تھا؛ چنانچہ گھوڑی کی شکل میں والد نے مجھے گھوڑی پر لادا۔ ہم امرتسر مسجد غزنویہ میں پہنچے تو فجر کی جماعت ہو رہی تھی۔ والد نے مجھے اٹھایا اور مسجد کے صحن میں رکھ دیا۔ گھوڑی باہر باندھی اور خود وضو کر کے جماعت میں شریک ہوئے جو بزرگ امامت کراہے تھے وہ اس درد و سوز سے قرآن مجید پڑھ رہے تھے کہ دل ان کی طرف کھنچا جاتا تھا۔ نماز کے بعد انہوں نے میری طرف دیکھا۔ اُدھر والد نے آگے بڑھ کر درخواست دُعا کی انہوں نے دُعا کے لیے ہاتھ اٹھائے۔ جیسے جیسے وہ دُعا مانگ رہے تھے یوں احساس ہوتا تھا جیسے میرے جوڑوں کی بندش کھل رہی ہے۔ تین دن ہم وہاں رہے اور اللہ کے فضل سے میں تندرست ہو کر واپس آیا۔ اب جسمانی حالت کے ساتھ ہماری رُوحانی دُنیا بھی بدل چکی تھی۔ اس کے بعد ہم ان کے مرید تھے اور وہ ہمارے مُرشد۔

ایک عجیب و غریب واقعہ

حضرت الامام مولانا عبدالجبار غزنوی رحمۃ اللہ علیہ کے قبولیتِ دُعا کے سلسلے کے بہت سے واقعات عوام اور ان کے عقیدت مندوں میں مشہور ہیں۔ اس ضمن کا ایک عجیب و غریب واقعہ مولانا داؤد غزنویؒ نے بھی اور ایک مدرسی بزرگ عزیز اللہ صاحب (گھڑی ساز) نے بھی بیان کیا۔

عزیز اللہ صاحب ۱۹۵۸ء میں اپنے عزیزوں سے ملاقات کے لیے مدراس سے کراچی آئے۔ کراچی سے لاہور آئے۔ اس سفر کا مقصد محض مولانا داؤد غزنویؒ اور ارکانِ جماعت سے ملاقات تھا۔ وہ الاعتصام کے خریدار تھے۔ سیدھے دفتر میں آئے، اپنا نام اور پتہ بتایا۔ میں ان کے نام سے واقف تھا۔ بحیثیت مدیر الاعتصام وہ مجھ سے آشنا تھے۔ میں ان کو اعزاز سے بٹھایا اور مدرسی ہونے کی وجہ سے کھانے کے لیے مچھلی پیش کی۔ مولانا اس روز لاہور سے باہر تشریف لے گئے تھے۔ میں نے مولانا کے ساتھ ان کی عقیدت کی وجہ پوچھی، انہوں نے بتایا کہ ایک عرصہ ہوا مدراس سے دو آدمی چڑے کی تجارت کے لیے امرتسر آئے ان کے ساتھ ایک مدرسی ملازم بھی تھا، جس کا نام اسماعیل تھا۔ اسماعیل فجر کی نماز روزانہ حضرت الامام مولانا عبدالجبار غزنویؒ کی اقتداء و امامت میں ادا کرتا۔ ایک روز انہوں نے پوچھا: ”تم کون ہو؟ کہاں کے رہنے والے ہو؟ اور یہاں کیا کام کرتے ہو؟“

اُس نے جواب دیا: میرا نام اسماعیل ہے، مدراس کا رہنے والا ہوں اور دو مدرسی سیٹھوں کے ساتھ ملازم کی حیثیت سے یہاں آیا ہوں۔ اس کی یہ بات سن کر امام صاحب نے دُعا کے لیے ہاتھ اٹھائے۔ عزیز اللہ نے اور اس کے بعد مولانا داؤد غزنویؒ نے بتایا کہ اسماعیل کہا کرتا تھا۔ امام صاحب نماز گاہ تک رہے تھے اور مجھے یوں محسوس ہو رہا تھا کہ گویا دولتِ میری جھولی میں گر رہی ہے۔ نماز و دُعا کے بعد وہ واپس گھر گیا تو سیٹھوں

نے کہا: اسماعیل، تم بہت عرصے سے ہمارے ساتھ ہو، ہم نے تم کو دیانت دار، محنتی اور امین پایا ہے۔ لہذا ہم نے آج سے تمہیں اپنے کاروبار میں شریک کر لیا ہے اور تمہارا ایک خاص حصہ مقرر کر دیا ہے۔ اپنے حصے کی رقم تم نقد ادا نہیں کرو گے، بلکہ تمہارے حصے کے منافع سے وضع ہوتی رہے گی۔ اس کے بعد چند مہینوں میں وہ اس درجہ امیر ہو گیا کہ اسماعیل سے کا کا اسماعیل بن گیا۔ کا کا مدراس کی زبان میں سچھ کو کہتے ہیں۔

کا کا اسماعیل نہایت نیک آدمی تھے۔ انہوں نے صوبہ مدراس کے ضلع ارکاٹ میں کئی ایکڑ زمین خریدی، اس کو آباد کیا اور اس کا نام محمد آباد رکھا۔ وہاں ایک بہت بڑا اسلامی دارالعلوم قائم کیا جو اب تک کامیابی سے چل رہا ہے اور ہندوستان کے مشہور اسلامی ارس میں سے ہے۔ مولانا نے بتایا کہ اس دارالعلوم کے سالانہ جلسہ تقسیم اسناد میں مجھے باقاعدہ دعوت شرکت دی جاتی تھی۔ میں جاتا تو کا کا اسماعیل اور ان کے خاندان کے لوگ انتہائی احترام سے پیش آتے اور یہ واقف ضرور بیان کرتے۔

ننگے سر نماز

ننگے سر نماز پڑھنا مولانا کو ناگوار گزرتا تھا۔ اس کی ایک مثال ملاحظہ ہو۔ ایک مرتبہ مسجد چینیاں والی میں بیٹھے تھے کہ ملک محمد رفیق جو ان کے پرانے عقیدت مند اور حلقہ مسجد چینیاں والی کے رہنے والے تھے، ان کی موجودگی میں مسجد میں آئے اور ننگے سر نماز پڑھنے لگے جب وہ نماز سے فارغ ہوئے تو ان کو بلایا اور فرمایا: ”ملک صاحب! ایک بات عرض کروں؟“ انہوں نے کہا: مولانا فرمائیے۔ کیا ارشاد ہے؟“ کہا: ”ننگے سر نماز نہ پڑھا کریں۔“

جمع تقدیم اور جمع تاخیر

نماز میں جمع تقدیم کے بھی وہ قائل نہ تھے۔ ان کا نقطہ نظر یہ تھا اور اس پر انہیں اصرار

تھا کہ جس نماز کا وقت نہیں ہوا، وہ کیوں پڑھی جائے۔ اس سلسلے کا ایک اقد قابل ذکر ہے : ایک مرتبہ تنظیم جماعت کے ضمن میں مولانا غزنویؒ، مولانا محمد اسماعیل مرحوم اور مولانا عطاء اللہ حنیف ضلع لاہور کے ایک قصبے موضع کھڑیاں گئے۔ میں بھی ساتھ تھا۔ نماز جمعہ وہاں پڑھی اور علاقے کے لوگوں کو خطاب کیا۔ وہاں سے چلے تو قصور پہنچے اور نماز مغرب تصور کی مسجد اہل حدیث میں ادا کی۔ فرض پڑھنے کے بعد مولانا غزنویؒ تو حسب معمول وظیفے میں مشغول ہو گئے اور مولانا محمد اسماعیل مرحوم نے عشاء کی نماز پڑھنا شروع کر دی۔ وظیفے کے بعد مولانا نے مولانا محمد اسماعیل صاحب سے پوچھا: ”یہ آپ نے مغرب کی نماز کے بعد کیا پڑھا ہے؟“ کہا: ”نماز عشاء“ فرمایا: ”کیوں؟“ کہا: ”مغرب کے ساتھ عشاء جمع کر لی ہے۔“

فرمایا: عشاء کا وقت تو ابھی نہیں ہوا۔ آپ نے قبل از وقت نماز کیوں پڑھی؟ لیکن مولانا اسماعیل صاحب ان کا اس درجہ احترام کرتے تھے کہ بجائے اپنے حق میں دلائل دینے کے خاموش ہو گئے۔

آداب اکل و شرب

آپ آداب اکل و شرب کے بھی بہت پابند تھے۔ فرمایا کرتے تھے کھانے پینے کے کچھ خاص آداب ہیں ان کو ملحوظ رکھنا ضروری ہے مثلاً چلتے پھرتے کھانا یا راستے میں کھڑے ہو کر کھانا سحت معیوب ہے۔ جو لوگ راستہ چلتے کھاتے ہیں شرعی لحاظ سے ان کی شہادت قبول نہیں۔ کیونکہ یہ غیر مذہب اور غیر ثقہ حرکت کا ارتکاب کرتے ہیں۔ اگر اپنے تعلق والے کسی شخص کو راستے میں ریڑھی یا دوکان پر کھڑا کھاتے ہوئے دیکھتے، تو اس کو سختی سے دیکھ دیتے اور صاف الفاظ میں کہتے:

”یہ حرکت تہذیب و ثقاہت اور متانت و سنجیدگی کے منافی ہے۔ یہ معقول آدمیوں کا شیوہ نہیں۔“

عمدہ لباس

بہترین لباس زیب تن کرتے اور نہایت صاف سُتھرے رہتے۔ مینگ میں بالخصوص عمدہ کپڑوں میں شریک ہوتے مجلس میں بعض حضرات تہبند باندھ کر آتے تو انہیں سخت ناگوار گزرتا۔ بعض دفعہ گرمیوں کے دنوں میں مولانا محمد اسماعیل مرحوم تہبند باندھ کر تشریف لاتے تو خاموش نہ رہ سکتے۔ ایک دن جمعیتہ اہل حدیث کی مجلسِ عالمہ میں مولانا محمد اسماعیل مرحوم تہبند باندھ کر شریک ہوئے۔ مولانا محی الدین احمد قصوری نے کہا:

”جناب صدر! اپنے ناظمِ اعلیٰ سے باپردہ لباس کی وضاحت فرمائیے۔“

مولانا نے مولانا محمد اسماعیلؒ کی طرف دیکھا اور فرمایا:

”میں بختیخت امیر حکم دیتا ہوں کہ آئندہ کوئی رُکن مجلس تہبند باندھ کر نہ آئیں شلوار پہن کر مینگ میں شریک ہوں۔ بالخصوص ناظمِ اعلیٰ صاحب کو معلوم ہونا چاہیے کہ ستر لباس شلوار ہے تہبند نہیں۔“

ائمہ کرام کا احترام

ائمہ کرام کا ان کے دل میں انتہائی احترام تھا۔ حضرت امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کا ایم گرامی بے حد عزت سے لیتے۔ ایک دن میں ان کی خدمت میں حاضر تھا کہ جماعت، اہل حدیث کی تنظیم سے متعلق گفتگو شروع ہوئی۔ بڑے دردناک لہجے میں فرمایا:

”مولوی اسحاق! جماعت اہل حدیث کو حضرت امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کی رُحانی بددعا لے کر بیٹھ گئی ہے۔ ہر شخص ابو حنیفہؒ ابو حنیفہ کہہ رہا ہے۔ کوئی بہت ہی عزت کرتا ہے تو امام ابو حنیفہؒ کہہ دیتا ہے۔ پھر ان کے بارے میں ان کی تحقیق یہ ہے کہ وہ تین حدیثیں جانتے تھے یا زیادہ سے زیادہ گیارہ۔ اگر کوئی بہت بڑا احسان کرے تو وہ انہیں سترہ حدیثوں کے عالم گردانتا ہے۔ جو لوگ اتنے حلیل القدر امام کے بارے میں یقوتاً نظر

رکتے ہوں، اُن میں اتحاد و یک جہتی کیوں کر پیدا ہو سکتی ہے۔ باغریبۃ العلوہ
انما اشکوا بئس و حزنی الی اللہ۔

لوگوں کے کام

مولانا کے پاس بڑے چھوٹے امیر و غریب اور دیہاتی و شہری بے شمار لوگ آتے
اور مختلف کاموں کی تفصیلات بتاتے۔ کسی کو وزیر سے، کسی کو سیکرٹری سے، کسی کو کمشنر
اور ڈپٹی کمشنر سے، کسی کو پولیس سے، کسی کو محالیات کے افسروں سے، کسی کو ہسپتال سے
کسی کو کالجوں اور سکولوں سے، کسی کو یونیورسٹی سے۔ غرض لوگ بہت سی ضرورتیں لے کر
حاضر ہوتے اور مولانا ہر ایک کے کام کے لیے کوشش کرتے۔ اس سلسلے میں ٹیلیفون پر
بھی متعلقہ آدمی سے رابطہ پیدا کرتے اور بعض دفعہ خود بھی تشریف لے جاتے۔ جس شخص سے کسی
کے کام کے لیے کتنے پورے زور سے کہتے اور اس کا باقاعدہ تعارف کراتے۔ اگر کام جماعت
کے کسی رکن کا ہوتا تو فرماتے یہ ہماری جماعت کے آدمی ہیں اور فلاں جگہ کے رہنے والے
ہیں۔ ان کا کام ضرور ہونا چاہیے۔ طالب علم کا کام ہوتا تو اس کا تعارف کرنے سے بھی
کوئی تکلف نہ محسوس فرماتے:

”یہ ہمارے مدرسے کا طالب علم ہے۔ یہ بہت پریشان ہے اس کے کام سے آپ
کو اور ہمیں اللہ اجردے گا۔ اگر کسی دیہاتی اور غریب آدمی کے کام کے لیے جاتے تو تعارف
کا انداز یہ ہوتا:

”یہ غریب آدمی ہے اور گاؤں کے رہنے والے ہیں۔ اللہ سے ڈر جائیے۔ ان کا کام
یکجیے۔ بڑے آدمی رُوپے پیسے اور ذاتی اثر و رسوخ کے زور سے کام کرا لیتے ہیں۔ ان
کے پاس نہ رُوپے ہیں نہ اثر و رسوخ۔ ان کے کام کا تعلق اللہ کی رضا مندی سے ہے۔
اللہ اس سے خوش ہوگا۔“

بہر حال ہر ضرورت مند کے کام آتے، ہر شخص کو ہر وقت ملتے، اس کی بات غور سے سنتے اور بڑے سے بڑے آدمی سے بھی کام ہوتا تو اس کو کہنے سے انکار نہ کرتے بلکہ کسی کے کام سے ان کو تلبی راحت ہوتی۔

علمائے کرام کی تشریح

مولانا کی بنیاد پر خصوصیات میں سے ایک خصوصیت یہ تھی کہ علمائے کرام کی بڑی تشریح کرتے اور ان کا نام ادب و احترام سے لیتے۔ "الاعتصام میں اخلاقی اور مسلکی مضامین کی اشاعت کے سلسلے میں تاکید فرماتے کہ اسلوب تحریر مثبت ہونا چاہیے کسی کی مخالفت خدمت دین نہیں ہے۔ اگر کسی صاحب علم کے فکری رجحانات سے عدم اتفاق کا اظہار ضروری ہو، تو اس کا نام عزت و احترام سے لیا جائے اور اس کی ذات کو بدفہم و تنقید نہ بنا جا جائے، بلکہ دائرہ بحث فقط اصل مسئلے تک محدود رکھا جائے۔"

اپنی اسی خوبی کی بنا پر ان کو علماء کے تمام حلقوں اور فقہی مکاتب فکر میں مقبولیت و محبوبیت حاصل تھی۔

"کشف قبور"

ان کے رجحانات تصوف اور میلانات فقہیہ کے بارے میں ان کے احساسات کس درجہ نازک تھے، اس کا اندازہ اس واقعے سے کیجیے کہ ایک مرتبہ حضرت مولانا احمد علی مرحوم نے مجلس ذکر میں کشف قبور کے متعلق کچھ تجربات و مشاہدات بیان فرمائے اور کہا کہ قبر میں مہینہ جن حالات سے دوچار ہو، اس کا انہیں مشاہدہ ہو جاتا ہے۔ یہیں نے "الاعتصام" میں اس پر ایک نثر لکھا اور نہایت ادب سے نثری نقطہ نظر کی روشنی میں چند سطور میں مولانا کے نقطہ نظر سے اظہار اختلاف کیا۔

اس سے تیسرے یا چوتھے روز بعد مولانا نے فرمایا :
 ” ایڈیٹر صاحب! میں نے مولانا احمد علی صاحب کے کشفِ قبر کے بارے میں
 آپ کا ادارتی نوٹ پڑھا۔ آپ یہ فرمائیے اگر مولانا احمد علی صاحب اتنے نیک ہو جائیں
 کہ انہیں کشفِ قبر ہونے لگے تو آپ کو کیا اعتراض ہے؟“
 ان چند الفاظ سے میرا مسئلہ حل ہو چکا تھا اور میرے پاس سوائے اس کے کوئی جواب
 نہ تھا کہ بلا تامل عرض کر دوں۔ کوئی اعتراض نہیں ہے۔“

اعترافِ علمیت میں فراخ دلی

کوئی صاحبِ علم اگرچہ نیکو عقیدہ کے اعتبار سے ان کا مخالف ہی ہو مگر وہ اس کی
 گلے دل سے تعریف کرنے۔ اس ضمن کا ایک واقعہ لائقِ تذکرہ ہے۔
 مئی ۱۹۵۶ء کی بات ہے، پنجاب یونیورسٹی کے ڈاکٹر مولوی محمد شفیع مرحوم نے یونیورسٹی
 کی طرف سے چند اہل علم پر مشتمل ایک کمیٹی مقرر کی جس کے ذمے علمی و تاریخی نوعیت کے
 اہم اور مشکل مسائل تو موضوعِ فکر ٹھہرانا اور ان کی عقدہ کشائی کرنا تھا۔ اس کمیٹی کے رکن مولانا
 سید داؤد غزنوی بھی تھے اور ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم مرحوم، ڈائریکٹر ادارہ ثقافتِ اسلامیہ
 لاہور بھی۔ اس کمیٹی کے تقریر سے کچھ روز پیشتر پنجاب اسمبلی میں مولانا نے خلیفہ صاحبِ ہوم
 پر سخت اعتراضات کیے تھے اور ان کے افکار و رجحانات کو بدفہم تنقید بنایا تھا۔ یہ تقریر
 اخبارات میں نتائجِ ہوائی تو خلیفہ صاحبِ ہوم کو بہ سخت ناگوار گزری تھی۔
 خلیفہ صاحب، مولانا کو صرف ایک سیاسی شخصیت سمجھتے تھے اور ان کے علم و فضل
 سے واقف نہ تھے۔ ادھر مولانا بھی خلیفہ صاحب کے بارے میں اچھی رائے نہ رکھتے تھے
 اور ان کو ذی علم شخص نہ مانتے تھے، لیکن جب اس کمیٹی کی پہلی میٹنگ ہوئی اور دونوں کے
 درمیان بعض علمی مباحثہ میں پنچہ آزمائی کی نسبت پہنچی تو دونوں ایک دوسرے کے مداح

اور علمیت کے معترف ہو گئے۔ ایک بچے دو پہر کا عمل تھا۔ میں دارالعلوم تقویۃ الاسلام کے بڑے دروازے میں کھڑا تھا کہ سامنے سیاہ رنگ کی موٹر کار آ کر رُکی۔ اسے سُرخ و سفید رنگ اور مضبوط جسم کے ایک صاحب چلا رہے تھے، جنہوں نے سوٹ پہن رکھا تھا۔ مولانا فرنٹ سیٹ پر تشریف فرما تھے۔ وہ صاحب جلدی سے موٹر کار سے نیچے اُترے۔ مولانا کی طرف سے کھڑکی کھولی اور نہایت ادب سے انہیں اُتارا۔ دروازے تک چھوڑنے آئے اور پھر پورے احترام سے سلام کر کے موٹر میں بیٹھے اور چلے گئے۔ مولانا مجھے اپنے کمرے میں لے گئے اور فرمایا:

”معلوم ہے یہ کون تھے؟“

عرض کیا: ”جی نہیں۔“

فرمایا: یہ خلیفہ عبدالحکیم تھے۔ میں نے تو آج پہلی مرتبہ ان کو کسی علمی و تحقیقی مجلس میں بحث و مذاکرہ میں حصہ لیتے دیکھا ہے۔ یہ تو بہت معلومات کے حامل ہیں اور ان کا دائرہ علم بڑا وسیع ہے۔“

اسی طرح شام کی ملاقات میں مولانا محمد حنیف ندوی نے بتایا کہ خلیفہ صاحب، مولانا داؤد غزنوی کی علمی رسائی، درک مسائل اور وسعت مطالعہ میں رطب اللسان ہیں اور افسوس کرتے ہیں کہ وہ اب ننگان سے علمی استفادہ سے محروم رہے۔

مولانا ابوالکلام سے تعلقات

مولانا داؤد غزنویؒ، مولانا ابوالکلام سے بڑے گہرے اور مخلصانہ مراسم رکھتے تھے اس کا اظہار وہ کسی نہ کسی انداز سے اکثر کیا کرتے تھے۔ ۱۹۵۱ء کے صوبائی انتخاب میں مسلم لیگ اور عوامی لیگ کے درمیان سخت مقابلہ تھا۔ حسین شہید سہروردی، مولانا داؤد غزنوی، امیاں علیاوری اور ذاب افتخار حسین خاں آف ممدوٹ پنجاب میں عوامی لیگ کے سرگرم رہنما تھے اور صوبہ

سرحد میں پر صاحب نام کی پیش پیش تھے۔ مولانا داؤد غزنوی حلقہ تحصیل چوئیاں کی مہاجر سٹیٹ سے صوبائی اسمبلی کے لیے انتخاب لڑ رہے تھے۔ اس اثنا میں مجھے مولانا کے ساتھ سفر کرنے، ان کو قریب سے دیکھنے اور مختلف لوگوں سے ملنے کا موقع ملا۔

ایک دن ہم دونوں باتوں میں جو مصروف ہوئے، تو رات کے دو بج گئے۔ اثنائے گفتگو میں میں نے ان کی گزشتہ سیاسی سرگرمیوں کے بارے میں سوالات کرنے شروع کر دیے۔ مجلس احرار کو چھوڑ کر کانگریس میں اور پھر کانگریس سے مسلم لیگ میں آنے کی وجہ پوچھی۔ مولانا بہت موڈ میں تھے۔ کہنے لگے :

”تقناً عرصہ میں مجلس احرار میں رہا، ذہنی طور پر بہت پریشان رہا کیونکہ مجلس احرار نہ پوری طرح کانگریس کی موید تھی نہ مسلم لیگ کی۔ کانگریس سے بھی اس کو کچھ شکایات تھیں اور مسلم لیگ سے بھی جس کا نتیجہ یہ تھا کہ نہ کانگریس والے اس پر اعتماد کرتے تھے اور نہ مسلم لیگ والے۔ میں اس صورتِ حال سے پریشان تھا۔ میں ذہنی طور سے کانگریس کی طرف مائل تھا۔ میرے لیے سیاسی اعتبار سے وہ دور بڑا کٹھن تھا۔ اور میری کیفیت کا بیوت فیہا ولا یحییٰ کی سی تھی اور میں اپنے رفقاء احرار سے اکثر یہ تذکرہ کرتا تھا۔ بالآخر میں نے احرار سے نکل کر کانگریس میں شمولیت کا فیصلہ کر لیا۔“

کانگریس سے وہ ۱۹۴۶ء میں الگ ہوئے۔ اس سلسلے میں بڑی تفصیلات بیان کیں جو مجھے اب بھی یاد ہیں۔ انہوں نے یہ بھی بتایا کہ میں کانگریس کو چھوڑ کر مسلم لیگ میں شامل ہونے کے بعد پہلی دفعہ دہلی میں مولانا ابوالکلام سے ملنے گیا، تو ان کے چہرے اور اندازِ ملاقات سے صاف معلوم ہو رہا تھا کہ وہ مجھ سے ناراض ہیں۔ انہوں نے ہمارے ملاقات ہاتھ بڑھایا، مگر اس میں وہ پہلے کا سا معاملہ نہ تھا۔ پھر عام ملاقاتیوں کے کمرے میں ملاقات کی حالانکہ اس سے پہلے وہ اپنے خاص کمرے میں لے جا کر مجھ سے کئی قسم کی سیاسی اور علمی باتیں کیا کرتے، نئی کتابوں کا تذکرہ ہوتا، مگر یہ ملاقات ان سب چیزوں سے خالی تھی۔

میں دوسرا رضی سمجھ رہا تھا۔ لہذا چند منٹ بعد رخصت، لے کر چلا گیا۔ گھر جا کر میں نے پہلا کام یہ کیا کہ ان کو ایک مفصل خط لکھا جس میں کانگریس سے نکلنے اور مسلم لیگ میں شامل ہونے کی وجوہ بیان کیں۔ اس لیے کہ خود میں بھی مولانا کے اس تعض سے بہت متاثر اور پریشان تھا۔ یہ خط میں نے ملازم کے ہاتھ مولانا کو بھیجا اور دوسرے دن آنے کا وقت بھی اس میں لکھ دیا؛ چنانچہ وقت مقررہ پر دوسرے روز گیا، تو پہلے کی طرح تپاک سے ملے۔ بہت خوش ہوئے اور مختلف عنوانات پر باتیں کیں۔ سیاسیات سے متعلق خود انہوں نے کوئی بات نہیں کی۔ میں نے کچھ کسنا چاہا، تو فرمایا:

”اگر آپ مجھ سے مشورہ کر لیتے تو میں آپ کو کانگریس سے مستعفی ہونے اور مسلم لیگ میں شامل ہونے کا ایسا ذریعہ بتاتا کہ جس سے کسی کو کوئی گلہ نہ ہوتا۔“

پھر فرمایا: ”میں نے کانگریس کو چھوڑ کر جو سب سے بڑی قربانی دی، وہ مولانا ابوالکلام سے قطع تعلق ہے اور مجھے اس کا بہت احساس ہے۔ ساتھ ہی کہا: ”سیاسیات میں کوئی نئی قطع نہیں ہے۔ یہ جامد نہیں ہے کہ اپنی جگہ سے ہل نہ سکتی ہو۔ اس میں حالات کے مطابق تغیر و تبدل ہوتا رہتا ہے۔“

مولانا ابوالکلام کے علم و فضل، کتابوں سے بے پناہ دلچسپی اور کثرت مطالعہ کے بارے میں گفتگو کرتے ہوئے ایک دن فرمایا کہ وہ کسی سلسلے میں پنجاب تشریف لاتے یا میں ان سے ملتا، تو یہ ضرور پوچھتے کہ کوئی نئی کتاب آئی ہے اور آپ کے پاس ہے۔ ایک دفعہ امرتسر ایک ٹینگ میں آئے، تو فرمایا: ”ٹینگ سے فارغ ہو کر آپ کے کتب خانے کی سیر کرنے کا خیال ہے۔“ چنانچہ میرے مکان پر گئے اور کتب خانہ دیکھ کر بہت خوش ہوئے اور ان کی جلد بندی اور ترتیب پر دل کھول کر داد دی۔

مولانا غزنوی نے فقہ حنبلی سے متعلق ایک کتاب کا نام لیا، جو میرے ذہن میں نہیں رہا کہ وہ پورے ہندوستان میں کسی کے پاس نہ تھی اور چند روز پیشتر میں نے مہرے

لے یہ کتاب طبقات الحنابلہ تھی۔ (درتب)

ٹھکانی تھی۔ مولانا نے دیکھی، تو اسے الگ کر لیا، بہت خوش ہوئے اور کہا اسے ساتھ لے جانا چاہتا ہوں۔ چند روز میں واپس آجائے گی۔

مولانا آزاد کے بارے میں ان کا سلسلہ کلام عام طور پر طویل بلکہ طویل تر ہو جاتا تھا۔ ۱۹۵۷ء میں ہندوستان گئے، تو واپس آ کر بتایا کہ پارلیمنٹ کا اجلاس ہو رہا تھا۔ میں پارلیمنٹ ہال میں پہنچ گیا۔ مولانا کو اطلاع بھجوائی تو کارروائی چھوڑ کر باہر آئے، بڑی شفقت اور محبت سے ملے، اپنے کمرے میں لے گئے اور دیننگ گفتگو ہوتی رہی۔ ۲۲ فروری ۱۹۵۸ء کو مولانا ابوالکلام کی خبر وفات پہنچی تو بہت مغموم ہوئے۔ "الاعتصام" میں خود ایک مضمون لکھا، غائبانہ نماز جنازہ پڑھائی اور بہت حزن و ملال کا اظہار کیا۔

”داؤد غزنوی اور محمود غزنوی“

ستمبر ۱۹۴۵ء میں جنگِ عظیم ختم ہوئی اور حکومتِ برطانیہ نے آزادی ملک کے سلسلے میں مختلف سیاسی جماعتوں سے بات چیت شروع کی اور پھر عام انتخابات کے لیے سرگرمیوں کا آغاز ہوا۔ یہ دور ملکی سیاسیات میں بڑا ہنگامہ خیز تھا۔ آل انڈیا کانگریس کے صدر مولانا ابوالکلام تھے اور پنجاب کانگریس کے صدر مولانا داؤد غزنوی۔ اور دونوں ظاہر ہے بڑے زوردار لیڈر تھے۔ مجھے یاد ہے، اکالی دل کے لیڈر ماسٹر نارائنگھ مولانا داؤد غزنوی کے ایک بیان سے بہت جھنجھلائے اور جواب میں کہا کہ اس ملک کی کانگریس کی سیاست پر دو مولانا قاضی ہیں۔ ایک نے پورے ہندوستان کی کانگریس پر قبضہ کر رکھا ہے اور ایک نے پنجاب کی کانگریس پر پنجاب کانگریس کے صدر داؤد غزنوی، محمود غزنوی سے تعلق رکھتے ہیں جس نے پورے ہندوستان کو فتح کر لیا تھا۔ اب داؤد غزنوی نے سیاسی طور پر ہندو سکھ سب کو اپنا مطیع بنا لیا ہے۔

وسعتِ قلب

مولانا غزنوی کی عظیم خصوصیت، یہ تھی کہ ان کا ظرف بہت وسیع تھا۔ انتہائی وسعتِ قلب

کے مالک تھے اور ایک خاص مسکِ فقہ کے پابند ہونے کے باوجود تعصبات سے اُن کا دل بالکل صاف تھا۔ اس کا اندازہ اس سے لگائیے کہ حضرت مولانا احمد علی صاحب رحمۃ اللہ علیہ عیدین کی نماز ہمیشہ ان کی اقتدا میں ادا فرماتے حالانکہ خود اُن کا حلقہ بہت وسیع تھا۔ پھر نہ صرف مولانا غزنویؒ کی موجودگی میں بلکہ ان کی غیر حاضری اور زمانہ اسارت میں بھی انہوں نے اپنے پورے حلقہ ارادت کے ساتھ منٹو پارک میں عیدین کی نماز پڑھی اور صفِ اول میں بیٹھے۔

مولانا احمد علیؒ سے ان کے تعلقات بہت گہرے تھے اور یہ دونوں بزرگ ایک دوسرے کی انتہائی تحکیم کرنے میں تھے کہ معاملات اور اسلام اور مسلمانوں کے عام مفاد کا کوئی مسئلہ سامنے آتا، تو مولانا غزنویؒ یا تو خود ان کی خدمت میں تشریف لے جاتے یا ٹیلیفون پر رابطہ پیدا کرتے۔ مولانا احمد علیؒ مرحوم کی وفات کی اطلاع ملی تو مولانا نے نہایت حزن و ملال کا اظہار کیا اور فرمایا آج دین کا ایک ستون گر گیا ہے اور میرے قریبی رفقاء میں ایسا خلا پیدا ہو گیا ہے جو کبھی پُر نہیں ہو سکے گا۔ ساتھ ہی فرمایا: اب ہم بھی چند روز کے مہمان ہیں اور آہستہ آہستہ یہ دور ختم ہو جائے گا۔

مولانا احمد علیؒ کے جنازے پر آئے تو یہ عاجزان کے ہمراہ تھا۔ راستے میں انہی کی زندگی کے واقعات بیان کر کے روتے رہے۔

مولانا مفتی محمد حسنؒ

حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ کے مکتب سے متعلق حضرات سے بھی ان کے بہت مراسم تھے بالخصوص مولانا تھانویؒ کے خلیفہ خاص مولانا مفتی محمد حسن مرحوم سے قلبی لگاؤ تھا۔ مفتی صاحب مرحوم ایک ٹانگ سے معذور تھے اس لیے ان کو گھر سے باہر نکلنے میں مشکل پیش آتی تھی، لیکن وہ اپنی اس معذوری کے باوجود مولانا کے پاس آتے اور دونوں کے درمیان خاصی دیر نصرت اور دیگر مسائل پر سلسلہ گفتگو جاری رہتا۔

مولانا تو نمازِ عصر کے بعد ہفتے عشرے میں ایک دو مرتبہ بالعموم ان کے ہاں تشریف لے جاتے۔ مفتی صاحب کا بھی اصل موضوع تصوف تھا اور مولانا کا بھی۔ یہ دونوں بزرگ اکثر اسی موضوع سے متعلق گفتگو فرماتے تھے۔

مولانا سید ابوالحیات مرحوم

مولانا سید ابوالحیات مرحوم بریلوی مکتب فکر سے تعلق رکھتے تھے، لیکن جہاں تک مجھے معلوم ہے مسلکی تعصبات سے ان کا دل صاف تھا۔ تحریکِ ختم نبوت کے زمانے میں مولانا کی وساطت سے ان کو کسی حد تک قریب سے دیکھنے کا موقع ملا۔ نماز کا وقت آنا، تو مولانا ان سے امامت کے لیے اصرار کرنے اور وہ مولانا سے۔

مجھے کئی دفعہ مولانا کے پیغام بر کی حیثیت سے ان کی خدمت میں حاضر ہونے کا موقع ملا۔ وہ ان کا ذکر بہترین الفاظ سے کرتے۔

مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی

بہت سے مسائل کی تعبیر میں اختلاف رائے کے باوجود مولانا غزنویؒ، مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی کا احترام کرتے اور مجموعی اعتبار سے ان کی خدمات کو سراہتے اور قدر کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔ خود مولانا مودودی مشرکہ اسلامی معاملات میں ان سے مشورہ کرتے اور ان کی رائے کو اہمیت دیتے۔ ایک معاملہ تو ایسا پیش آیا کہ مولانا غزنویؒ بار بار اس کا ذکر کرتے اور مولانا مودودی کو دُعا دیتے تھے۔ وہ یہ کہ ۱۹۶۲ء میں حج کے موقع پر شاہ سوہد مرحوم نے مہینہ یونیورسٹی کے زیرِ ترتیب نصاب اور ضروری امور میں مشوروں کے لیے مختلف ممالک کے اہل علم کو دعوت دی جس میں پاکستان سے مولانا داؤد غزنویؒ اور مولانا ابوالاعلیٰ مودودی کو دعوتِ شرکت دی گئی تھی۔ مدینہ منورہ میں ان کے قیام کا انتظام ایک ہوٹل میں کیا گیا تھا۔

مولانا غزنویؒ کی بڑی صاحبِ زادی بھی ساتھ تھیں۔ ایک دن مولانا کو دل کا دورہ پڑ گیا اور تکلیف بہت زیادہ ہو گئی۔ ان کی صاحبِ زادی سخت پریشان ہوئیں کیونکہ ڈاکٹر کو بلانا ان کے لیے مشکل تھا۔ مولانا مودودی کو معلوم ہوا تو فوراً تشریف لائے اور ڈاکٹر کو بلایا۔ دیکھنے لانا کے پاس بیٹھے رہے۔ لڑکی کو تسلی دی، ضروری دوائیں منگوائیں اور کئی بار مولانا کے پاس آئے۔ واپس آئے تو یہ واقعہ پوری تفصیل سے مولانا نے مختلف مواقع پر کئی بار بیان فرمایا اور ہر دفعہ مولانا مودودی کا ذکر احترام سے کیا اور ان کے لیے دُعاؤں خیر کی۔

لکھوی خاندان سے تعلقات

لکھوی اور غزنوی خاندان پنجاب کے دو مشہور خاندان ہیں۔ اہلِ حدیث کے علاوہ دوسرے مسالک سے منسلک لوگ بھی ان سے متاثر اور ان کے حلقہٴ ارادت میں شامل ہیں۔ ان دو خاندانوں کے اہلِ علم بھی آپس میں بہت ربط و تعلق اور انس و محبت رکھتے ہیں۔ اور یہ سلسلہ روابط بہت عرصے سے قائم ہے۔ غزنوی خاندان کے بزرگ افغانستان سے تشریف لائے تھے اور لکھوی بزرگ ضلع فیروز پور (مشرقی پنجاب) کے ایک گاؤں لکھو کے سے تعلق رکھتے تھے۔ ان دو عظیم خاندانوں کے درمیان باہم کس طرح تعارف کی راہیں کھلیں اور پھر یہ تعارف کیونکر گہرے روابط کے قالب میں ڈھلا، اس کی تفصیل مولانا داؤد غزنویؒ نے راقم الحروف کو ایک سے زائد مرتبہ سنائی اور ہر مرتبہ یہی فرمایا کہ ہم دونوں لکھوی اور غزنوی خاندان، ایک دوسرے سے بہت ہی قریب ہیں اور ہمارے تعلقات کی بنیاد خالص دینی اور مسلکی ہے

مولانا نے بتایا کہ حضرت حافظ محمد لکھوی رحمۃ اللہ علیہ پنجاب کے بہت بڑے عالم دین بھی تھے اور انتہا درجہ کے نیک اور متقی بھی۔ ان کے ہاں اولادِ زینت تھی۔ انہوں نے اللہ سے دُعا مانگی اور عہد کیا کہ اگر اللہ تعالیٰ انہیں لڑکا عطا فرمائے تو وہ اس کو اللہ کی راہ

میں وقف کر دیں گے۔ اُس سے دُنیا کا کوئی کام نہ لیں گے۔ ان کی دُعا قبول ہوئی، اللہ نے ان کو لڑکا عطا فرمایا۔ اس کا نام اُنہوں نے محی الدین رکھا اور اللہ کی راہ میں وقف کر دیا۔ یہ لڑکا بہت نیک اور پرہیزگار تھا۔ اپنے اس لڑکے کی تعلیم و تربیت کا حافظ محمد صاحب مرحوم نے خاص طور سے اہتمام کیا۔ جب یہ بڑے ہوئے، تو معلوم ہوا کہ غزنی میں ایک بزرگ رہتے ہیں جن کا نام عبد اللہ ہے۔ یہ بزرگ نیکی و تدبیر میں مرجح خلالت ہیں اور سب وقت دعوت و ارشاد میں مصروف رہتے ہیں۔ حضرت حافظ صاحب مرحوم نے اپنے بیٹے مولانا محی الدین رحمۃ اللہ علیہ کو لکھو کے سے حضرت عبد اللہ غزنویؒ کی خدمت میں غزنی روانہ کر دیا۔ مولانا یہ واقعہ بیان کرتے ہوئے اس مقام پر پہنچے تو بات میں زور پیدا کر کے فرماتے:

”اندازہ لگائیے، حافظ محمد صاحب نے مولانا محی الدین کو اس زمانے میں یعنی آج سے تقریباً ایک صدی پیشتر فیروز پور سے غزنی تک کے لیے سو روپے زادِ راہ دیا۔ سو روپے کے لفظ پر خصوصیت سے زور دیتے اور ساتھ ہی آنکھوں میں آنسو آجاتے۔

سلسلہ کلام جاری رکھتے ہوئے فرماتے کہ مولانا محی الدین اتنے نیک تھے کہ جب وہ غزنی کے قریب پہنچے تو دادا صاحب کو اللہ کی طرف سے بذریعہ الامام معلوم ہو گیا کہ ایک بزرگ طلاقات کے لیے آرہے ہیں؛ چنانچہ وہ ان کے استقبال کے لیے گھر سے باہر نکلے اور جاتے ہوئے گھر میں کہہ گئے کہ پنجاب سے ایک بزرگ آرہے ہیں، ان کے لیے کھانا تیار کرو اور اچھا کھانا تیار کرو (یہ لفظ بھی وہ دو تین بار کہتے) پھر بنس کر کہتے: — ”اچھا کھانا کیا ہوگا جلوا پکانے کو کہا ہوگا۔“

مولانا کہا کرتے تھے کہ مولانا محی الدین دُور سے آتے دکھائی دیئے، تو دادا صاحب خترم سے ان کی طرف بڑھے، انہیں گھر لائے، خیر نصرت پوچھی، کھانا کھلایا اور باتیں کیں۔ ان سے نام پوچھا، تو جواب دیا: ”میرا نام محی الدین ہے۔“ فرمایا: ”اپنا نام عبد الرحمن رکھ بیجیے، میرا نام محمد اعظم تھا۔ اس میں عظمت اور بڑائی پائی جاتی ہے، اس لیے میں نے اپنا نام عبد اللہ

رکھ لیا ہے۔ عبداللہ اور عبدالرحمن میں اللہ کے حضور عجز و انکسار پایا جاتا ہے، اسی لیے یہ دونوں نام اللہ کو محبوب ہیں۔ معلوم نہیں آپ اسیائے دین کرتے ہیں یا نہیں، مگر رحمن کے بچا ہونے میں تو کوئی شبہ نہیں، چنانچہ غزنویوں میں وہ محی الدین کے بجائے مولانا عبدالرحمن لکھنوی کے نام سے مشہور تھے۔ مولانا بھی یہ واقعہ ”مولانا عبدالرحمن“ کہہ کر ہی بیان فرماتے۔

یہ مولانا عبدالرحمن یا مولانا محی الدین مولانا محمد علی لکھنوی مدنی کے والد اور مولانا محی الدین اور معین الدین کے دادا تھے۔

مولانا عبدالرحمن لکھنوی غالباً دو مرتبہ غزنی گئے اور حضرت مولانا عبداللہ غزنوی کے حلقہ ارادت میں شامل ہوئے۔

اسی خاندانی تعلق کی بنا پر مولانا محمد علی لکھنوی (نزہت مدینہ منورہ) مدظلہ اور مولانا داؤد غزنوی ایک دوسرے سے بہت تعلق رکھتے تھے۔ چنانچہ ایک مرتبہ تو اس کا عملی اظہار اس طرح بھی ہوا کہ مولانا غزنوی ایک سیاسی تحریک میں گرفتار ہوئے تو مسجد چینیاں والی میں خطابت و تدبیر کے لیے مولانا نے خاص طور پر مولانا محمد علی لکھنوی کو تکلیف دی۔

اسی قدیم خاندانی تعلق کی وجہ سے مولانا داؤد غزنوی مرحوم، مولانا معین الدین لکھنوی اور ان کے بڑے بھائی مولانا محی الدین لکھنوی کو اپنے عزیز گردانتے تھے۔

دارالعلوم کے اساتذہ کرام

مولانا داؤد غزنوی جن حضرات کو خصوصیت سے عزت و احترام کی نظر سے دیکھتے ان میں دارالعلوم تقریباً اسلامیہ کے اساتذہ کرام قابل ذکر ہیں۔ مولانا محمد اسحاق صاحب، مولانا حافظ عبدالرشید صاحب اور دیگر حضرات کا عمدہ الفاظ میں ذکر کرتے۔ حافظ عبدالرشید صاحب سے توفیقی لگاؤ کا یہ عالم تھا کہ ان کو خاص طور سے بعض مضامین کی تیاری کرائی اور اس کے لیے ان کو ماہانہ وظیفہ بھی دیتے رہے۔

”کیکر کا سایہ“

مولانا میں یہ خوبی تھی کہ جس موضوع سے متعلق بات کرتے، اس کی اس انداز سے تشریح فرماتے اور اصل چیز آنکھوں کے سامنے گھومنے لگتی۔ گرمیوں کا موسم تھا۔ میں مولانا کے پاس بیٹھا تھا کہ ملاعلوم کے چند طلبا آئے۔ مولانا نے فرمایا: ”کیسے مولوی صاحبان! کس طرح تشریف لائے؟“ انہوں نے آہستگی سے کہا: ”دوبستوں کی چٹھیوں کی درخواست ہے“ فرمایا: ”کیوں؟“

کہا: ”اس لیے کہ گرمی بہت پڑ رہی ہے۔ ہم اپنے اپنے گاؤں میں جانا چاہتے ہیں؟“ فرمایا: یہاں گرمیوں کے لیے تمام انتظامات موجود ہیں۔ ٹھنڈا پانی ہے، نہانے کا انتظام ہے، بجلی کے پنکھے ہیں، کھل عمارت ہے۔ اس سے زیادہ تمہیں اور کیا چاہیے۔ طلباء نے کہا: ”دیہات کی فضا آج کل بہت اچھی ہوتی ہے۔ کھل جگہ ہے، سایہ دار درخت ہیں اور باغات ہیں۔“

مولانا نے ایک طالب علم سے پوچھا: تمہارا باغ ہے؟ کہا نہیں۔ دوسرے سے پوچھا: تمہارا باغ ہے؟ بولا نہیں۔ تیسرے سے پوچھا: تمہارا باغ ہے؟ جواب دیا: نہیں! فرمایا: تو تمہیں لوگوں کے باغوں سے کیا تعلق؟ پھر میری طرف متوجہ ہوئے فرمایا:

”مولوی اسحاق! آپ دیہات کی زندگی سے واقف ہیں۔ لوگ کھیتوں میں جا کر کیکر کے درخت کے نیچے چار پائی ڈال لیتے ہیں۔ اس سے دھوپ جھانکتی رہتی ہے، پھر جیسے جیسے سایہ بدلتا رہتا ہے۔ لوگ اپنی چار پائیاں کھینچتے جاتے ہیں۔ دس منٹ بھی آرام سے ایک جگہ نہیں بیٹھ سکتے۔ یہ کہہ کر طلباء کی طرف رخ کیا اور کہا: جاؤ آرام کرو، جا کر پڑھو۔ کوئی چٹھی نہیں۔ پڑھنے کے لیے آئے ہو یا چٹھیاں لینے کے لیے!“

ہمدردی کی ایک مثال

۲۷، ۲۸، ۲۹ مئی ۱۹۴۹ء کو جمعیت اہل حدیث مغربی پاکستان کی پہلی کانفرنس درالعلوم

دارالعلوم سے ان کے تعلق خاطر کا یہ عالم تھا کہ مختلف مضامین کے لیے بہترین سے بہترین اساتذہ کا تقرر عمل میں لاتے۔ وسعت قلب ملاحظہ ہو کہ دارالعلوم میں دو مدرس حنفی المسک تھے، ایک مولانا شریف اللہ خاں صاحب اور دوسرے مولانا محمد موسیٰ خاں صاحب۔

ایک واقعہ بالطیفہ؟

دارالعلوم کے سلسلے میں ایک لطیفہ سنیں جو ایک دن مولانا نے بڑے مزے لے لے کر بیان کیا:

جناب اے ایچ قریشی صاحب! محکمہ اوقاف کے ناظم اعلیٰ تھے۔ دارالعلوم کی عمارت کے سلسلے میں مولانا ان سے ملنے گئے تو بتایا کہ ہمارے دارالعلوم میں لاہور سے باہر کے طلباء تعلیم حاصل کرتے ہیں۔ کئی اساتذہ ان کو تفسیر، حدیث، فقہ اور دیگر علوم کی تعلیم دینے پر متعین ہیں۔ ہم دارالعلوم کی طرف سے طلباء کے لیے کتابیں، چارپائیاں، مفت رہائش، کھانا اور صابن وغیرہ مہیا کرتے ہیں۔ قریشی صاحب نے کہا، اچھا مولانا پھر آپ کے یتیم خانے میں اور کیا انتظام کیا گیا ہے۔ میں نے کہا: قریشی صاحب! ہم دارالعلوم کی طرف سے ان کی تمام ضروریات پورا کرتے ہیں اور ضروریات کی تفصیل دوبارہ بیان کی۔ قریشی صاحب نے پھر کہا اچھا اپنے اس یتیم خانے میں آپ اور کیا کچھ سہولتیں دیتے ہیں۔ میں نے کہا، حضور! میں عرض کر رہا ہوں، یہ دارالعلوم ہے لہذا ہم مختلف مقامات سے آئے ہوئے طلباء کو قرآن و حدیث وغیرہ علوم کی تعلیم دیتے ہیں اور ان کی ضروریات کی کفالت کرتے ہیں۔ قریشی صاحب نے جواب دیا۔ مولانا آپ اس کی جو تعریف کر رہے ہیں، وہ تو یتیم خانے کی ہے اور نام اس کو دارالعلوم کا دے رہے ہیں۔

مولانا نے قریشی صاحب کے ٹہاں سے آتے ہی یہ لطیفہ سنایا اور فرمایا: میں نے بڑی مشکل سے ان کو یقین دلایا کہ یہ یتیم خانہ نہیں، دارالعلوم ہے۔

نام میں احتیاط

مولانا دوسروں کا پورا نام لینے کے عادی تھے اور اس میں بہت احتیاط کرتے تھے اس کی ایک مثال قابل ذکر ہے۔ میں ۱۹۴۸ء کے آخر میں جمعیت اہل حدیث کے ناظم دفتر کی حیثیت سے لاہور آیا۔ مولانا جمعیت کے صدر تھے اور پروفیسر عبدالقیوم صاحب ناظم اعلیٰ۔ پروفیسر صاحب موصوف اس زمانے میں گورنمنٹ کالج لاہور کے شعبہ عربی میں تھے۔ ان کا اصول تھا کہ کالج سے فارغ ہو کر ڈیڑھ دو بجے روزانہ دفتر تشریف لاتے اور ضروری کاغذات دیکھتے۔ ایک روز مولانا نے مجھ سے ان کے بارے میں پوچھا تو میں نے عرض کیا: "قیوم صاحب آئے تھے خاصی دیر بیٹھے رہے ہیں۔"

مولانا نے فرمایا:

"قیوم صاحب مت کہیے۔ عبدالقیوم صاحب کہیے۔ قیوم صاحب، جی صاحب، غفار صاحب، جبار صاحب، قمار صاحب، رحمن صاحب کنا غلط ہے۔ عبدالقیوم، عبدالحی، عبدالغفار، عبدالجبار، عبدالقمار، عبدالرحمن کنا چاہیے۔ یہ وہ صفات ہیں جو صرف اللہ کے لیے مخصوص ہیں۔ البتہ آپ کریم، وکیل، حفیظ وغیرہ صفات کسی انسان کے لیے استعمال کر سکتے ہیں۔"

مولانا کا خادم خاص

مولانا باہر تشریف لے جاتے یا گھر میں قیام فرما ہوتے، ان کا ملازم اور خادم خاص محمد عربتی ان کے ساتھ ہوتا۔ مولانا اس پر بہت اعتماد کرتے تھے اور اس کی دیانت و امانت کی قدر کرتے تھے اور اُس کی اس خوبی کا بارہا ذکر کرتے۔ اس کو آواز دیتے تو ہمیشہ محمد عمر کہہ کر پکارتے۔ باہر سے جو شخص بھی مولانا سے ملنے آتا، محمد عمر سے رابطہ پیدا کرتا اور وہی مولانا سے

ملاقات کا ذریعہ بنا۔ وہ قدرے بہرہ ہے بعض دفعہ مولانا کی بات سمجھ نہ سکتا، تو زبان کے بجائے سمجھنے کے لیے آنکھ سے اشارہ کرتا۔ کوئی اور بھی موجود ہوتا، تو مولانا اس کی اس ادا پر ہنستے اور فرماتے: ”اس کو سمجھاؤ مجلس کے آداب کا تو خیال رکھتے۔ یہ بارہ سال دہلی میں رہا ہے اور بھارت جو نکتا رہا ہے۔“

محمد عمر کوئی سودا لے کر آتا، تو مولانا اگرچہ کتنے مصروف ہوں اور ان کے پاس کوئی بھی بیٹھا ہو، محمد عمر بغیر کچھ دیکھے سیدھا ان کے سامنے آکر کھڑا ہو جاتا اور کہتا:

”یہ لو اتنے پیسے بچے، پیکر لو مجھے اتنے پیسے باقی دو۔“

مولانا لاکھ سمجھاتے کہ کچھ حساب کریں گے۔ اب تم جاؤ مگر وہ ایک نہ سُنتا اور کہتا:

”پھر بھول جائیں گے، یہ لے ہی لو۔“ اس کے جانے کے بعد مولانا اس کی بڑی تعریف کرتے۔

مولانا سے ملاقات کے لیے یہ بڑے بڑوں کی پروا نہ کرتا اور لوگ اس کے محتاج ہوتے۔ کوئی مولانا کے متعلق پوچھتا تو جواب دیتا:

”مولانا صاحب ابھی نہیں آیا۔“ یا کہتا: ”ابھی آیا ہے، تھوڑی دیر بٹھرو۔“ ملاقاتی اس

کو ایک اہم شخصیت قرار دیتے اور مولانا مسکوا پڑتے۔

ایک مرتبہ عجیب و غریب واقعہ پیش آیا۔ مولانا نے محمد عمر سے کسی کام کے لیے بات کہی۔ وہ سمجھ نہ پایا اور کام نہ ہو سکا۔ کام کی نوعیت کچھ ایسی تھی کہ مولانا سخت پریشان ہوئے اور جلال میں آگئے اور محمد عمر کو ایک تھپڑ رسید کر دیا۔ محمد عمر کی آنکھوں سے آنسو نکل آئے۔ وہ مکرے سے باہر نکل گیا اور ملازمت ترک کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ مولانا نے حافظ عبدالرشید کو بلوایا وہ بڑی مشکل سے محمد عمر کو مولانا کے پاس لائے۔ مولانا بھی رو پڑے اور محمد عمر بھی رو پڑا۔ مولانا نے حافظ عبدالرشید کو سارا واقعہ سنایا اور پھر محمد عمر کی طرف منوجہ ہو کر کہا:

”لو محمد عمر میں حاضر ہوں، میں نے تم کو تھپڑ مارا یا تو تم مجھے تھپڑ مارو اور اپنا بدلہ لے لو

یا مجھے معاف کر دو مجھ سے غلطی ہو گئی ہے۔ مولانا رو رہے تھے اور بار بار یہ الفاظ دہراتے جاتے تھے۔ بہر حال بڑی مشکل سے محمد کو منانے میں کامیاب ہوئے۔ اس سے ان کی اخلاقی عظمت اور کردار کی بلندی کا اندازہ لگائیے۔

بعض دفعہ مولانا اس کو چھیڑ دیتے۔ محمد کو کوئی دلی کی بات سناؤ۔ وہ ”سنو مولانا صاحب!“ کہہ کر شروع ہو جاتا اور بات ختم ہونے میں نہ آتی۔ مولانا فرماتے:

”اچھا محمد باقی آئندہ۔ اب تم کام کرو۔ یہ داستانِ امیر حمزہ ابھی ختم نہیں ہوگی۔“

محمد عراب بھی دارالعلوم تقویتہ الاسلام کے اسی بکرے میں رہ رہا ہے۔ وہاں جانیں تو خیال ہوتا ہے، ابھی محمد عراب کہہ کر مولانا اس کو آواز دیں گے۔ وہ جواب نہیں دے گا تو فرمائیں گے: ”حقہ پی رہا ہوگا۔ اس کو سبھاؤ، مجھے پریشان نہ کیا کرے۔ بات سمجھ لیا کرے۔“

بولے بدل میری بات بھی سنو!“

”جماعتِ اہل حدیث اور جماعتِ اسلامی سوئی پڑی ہیں“

میں الاعتصام سے منسک تھا اور مولوی محی الدین سلمیٰ جماعتِ اسلامی سے تعلق رکھتے تھے اور جماعت کے ترجمان سہ روزہ ”کوثر“ میں کلام کرتے تھے۔ اس کے علاوہ دارالعلوم تقویتہ الاسلام میں تعلیم حاصل کرتے تھے اور ان کی رہائش دارالعلوم ہی میں تھی۔ گرمیوں کا موسم تھا۔ ہم لوگ باہر سوئے ہوئے تھے۔ فجر کی اذان ہوئی اور جماعت بھی ہو گئی، لیکن میں اور مولوی محی الدین نیند میں اس درجہ مستغرق تھے کہ ہمیں کچھ معلوم نہیں ہو سکا۔ نماز سے فارغ ہو کر مولانا باہر آئے، دیکھا کہ ہم سوئے پڑے ہیں۔ جگایا نہیں، فرمایا:

”جماعتِ اہل حدیث اور جماعتِ اسلامی سوئی پڑی ہیں“ یہ الفاظ بیک وقت ہم دونوں کے کانوں میں گونجے اور ہم جلدی سے اٹھ بیٹھے۔ مولانا نے اس سے آگے کچھ نہیں کہا اور اُپر چلے گئے۔

تقریباً الاسلام (لاہور) میں منعقد ہوئی۔ اس کے صدر مجلس استقبالیہ مولانا محمد ضعیف ندوی اور صدر کانفرنس مولانا حافظ محمد ابراہیم میر سیالکوٹی تھے۔ میرا تعلق جمعیتہ کی نظامتِ دفتر سے تھا۔ اس کانفرنس کے سلسلے میں مجھے بڑی بھاگ دوڑ کرنا پڑی۔ ۲۹ مئی کو کانفرنس ختم ہوئی اور ۳۰ مئی کو میں بیمار پڑ گیا اور ایک مہینہ سخت تکلیف میں مبتلا رہا۔ مولانا روزانہ میرے لیے شام کو ٹھوپل کے ہار لاتے، کئی دفعہ میری عیادت کو تشریف لاتے اور مجھے تسلی دیتے۔ طلباء کو میری خبر گیری کی تاکید فرماتے۔ مجھے یاد ہے ان کے صاحبزادہ گرامی قدر سید ابوبکر غزنوی ایک دو مرتبہ روزانہ مجھ سے پوچھتے۔ مولانا نے میری بیماری کے سلسلے میں کئی مشورہ ایجوٹیک اور یونانی مسالحوں کو بلایا اور علاج کا بہترین انتظام کیا۔ ان کی اور مولانا محمد ضعیف ندوی کی تجویز سے علاج کے تمام اخراجات مرکزی جمعیتہ نے ادا کیے۔ یہ ان کی انسانی ہمدردی کی وہ مثال ہے، جو مجھے ہمیشہ یاد رہے گی۔

”یہ کپڑا آپ کی قمیص کے لیے ہے“

مولانا عام طور پر عصر کے بعد اپنے چھوٹے بھائی حافظ سلیمان غزنوی مرحوم کی دوکان پر انارکلی بازار جاتے اور خاصی دیر وہاں بیٹھتے۔ کبھی کبھی مجھے بھی ساتھ لے جاتے۔ حافظ صاحب مرحوم کی کپڑے کی خاصی بڑی دکان تھی۔ ایک روز میں ساتھ تھا۔ مولانا نے کپڑا خریدا اور مجھ سے بھی مشورہ لیا کہ قمیصوں کے لیے یہ کپڑا کیسا رہے گا اور یہ کیسا؟ میں ٹھیک ہے ٹھیک ہے کہتا رہا۔ مولانا نے میرے لیے قمیص کا کپڑا خریدا اور فرمایا:

”یہ آپ کی قمیص کے لیے پسند ہے آپ کو؟“

میں نے انکار کیا تو بولے: ”بس خاموش رہیے۔ یہ فیصلہ ہو چکا۔“

پھر خود ہی سلائی کے لیے درزی کو دیا اور اس کی سلائی کی اجرت بھی اپنی گمرہ سے ادا کی۔

جذبہ انسانیت

وقت گزر جاتا ہے اور انسان اپنا دور ختم کر کے دُنیا سے رخصت ہو جاتا ہے لیکن اس کی بعض باتیں ایسا اثر چھوڑ جاتی ہیں جو کبھی ختم نہیں ہوتا اور وہ باتیں اس وقت زیادہ نمایاں ہو کر سطح ذہن پر ابھرتی ہیں جب اس کی مثالیں معدوم ہوتی جا رہی ہوں اور پُرانے نقشِ مٹتے جا رہے ہوں۔ یہ سطور لکھنے بیٹھا ہوں تو مولانا کی اس قسم کی بے شمار باتیں لوحِ ذہن پر ہجوم کرائی ہیں جو صرف اسی کردار کے لوگوں کے ساتھ مختص تھیں۔ اس سلسلے کی ایک بات کا ذکر کرنا چاہتا ہوں۔

دسمبر کے دن مخفی رات کے ڈیڑھ بجے میرے گاؤں سے بندر علیہ ٹیلیفون میری ایک عزیزہ کی وفات کی اطلاع آئی۔ ٹیلیفون مولانا نے سُنا۔ ٹیلیفون کرنے والے سے میرے رشتے کی نوعیت پوچھی، متوفیہ کا نام اور اس کا مجھ سے رشتہ و تعلق دریافت کیا، جنازے کا وقت پوچھا اور پھر اس سے اظہارِ افسوس کیا۔ اسی وقت نیچے اُترے، دفتر کے ملازم محمد یوسف کے مکان پر گئے۔ اس کو جگایا اور میرے گھر بھیجا۔ مجھے یاد ہے، سو موہر تھا جو الاعتصام کی ترتیب کے سلسلے میں شدید مصروفیت کا دن تھا۔ مولانا نے محمد یوسف کو میرے بارے میں تاکید کی کہ دفتر آنے کی ضرورت نہیں، صبح جلد سے جلد گاؤں پہنچیں، اخبار کا کوئی فکڑ نہ کریں، سارا کام ہو جائے گا اور پھر وہاں سے آج ہی لوٹنے کی ضرورت نہیں، انسان کی موت کا معاملہ ہے، دو چار روز ٹھہر کر آئیں۔ آہ! اس قسم کے جذبہ انسانیت کے حامل لوگ اب کہاں پیدا ہوں گے۔

اس قسم کا ایک اور واقعہ بھی سنانے کو جی چاہتا ہے۔ اکتوبر ۱۹۵۶ء کی بات ہے۔ میں گاؤں گیا۔ وہاں سے چلنے لگا تو ایک بزرگ کی وفات کی اطلاع ملی۔ مجھے وہاں رُکنا پڑا۔ لاہور ٹیلیفون کیا۔ مولانا سے بات سُنی تو بہت حزن و ملال کا اظہار کیا اور اسی وقت

آدمی بیچ کر میرے گھر اطلاع کرائی، تاکہ بچے میرا انتظار نہ کریں اور پریشان نہ ہوں۔

”فقہ حنفی کو سمجھنے کی کوشش کیجیے“

۱۹۵۹ء میں لاہور کی بادشاہی مسجد کے سابق خطیب اور مشہور عالم مولانا غلام مرشد نے لاہور کے موقع پر خطبہ دیتے ہوئے ایوب خاں کی حکومت کو مشورہ دیا تھا کہ ارباب اقتدار کو پاکستان میں جانوروں کی قربانی کی ایک حد مقرر کر دینی چاہیے۔ اگر ہماری حکومت منصوبہ بندی کرے تو ملی مفاد کی خاطر لاکھوں جانوروں کی قیمت قربانی کے نام پر وصول کر کے بہت سے ہسپتال اور تعلیم گاہیں تعمیر کر سکتی ہے۔ ساتھ ہی انہوں نے یہ بھی کہا تھا کہ فقہائے کرام نے لکھا ہے کہ اگر قربانی کے جانوروں کی قیمت کسی قومی فنڈ میں ادا کر دی جائے تو اس رقم کی ادائیگی مذہباً قربانی تصور کی جائے گی۔

مولانا غلام مرشد کے اس خطبے پر اخبارات میں سخت تنقید کی گئی تھی۔ ”الاعتصام“ میں بھی اس عاجز نے اپنی علمی بساط کے مطابق لکھا۔ لیکن اس سلسلے میں مولانا غفرانوی کا مقالہ نہایت زور دار تھا۔ یہ مقالہ انہوں نے مولانا مفتی محمد حسن مرحوم کی فرمائش پر ”الاعتصام“ میں سپرد قلم فرمایا تھا۔ مولانا نے قرآن، حدیث، عمل صحابہ کے علاوہ فقہ حنفیہ کی مستند کتابوں سے ثابت کیا کہ اضحیح یعنی قربانی، ابراق دم (خون بہانے) کے سوا ہرگز نہیں ہو سکتی۔ یہ انہوں نے اس لیے ثابت کیا کہ مولانا غلام مرشد نے فقہ حنفیہ سے اپنے استدلال کا دعویٰ کیا تھا۔ مولانا نے ان ذوں ثلیغیوں پر مولانا غلام مرشد سے بھی بات کی اور اس انداز استدلال پر سخت افسوس کا اظہار کیا۔ یہ بھی فرمایا: ”مولانا غلام مرشد! فقہ حنفی کو سمجھنے کی کوشش کیجیے۔ آپ فقہ کی کسی مستند کتاب سے ثابت نہیں کر سکتے کہ قربانی بغیر ”ابراق دم“ کے بھی ادا ہو سکتی ہے۔“

”ستعلیق عالم دین“

مولانا چراغ حسن حسرت مرحوم نے ایک مرتبہ ”امروز“ کے حرف و حکایت میں مولانا داؤد

غزویؒ کی خوش ذوقی و خوش پوشی اور نفاستِ طبع کا ذکر کرتے ہوئے انہیں "نستعلیق عالم دین" قرار دیا تھا اور لکھا تھا کہ مولانا ابوالکلام آزادؒ اور مولانا داؤد غزنویؒ اگر کہیں ایک جگہ اکٹھے ہو جاتے تو دروازے بند کر کے محو گفتگو ہو جاتے۔ پھر انہیں کوئی پردانہ ہوتی کہ باہر بھی کوئی بیٹھا ہے۔ اتفاق سے اُن میں فیکری و علمی اتحاد کے ساتھ ساتھ نفاست اور خوش ذوقی و خوش پوشی کا بھی اتحاد تھا۔ حسرت مرحوم نے یہ بھی لکھا تھا کہ ممکن ہے دونوں ایک دوسرے کا گھنٹن دیکھتے رہتے ہوں۔

حسرت مرحوم کی یہ بات بالکل صحیح تھی۔ مولانا داؤد غزنویؒ واقعی نغیس الطبع تھے۔ وہ قلم اور کاغذ کے استعمال میں بھی اپنی خوش ذوقی اور نفاستِ طبع کو مجروح نہ ہونے دیتے۔ مولانا محمد اسماعیل مرحوم مضمون بھیجتے تو عام طور پر ایک طرف سے مطبوعہ کاغذ یعنی اشتار وغیرہ کی پشت پر لکھا ہوتا۔ مولانا اس پر سخت ناگواری کا اظہار کرتے اور کہا کرتے کہ میں اس قسم کے کاغذ پر لکھ ہی نہیں سکتا۔ مجھے میلے کچیلے اور مطبوعہ کاغذ سامنے رکھ کر مضمون سوجھنا ہی نہیں۔ اُن کی عادت تھی کہ نہایت عمدہ اور سفید کاغذ پر لکھتے۔ انہیں دو چار سطریں بھی لکھنا ہوتیں، تو بھی بہتر کاغذ استعمال کرتے۔

مولانا کا کتب خانہ

ان کا کتب خانہ انفرادی کتب خانوں میں سے بہت بڑا کتب خانہ تھا اور ہر موضوع سے متعلق کتابیں عمدہ ترتیب سے بہترین الماریوں میں سلپتے اور قرینے سے رکھی تھیں۔ ان کے پاس تفسیر، حدیث، شروح، فقہ اور اصول فقہ، اصول حدیث اور فنون کی تمام کتابیں موجود تھیں۔ ان کی عادت تھی کہ کتابوں کی جلد سازی کے لیے بہترین جلد سازی کی خدمات حاصل کرتے اور کتاب مجلد ہو کر واپس آتی تو اس کا ایک ایک ورق کھول کر دیکھتے کہ کہیں کوئی ورق جڑ بندی سے باہر تو نہیں رہ گیا ہے یا کسی ورق کے الفاظ تو جڑ بند

میں نہیں آگئے ہیں۔

کتابوں کو دیکھ اور گردوغبار وغیرہ سے محفوظ رکھنے کی پوری کوشش کرتے۔ کپڑے سے کتابیں خود صاف کرتے۔ کپڑے مکوڑے سے حفاظت کی غرض سے تیم کے پتے کتابوں میں ڈالتے۔ کہا کرتے کہ یہ کتابیں میری جائیداد ہے۔ میں انہیں اپنا اور بچوں کا پیٹھ کاٹ کر خریدتا ہوں۔

علمِ فقہ سے ان کو بہت دلچسپی تھی۔ چنانچہ حنفی، شافعی، مالکی، حنبلی وغیرہ تمام مسالکِ فقہ کی کتابیں ان کے پاس موجود تھیں۔ فتاویٰ نویسی میں چونکہ ان کو خاص درک تھا، اس لیے اکثر عربی اور اردو پر مشتمل کتبِ فتاویٰ ان کے پاس موجود تھیں۔ وہ ہر موضوع سے متعلق کتابوں کا باقاعدہ مطالعہ کرتے تھے اور اہم مقامات پر نوٹ لکھتے۔

لاہور میں تجوید و قرأت کا پہلا مدرسہ

قرآن مجید سے ان کو خصوصیت سے تعلق خاطر تھا۔ بعض اہل حدیث حضرات جس انداز سے قرآن پڑھتے اور مخارجِ حروف کی صحت سے بے نیازی برتتے ہیں، اس سے انہیں سخت ذہنی کوفت ہوتی۔ ایک دن انہوں نے بتایا (غالباً ۱۹۳۰ء کا ذکر کیا) کہ لاہور میں قرآن مجید کی قرأت و تجوید کا پہلا مدرسہ مسجدِ چینیاں والی میں، میں نے قائم کیا اور اس کے لیے قاری فضل کریم (مرحوم) کی خدمات حاصل کیں۔ مولانا کو اس مدرسے سے بہت دلچسپی تھی۔ اس کے لیے مسجدِ چینیاں والی کی مجلسِ منتظمہ طلباء، کوہئیں بیس روپے مہینہ وظیفہ دیتی تھی تاکہ اہل حدیث حضرات میں قراءت و تجوید کا ذوق پیدا ہو۔ اس خدمتِ قرآن پر کئی مشورہ قاری منتہین تھے۔ جن میں قاری فضل کریم (مرحوم)، قاری اطہار احمد تھانوی مدظلہ اور قاری محمد صدیق کے اسمائے گرامی خاص طور سے قابل ذکر ہیں۔ طلبائے قراءت کے سالانہ جلسہ تقسیم اسناد کے موقع پر مولانا خود تشریف لاتے اور

قزوت کی اس مجلس میں شرکت کرتے اور جب قاری صاحب قرآن کی تلامذت کرتے تو ان پر رقت طاری ہو جاتی اور آنکھوں سے بے اختیار آنسو جاری ہو جاتے۔

”یہ کون صاحب ہیں؟“

وہ پُر وقار اور بارُعب شخصیت کے مالک تھے۔ جدھر سے گزر جاتے انہیں دیکھ کر واقف اور ناواقف کے قدم وہیں رُک جاتے اور آنکھیں اُن کے چہرے پر گڑ جاتیں۔ واقف ٹھک کر سلام کرتے اور ناواقف تعجب سے پوچھتے کہ یہ کون بزرگ ہیں؟ اس کی ایک مثال پیش کرتا ہوں۔

جماعت کی تنظیم کے سلسلے میں لاہور سے بذریعہ ٹرین ملتان روانہ ہوئے۔ ساہیوال کے ارکان جماعت کو یلیغون کے ذریعے پہلے سے پروگرام کی اطلاع دی جا چکی تھی۔ وہ ٹیشن پر آئے۔ مولانا اپنے ڈبے سے اتر کر پلٹ فارم پر تشریف لائے۔ ملتان ڈویژن کے کمنڈر بھی پلٹ فارم پر موجود تھے۔ وہ ساہیوال کے سرکاری دُورے پر آئے تھے اور اُن کو اسی گاڑی سے ملتان جانا تھا۔ ساہیوال کے ڈپٹی کمنڈر اور دُورے سرکاری حکام ان کو الوداع کہنے کے لیے حاضر تھے۔ مولانا پلٹ فارم پر آئے تو کمنڈر، ڈپٹی کمنڈر اور اُن کے ساتھیوں نے ان کی طرف دیکھا۔ آپس میں کوئی بات کی اور ڈپٹی کمنڈر نے چودھری عبدالقادر (مرحوم) کی طرف قدم بڑھا کر وہ چودھری صاحب سے متعارف تھے۔ پوچھا: ”یہ کون صاحب ہیں؟“ کہا: مولانا داؤد غزنوی! پھر وہ دونوں مولانا کے پاس آئے۔ چودھری صاحب نے ساہیوال کے ڈپٹی کمنڈر اور ڈپٹی کمنڈر نے کمنڈر صاحب کا تعارف کرایا۔ دونوں نے اُدب سے ٹھک کر سلام کیا اور کہا: آپ کے بارے میں سنا تو بہت کچھ تھا لیکن نیاز مندی کا شرف آج ہی حاصل ہوا۔ گفتگو چونکہ جماعتی نوعیت کی ہو رہی تھی اس لیے کمنڈر اور ڈپٹی کمنڈر دُعا کی درخواست کر کے علیحدہ کھڑے ہو گئے اور جب تک مولانا کھڑے رہے وہ ان کو دیکھتے رہے۔

ایک عظیم کردار

مولانا صبح کو دس بجے اپنے دفتر آجاتے، پھر دوپہر کو کھانے کے وقت اُپر جاتے۔ تھوڑی دیر بعد پھر آجاتے اور مغرب کی نماز کے بعد تک نیچے تشریف رکھتے۔ وفات سے پانچ چھ سال پہلے دل کی تکلیف زیادہ بڑھ گئی تھی، اس لیے بعض دفعہ یہ پابندی قائم نہ رہ سکتی۔ ملاقات کے لیے ہر قسم کے لوگ آتے اور الگ الگ مقصد لے کر آتے، مگر وہ ہر ایک سے ملتے کسی کی دل چاہتی نہ کرتے۔ بارہا ایسا ہوتا کہ اُپر جاتے، اسی وقت کوئی ملنے والا آجاتا، اطلاع پہنچتی تو پھر نیچے آجاتے۔ ان کو چار منٹیں اُپر جانا پڑتا تھا۔ دل پر ہاتھ رکھ کر آہستہ آہستہ اُپر چڑھتے اور اسی دھیمی رفتار سے نیچے آتے۔ اکثر کہا کرتے کہ ”یہ بیٹھیں“ میرے لیے ایک عذاب ہے۔ وہ ”بیٹھیں“ نہیں ”بیٹھیں“ کہتے تھے۔ ”انذار کیجیے کتنی بیٹھیں اُپر چڑھتا ہوں اور پھر کتنی نیچے آتا ہوں۔“ بعض دفعہ یہ بھی کہتے کہ جی چاہتا ہے کہ بیٹھیں کی صحبت سے نجات حاصل کرنے کے لیے نیچے ہی دو تین کمرے تعمیر کر لیے جائیں، مگر تعمیر کے لیے نہج کہاں سے لاؤں؟ فرمایا کرتے: ”میں کسی ملنے والے کو ملنے سے انکار نہیں کر سکتا، اس لیے اُپر نیچے آنا جانا ضروری ہے لیکن یہ بیٹھیں بڑی تکلیف کا باعث ہیں۔ یہ مجھے مار ڈالیں گی، یہ ان کا ایک عظیم کردار تھا کہ تکلیف کے باوجود نیچے تشریف لانے، فقط اس لیے کہ ملاقات کرنے والے پریشان نہ ہوں اور انہیں مایوس نہ لوٹنا پڑے۔“

پیر صاحب نے مسند خالی کر دی!

کبھی کبھی اپنی زندگی کے گزشتہ دور کی باتیں بھی خوش ہو کر سناتے۔ ایک دن بتایا کہ ترکیب عدم تعاون کے زمانے میں میں اور مولانا ظفر علی خاں میاں کوٹ کے دورے پر گئے۔ ایک جگہ جا رہے تھے کہ اثنائے سفر میں علی پور سیدیاں پہنچ گئے۔ میں نے مولانا ظفر علی خاں سے کہا پلے

پر جماعت علی شاہ صاحب سے ملے چلیں۔ وہ سیاسیات میں ہمارے شدید مخالف تھے۔ اور مولانا ظفر علی خاں نے تو ”زیندار“ میں بے شمار نظیں اور مضامین ان کے خلاف لکھے تھے۔ انہوں نے کہا وہ ہماری مخالفت کریں گے۔ ان کے پاس نہیں جانا چاہیے مگر میں نے ان سے ملنے پر اصرار کیا۔ بالآخر ہم انکے مکان پر پہنچ گئے۔ پیغام بھیجا فوراً اندر بلالیا اور میرے لیے منڈ خالی کر دی۔ کہا آپ سید ہیں بہت بڑے علمی اور مجاہد خاندان سے تعلق رکھتے ہیں۔ خود بھی عالم ہیں اور نیک کلام کے لیے نکلے ہیں۔ ہمارے معزز مہمان ہیں اس مندر پر آپ ہی تشریف رکھیں گے۔ میں نے ہر چند معذرت کی مگر وہ نہ مانے۔ آخراً ان کے اصرار پر میں بیٹھے گیا اور مولانا ظفر علی خاں کو بھی انہوں نے میرے برابر بٹھایا۔ پھر ہم نے یہ کہہ کر مندر چھوڑ دی کہ تمہیں ارشاد ہو گئی ہے۔ ”مولانا نے بتایا کہ جب تک ہم بیٹھے رہے وہ اپنی مندر پر نہیں بیٹھے۔ ہمارے برابر بیٹھے رہے۔ پانی پلایا، کھانا کھایا۔ رات رہنے پر اصرار کیا اور بہت اچھی طرح پیش آئے۔“

معذرت خواہ ہوں کہ مضمون لمبا ہو گیا ہے اور دوفر شوق کے باعث مرتب اور مربوط بھی نہیں ہے۔

میرے استاد

مولانا داؤد غزنوی رحمۃ اللہ علیہ

_____ محی الدین سلفی

سلسلہ کی بات ہے جب میں پہلی دفعہ حضرت مولانا سید محمد داؤد غزنویؒ کی زیارت سے مشرف ہوا۔ مسجد قدس امرتسر میں ایک ہندی طالب علم کی حیثیت سے زیر تعلیم تھا۔ شعور ابھی بچپنی کے مراحل طے کر رہا تھا۔ ایک دن طلبہ سے معلوم ہوا کہ مدرسہ غزنویہ کے مہتمم حضرت مولانا داؤد غزنویؒ امرتسر تشریف لا رہے ہیں۔ میں بھی شوق زیارت لے کر مدرسہ غزنویہ پہنچ گیا۔ میرے پہنچنے سے پہلے مولانا تشریف لا چکے تھے۔ میں نے آپ سے مصافحہ کیا اور طلبہ کے حلقے میں بیٹھ گیا۔ ملکی مسائل اور مدرسہ کے بارے میں گفتگو ہوتی رہی۔ ملک تقسیم ہو گیا تو میں نے عربی تعلیم کی تکمیل کے لیے دارالعلوم تقریۃ الاسلام لاہور میں جو امرتسر سے منتقل ہو کر آیا تھا داخلے لیا۔

مولانا علیہ الرحمۃ کو جب معلوم ہوا کہ ایک میٹرک پاس طالب علم بھی ہمارے مدرسہ میں داخل ہوا ہے تو آپ نے مجھے بلایا۔ تعارف کے بعد آپ بے حد خوش ہوئے۔ اس لیے بھی کہ ہمارے بزرگوں کی عقیدتیں اس خاندان کے ساتھ وابستہ رہی ہیں۔ مدرسہ چونکہ ابتدائی مراحل میں تھا اور اس کے حسابات اور خط و کتابت کے لیے ایک ناظم و دفتر کی ضرورت تھی۔ مولانا مرحوم نے مجھے اس کام پر لگایا، تعلیم کے علاوہ میں نے اس کام کو بھی اپنے ذمے لیا۔ میں چونکہ سکول کے ماحول سے نکل کر دہاں پہنچا تھا، اس لیے بعض چیزیں طبیعت سے میل نہ کھاتی تھیں جو پڑھنے عربی مدارس میں رائج ہیں۔ کھانے کا انتظام اگرچہ مدرسہ کے

مطبوع میں ہوتا تھا، لیکن طلبہ انفرادی طور پر کھاتے تھے جس سے وقار اور نظم متاثر ہوتا تھا۔
 میں نے اپنے رفقاء کی معیت میں مولانا سے عرض کیا کہ ہم اجتماعی کھانے کا بندوبست
 کرنا چاہتے ہیں۔ آپ نے ہم سے تعاون کا اظہار فرمایا اور برتنوں اور دیگر اشیاء کا انتظام
 کر دیا گیا۔ اس طرح مجھے مولانا علیہ الرحمۃ کے زیادہ قریب ہونے کا موقع ملا۔ مدرسہ کے
 حسابات اور خط و کتابت کے سلسلے میں ہر دوسرے تیسرے دن مولانا کی خدمت میں حاضری
 ہوتی لیکن طالب علمی کے ابتدائی دور کی وجہ سے جب مولانا مجھے بلاتے تو مجھ پر کچپی طاری
 ہو جاتی۔ ان کی گرج دار آواز سے سم جاتا۔ یہ آواز ظاہراً گرجدار تھی لیکن حقیقت میں ایک
 مشفق کی آواز تھی۔ میرا یہ ڈر روز بروز کم ہونے لگا اور میں ان سے مانوس ہونے لگا، پھر یہ
 کیفیت ہوئی کہ کبھی کبھار آپ مجھے کھانے کی کوئی چیز دے دیتے اور عید کے موقع پر
 بعض اوقات عیدی سے بھی میری حوصلہ افزائی ہونے لگی۔ مولانا کے اس سلوک سے
 میں نے اپنے آپ کو طلبہ سے برتر محسوس کرنا شروع کر دیا۔ مدرسہ میں ہم نے ایک جمعیت
 بھی قائم کی تھی۔ مولانا علیہ الرحمۃ کبھی کبھار اُس میں شرکت فرماتے اور ہمیں فنِ تقریر اور علمی
 ترقی کے لیے ہدایات دیتے۔ اُن کے ارشادات آج بھی میرے کانوں میں گونج رہے ہیں۔
 ایک دفعہ آپ نے فرمایا: عزیزو! تقریر تمہارے علم کا پیمانہ ہے۔ اپنے آپ کو ایک
 بہتر مقرر بنانے کی کوشش کرو۔ ایک مقرر خوشی، غم اور یاس کی حالتوں میں بھی عوام کے
 جذبات کو بے قابو نہیں ہونے دیتا۔ اس کے حق میں آپ نے حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ
 کے اُس خطبے کی مثال بیان کی جو آپ نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے وصال کے موقع پر ارشاد
 فرمایا۔ حضرت عمرؓ لوگوں سے یہ کہہ رہے تھے کہ جو شخص یہ کہے گا ”مُحَمَّدٌ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ“
 انتقال کر گئے ہیں نہیں اُس کا سر قلم کر دوں گا۔ حضرت ابو بکرؓ تشریف لائے۔ آپ نے
 خطبہ مسنونہ پڑھا اور اس کے بعد فرمایا: مَنْ كَانَ يَعْبُدُ مُحَمَّدًا فَإِنَّ مُحَمَّدًا أَقْدَامُ
 وَمَنْ كَانَ يَعْبُدُ اللَّهَ فَإِنَّ اللَّهَ حَيٌّ لَا يَمُوتُ۔

اس کے بعد آپ نے قرآن مجید کی یہ آیت پڑھی : وما محمد الا رسول قد
 خلت من قبله الارسال افان مات او قتل انقلبتم علی اعقابکم۔
 اس خطبے کا ارشاد فرمانا تھا کہ مجمع کی حالت بدل گئی اور لوگ جو سسے ہوئے تھے آپ
 کے وصال کا مذکرہ کرنے لگے۔

مولانا علیہ الرحمۃ میں سلیقہ، نظم و ضبط بدرجہ غایت تھا۔ چنانچہ آپ طلبہ کو بھی انہی
 باتوں کی تلقین فرماتے۔ آپ نے انہی اجلاسوں میں ایک دفعہ فرمایا کہ آپ اپنے اندر
 نظم و ضبط، سلیقہ اور صفائی کے اوصاف پیدا کریں۔ میں تمام طلبہ سے کہتا ہوں کہ وہ اجلا
 لباس پہنیں، اپنی گفتگو نشست و برخاست اور تعلیم میں اپنے آپ کو ایک منہذب اور
 شائستہ طالب علم کی حیثیت سے پیش کریں۔ آپ کسی چیز کو بے قرینہ رکھنے کو پسند نہ فرماتے۔
 کتابیں، تپائیاں، چٹائیاں ان میں سے کوئی چیز بھی بغیر قرینے کے پڑھی ہوتی تو آپ طلبہ
 کو ڈانٹتے اور فرماتے، نہ معلوم تمہیں کب تیز آئے گی؟ لیکن جہاں آپ ڈانٹتے وہاں آپ
 طلبہ کو اچھی طرح سمجھاتے کہ کس طرح چیزوں کو رکھا جاتا ہے۔ مدرسہ تقویۃ الاسلام میں
 وضو گاہ چونکہ جائے نماز سے متصل ہے، اس لیے بعض طلبہ یا نمازی وضو کرنے کے بعد
 ننگے پاؤں صوفوں پر آدھکتے۔ آپ ایسے موقعوں پر ننگی کا اظہار کرتے اور فرماتے :
 ما لہولاء القوم لایکادون یفقیہون حدیثاً۔ مولانا عموماً اپنے دلائل کی تائید
 میں آیات قرآنیہ پڑھتے جن سے ایک طرف آپ کی قرآن مجید سے شیفتگی کا اظہار ہوتا۔
 دوسری طرف ان لوگوں کا جواب بھی ہو جاتا جو یہ کہتے ہیں کہ اصحاب الحدیث صرف حدیث
 پر اکتفا کرتے ہیں۔ اس کے علاوہ قوت بیان کا زور بھی بڑھ جاتا۔

میں نے آپ کے طریقہ تبلیغ کو مبنی بر حکمت پایا ہے۔ طلبہ کے علاوہ اگر انہیں کسی کو
 منع کرنا ہوتا تو بڑی حکمت اور سلجھے ہوئے انداز میں منع فرماتے۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ
 ایک شخص نماز ادا کرنے آیا اور صرف تجبیر تحریر کہہ کر بغیر ہاتھ باندھے رکن نماز میں شامل ہو گیا۔

مولانا اس کے ساتھ کھڑے تھے آپ نے نماز کے بعد بڑے سلیجھے ہوئے انداز میں فرمایا کہ اس طرح نماز نہیں ہوتی۔ تکبیر کے بعد ہاتھ باندھنے چاہئیں۔

چھوٹوں کو بھی آپ بڑی عزت و احترام سے بلاتے۔ چنانچہ میرے ذہن میں یہ بات اچھی طرح مرتب ہے کہ جن دنوں میں مشکوٰۃ پڑھا تھا، مولانا مجھے مولوی محی الدین کہہ کر بلاتے۔ میں دل میں بڑا خوش ہوتا کہ مولوی تو بن گیا ہوں، یہی کیفیت کم و بیش دوسرے طلبہ اور لوگوں سے تھی۔

آپ کی زندگی بڑے ہنگامے کی تھی، لیکن اس کے باوجود آپ نے جن چیزوں کو اپنے لیے لازم کر لیا تھا، ان کی بڑی باقاعدگی کی۔ سیاست کی خاردار وادی میں قدم رکھتے ہوئے بھی آپ نماز، نوافل اور اوراد و وظائف کو کمال باقاعدگی سے انجام دیتے رہے۔ مسجد چینیازلی میں خطبہ جمعہ آپ نے اپنی زندگی کے سرور میں پابندی کے ساتھ دیا۔ آخری تین چار سالوں کے خطبے نہایت علمی ہونے کے ساتھ ساتھ تصوف کا غالب رنگ اپنے اندر لیے ہوئے تھے۔ ان خطبوں کو آپ باقاعدہ ترتیب کے ساتھ نوٹ کر کے دیتے۔ ہماری تعلیم کے آخری سال مولانا علیہ الرحمۃ نے مؤطا امام مالک کے درس کا اظہار فرمایا۔ ہمارے لیے یہ چیز نہایت خوش کن تھی۔ چنانچہ چند دن کے بعد آپ نے مؤطا کا درس شروع کر دیا۔ مولانا نے اپنے درس میں اس وقار اور عظمت کو برقرار رکھنے کی پوری کوشش فرمائی جو امام مالک کے بارے میں منقول ہے۔ مولانا محترم نہایت اُجلا لباس پہن کر تشریف لاتے، دو زانو ہو کر بیٹھتے اور سارا درس اسی حالت میں بیٹھے رہتے۔ طلبہ کو ننگے سر درس میں بیٹھنے کی اجازت نہ تھی۔ طریقہ تعلیم بھی دوسرے اساتذہ سے مختلف تھا۔ شروع میں طالب علم سے عربی عبارت پڑھواتے، پھر اس کا با محاورہ ترجمہ کرواتے۔ پھر مثل الفاظ کی تشریح ہوتی۔ اس کے بارے میں امام مالک اور دوسرے ائمہ کا مسک بیان فرماتے، آخر میں فقہ الحدیث بڑی خصوصیت سے ذکر فرماتے۔

بعض طلبہ جو صرف و نحو کے لحاظ سے اپنے رفقاء سے آگے تھے، لیکن با محاذ و تزویر کرنے میں سب سے پیچھے تھے۔ مولانا انہیں اپنی زبان ترشوانے کی ترغیب دلاتے۔ یہی وجہ تھی کہ ہم مڑھا کے گھنٹے کاشتت سے انتظار کرتے جس دن نانا ہو جاتا ہے اس کا نہایت دکھ ہوتا۔ مولانا کے درس میں علم بھی تھا، وقار بھی، ادب بھی زبان بھی، اختلاف رائے کے باوجود ائمہ کا نام اتنے ادب و احترام سے لینے کہ سننے والوں کی آنکھوں سے آنسو بہ نکلتے۔

مولانا علیہ الرحمۃ میں یہ خوبی بدرجہٴ غایت موجود تھی کہ مسائل میں اعتدال کی راہ اختیار فرماتے۔ پورا درس نہایت دلچسپ ماحول میں ہوتا۔ تکان اور بیہوشی نام کو نہ ہوتی جیسا کہ عام اساتذہ کے اسباق میں ہوتی ہے۔

مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ جب انہیں کوئی علمی نکتہ بیان فرمانا ہوتا تو طلبہ کو پوری طرح اپنی طرف متوجہ فرماتے اور کہتے العلم، العلم۔

بار بار سمجھانے کے بعد بھی کوئی مسئلہ کسی کے ذہن نشین نہ ہوتا تو آپ یا قلہ العلم کے الفاظ فرماتے۔

ہمارے مدارس میں یہ بات دیکھی گئی ہے کہ بعض اساتذہ دورانِ درس طلبہ کو اپنے گرد اس طرح جمع کیے رکھتے ہیں جیسے شند کا چھتہ مکھیروں کو، لیکن مولانا علیہ الرحمۃ حلقے کو وسیع کرنے پر بہت زور دیتے۔

آپ کے درس کی نمایاں خصوصیت یہ بھی تھی کہ آپ دورانِ درس دُنیا کی کسی بات کا تذکرہ نہ فرماتے۔ اگر کوئی صاحبِ مُلاقات کے لیے آتے تو کیا مجال کہ آپ سے دورانِ درس بات کر سکے۔ آپ ہاتھ کے اشارے سے اُسے بیٹھنے کو کہتے۔ درس کے بعد اُس سے گفتگو فرماتے۔ آپ کے ہاں یہ طریقہ ہرگز رائج نہ تھا کہ مُتحدث پر بھی بیٹھے ہوئے ہیں اور دُنیا داری کے تذکرے بھی ہو رہے ہیں۔ آپ طلبہ کو مختلف نصیحتیں فرماتے رہتے۔ فرید کُتب اور مطالعے

کی طرف آپ خصوصیت سے توجہ دلاتے۔ کتبِ اصول فقہ کا ذکر ہوا تو آپ نے فرمایا اگر میں یہ دعویٰ کروں کہ اصول فقہ پر جتنی کتابیں میرے پاس ہیں، پاکستان میں کسی عالم دین کے پاس نہیں ہیں تو یہ دعویٰ بے جا نہ ہوگا۔

ایک دفعہ آپ نے طلحہ سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا میں تمہیں شیخین (امام ابن تیمیہ، اور ابن قیم علیہما الرحمۃ) کی کتب اپنے مطالعہ میں رکھنے کی تلقین کرتا ہوں۔ ان دونوں حضرات کے ہاں علم کے غزائے ہیں اور کوئی اہل علم ان سے مستغنی نہیں ہو سکتا۔ دورانِ درس آپ ضروری اشارات کھواتے۔ غرض کہ درس اس طرز پر ہوتا کہ خود بخود ذہن نشین ہوتا جاتا۔

افسوس! کہ ہم آج ایسی جامع الصفات، ہستی سے محروم ہیں جن میں علم بھی تھا، عمل بھی۔ نظم بھی تھا، وقار بھی، دین بھی تھا سیاست بھی۔ حسن بھی تھا اور سلیقہ شعاری بھی۔ جمال بھی تھا اور جلال بھی اور سب سے بڑھ کر یہ کہ اللہ تعالیٰ نے اُن کے دل کو تقویٰ کے لیے متخب کر لیا تھا اور اُس سے مزین کر دیا تھا۔

اللہ تعالیٰ سے دُعا ہے کہ وہ آپ کو جنت الفردوس میں جگہ دے۔

اے دُعا از من از جملہ جہاں آمین باد۔

اللّٰهُمَّ اغْفِرْ لَهُ وَاَدْخِلْهُ جَنَّةَ الْفِرْدَوْسِ

میرے مشفق استاد

حافظ عبدالرشید
مدرس دارالعلوم تقویۃ الاسلام
لاہور

حضرت الاستاذ مرحوم سے میری پہلی ملاقات ہمارے گاؤں گوہر چک میں ہوئی۔ ایکسٹن کا زمانہ تھا۔ حضرت مولانا ہمارے علاقہ میں انتخاب لڑ رہے تھے۔ پہلی دفعہ گوہر چک تشریف لائے۔ انہیں دیکھ کر دل کو روحانی طور پر خوشی ہوئی۔ حضرت سے ملاقات کا شرف حاصل ہوا۔ آپ اہم حدیث مسجد میں قیام پذیر تھے اور میرا تعلق اہل سنت و اجماع کی جامع مسجد سے تھا۔ میں نے عرض کیا کہ حضرت اہم حدیث تو آپ ہی کو دوٹو دیں گے، آپ جمعۃ المبارک کا خطبہ ہماری مسجد میں ارشاد فرمائیں۔ حضرت نے بخوشی منظور فرمایا اور جمعہ کا خطبہ مسجد حنیفہ میں ارشاد فرمایا۔ اس دن سے میری برادری حضرت کے شیاؤں میں سے ہے۔

میں نے انتخاب میں چونکہ بڑا کام کیا تھا، اس لیے حضرت مولانا کی خصوصی توجہ بندہ کی طرف ہو گئی۔ انتخاب کے بعد حضرت نے مجھے حکم دیا کہ میں دارالعلوم تقریبۃ الاسلام میں مزید تعلیم حاصل کرنے کے لیے آجاؤں۔ چنانچہ ۱۹۵۰ء میں میں نے دارالعلوم میں داخلہ لے لیا۔ حضرت الاستاذ سے میں نے مؤطا امام مالک، حجتہ اللہ البالغہ، الفکر الکبیر اور تفسیر القان کے کچھ حصے پڑھے۔

امام مالک سے حضرت الاستاذ کو خصوصی تعلق تھا اور آپ فقہ حنابلہ پر پورا عبور رکھتے تھے۔ جب حضرت پڑھانے کے لیے تشریف لاتے تو خوب اُجلا لباس پہن

کر اور خوشبو لگا کر درس ارشاد فرماتے۔

طلباء کی تعداد جو صرف مؤطا امام مالک پڑھتے تھے، تقریباً بائیس تھی لیکن عبارت اکثر مجھے پڑھنے کا حکم دیتے اور ایسے نکات بیان فرماتے کہ ہم حیران ہو جاتے کہ مولانا انہی مصروفیات کے ہوتے ہوئے مطالعہ کب فرماتے ہیں۔ درس کے دوران میں ہال میں سناٹا چھا جاتا اور کوئی طالب علم ادھر ادھر نہیں جھانکتا تھا۔ خود حضرت کا یہ حال تھا کہ ایک دفعہ دورانِ سبق میں ڈی سی صاحب لاہور یا کوئی ڈوسٹر افسر تشریف لائے، حضرت سبق پڑھا رہے تھے۔ آپ نے اشارہ فرمایا کہ بیٹھ جاؤ۔ ڈپٹی کمشنر صاحب یا وہ افسر بیٹھ گئے۔

سبق سے فارغ ہو کر فرمایا کہ میں حضور سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث پاک پڑھا رہا تھا۔ حدیث کو درمیان میں چھوڑ کر دوسری طرف توجہ کرنا تو ہمیں حدیث سمجھتا ہوں۔ (دسبحان اللہ)

دورانِ سبق میں پورے جمال اور جلال کے ساتھ تشریف رکھتے اور طلباء کے سوالوں کا جواب اس طرح دیتے کہ دوبارہ سوال کرنے کی ضرورت ہی نہ ہوتی۔

يدع الجواب فلا يرجع هيبنة ادب الوقار وعز سلطان التقى
والمسألون فواكس الاذقان فهو المطاع وليس ذاسلطان

حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کے آپ بڑے شیدائی تھے۔ حجۃ اللہ پڑھاتے وقت شاہ صاحب کے فلسفہ اسلام سے خوب لطف اندوز ہوتے اور بڑے مزے لے لے کر پڑھاتے۔

اسی طرح الفوز الجبیر میں وہ تفسیری نکات بیان فرماتے کہ اگر آج بھی مجھے ان میں سے دورانِ تدریس یاد آجائیں تو حضرت مولانا کے لیے زبان سے دعائیں جاری ہو جاتی ہیں۔

غرض مولانا جس طرح سیاسی بصیرت کے حامل تھے اس سے بڑھ کر حضرت کو درسِ نظامی کی کتابوں پر عبور حاصل تھا۔ صرف و نحو اور تفسیر و حدیث اور فقہ میں پوری دسترس رکھتے تھے۔

مولانا صاحبؒ، صاحبِ جلال و جمال تھے۔ ایک دفعہ نماز مغرب کا وقت تھا، اس وقت ہمارے اسباق کے ساتھی مولانا بشیر احمد صاحب پتوکی والے حضرت کے حکم سے دارالعلوم میں امامت کرایا کرتے تھے۔ امام صاحب ابھی وضو کر رہے تھے کہ اذان ختم ہو گئی۔ حضرت مولانا نے ایک دوسرے طالب علم کو جماعت کرانے کا حکم فرمایا۔ مولوی بشیر صاحب فوراً بول اُٹھے کہ میں امام ہوں اور امام راتب کی موجودگی میں اس کی اجازت کے بغیر کسی کو امامت کرنے کی اجازت نہیں۔ حضرت مولانا صاحبؒ نے یہ بات سنی تو آپ کی آنکھوں میں آنسو آگئے اور مولوی بشیر کے وضو کرنے تک آپ اسی حالت میں رہے۔ مولوی بشیر صاحب نے جماعت کرائی۔ بعد میں حضرت نے فرمایا کہ مجھ سے غلطی ہو گئی ہے کہ میں نے آپ کی اجازت کے بغیر کسی دوسرے کو امامت کے لیے کہہ دیا۔ میں بیمار ہوں اتنی لمبی بیٹھیاں اُتر کر آتا ہوں۔ آپ بھی ذرا میرا خیال رکھا کریں۔“

اسی طرح کا ایک دوسرا واقعہ ہے کہ ایک دن صبح کی اذان ہوئی تو مولانا فوراً نیچے تشریف لائے اور فرمانے لگے کہ ابھی اذان کا وقت نہیں ہوا تھا بلکہ دو منٹ باقی تھے اس لیے دوبارہ اذان کہو اور یہ بات حضرت نے بڑے جلال میں کہی۔ نماز کے بعد وظیفہ مکمل کر کے اوپر تشریف لے گئے پھر نیچے تشریف لائے اور فرمانے لگے کہ صبح کی اذان وقت پر ہوئی تھی۔

ادرا لخطا، منی واللہ ورسولہ برئیان۔ جن لوگوں پر میں ناراض ہوا تھا، ان سے معافی چاہتا ہوں۔ آپ کے یہ الفاظ سن کر کئی نمازیوں کی آنکھوں میں آنسو

آگئے۔ ایک بزرگ اُن کا نام مجھے نہیں آتا۔ غالباً حضرت سیدمیاں نذیر حسینؒ کے خاندان میں سے تھے، وہ حضرت مولاناؒ کے اس فعل پر بڑے حیران ہوئے اور زبان سے سبحان اللہ سبحان اللہ کافی دیر تک کہتے رہے۔ صدق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم من تواضع لله رفعه الله

طلباء کے ساتھ اتنی شفقت فرماتے تھے کہ ہم طلباء میں اکثر مقابلے کرتے اور جیتنے والے کو انعام دیتے۔

ایک دفعہ میرے درمیان اور مولوی محمد حسین صاحبؒ کے درمیان حضرت نے ایک مضمون پر مقابلہ کرایا تھا اور بندہ عاجز کو خوب انعام سے نوازا اور علم دین کی خدمت کرنے کی دعائیں دیں۔

اللهم اغفر له وارحمه وعافه واعف عنه وادخله الجنة الفردوس واجعل قبره روضة من رياض الجنة۔

مولانا سید محمد اود غزنویؒ

(چند یادیں، چند باتیں)

خالد بزئی ایم اے

مولانا سید محمد داؤد غزنوی مرحوم کا نام پہلی بار میں نے حضرت مولانا ابوالوفائشا، اللہم تسریٰ کی زبان سے جمعۃ المبارک کے ایک خطبے میں سنا تھا جس میں غالباً وہ مولانا داؤد غزنوی مرحوم کی کسی قید کا ذکر کر رہے تھے۔

یہ واقعہ آج سے تقریباً تیس برس پہلے کا ہے، جب میری عمر زیادہ سے زیادہ دس بارہ برس ہوگی۔

اس واقعے کے کچھ عرصہ بعد جب مولانا داؤد غزنوی مرحوم انڈین نیشنل کانگریس کو چھوڑ کر مسلم لیگ میں شامل ہو گئے تو امرتسر کی مشہور اجتماع گاہ مسجد خیر الدین مرحوم واقع ہان نڈل میں اُن کی تقریر کا اہتمام کیا گیا۔ میرے دل میں مولانا کی زیارت کا اشتیاق بہت پہلے سے موجود تھا۔ میں اُن کی تقریر کے بارے میں اعلان سن کر اپنے والد مرحوم اور بڑے بھائی کے ساتھ کشاں کشاں مذکورہ مسجد میں گیا۔ وہاں لوگ اس کثرت سے مولانا موصوف کے ارشادات سے مستفید ہونے کے لیے آئے تھے کہ جلسہ گاہ اپنی وسعتوں کے باوجود تنگی داناں کا گلہ کر رہی تھی۔ لوگ ایک دو سرے پر گرے پڑتے تھے۔ مولانا ابھی تک تشریف نہیں لائے تھے۔ اُس روز انہیں لاہور سے وہاں پہنچا تھا۔ لوگوں کا اشتیاق اور ہجوم دم بدم بڑھتا جا رہا تھا اور ان کی سنجھیں مولانا کے چہرے کی ایک جھلک دیکھنے کے لیے مسجد کے بڑے دروازے پر لگی تختیں عین اس کیفیت میں لاہور سے غالباً تارینچیا یا ٹیلیفون پر اطلاع ملی کہ مولانا کو جس ہوائی جہاز سے

امرتسرنچنپتا تھا، انہیں اس میں جگہ نہیں مل سکی اس لیے وہ تشریف نہیں لاسکے۔ اس خبر سے لوگوں کو سخت مایوسی ہوئی اور ان میں سے اکثر ٹوٹے دلوں اور بوہل قدموں کے ساتھ گھروں کو واپس گئے۔

منظمین جلسہ نے مولانا کی جگہ پرسید خالد گیلانی اور مولوی بشیر انگر کی تقریریں کرادیں لیکن ظاہر ہے کہ جو لوگ فقط مولانا داؤد غزنوی رحمۃ اللہ علیہ کے ارشادات سننے کی غرض سے وہاں پہنچے تھے، انہیں اس وقت کسی اور مقرر سے کم ہی دلچسپی ہو سکتی تھی۔ ہم بھی انہی لوگوں میں شامل تھے جو مولانا کے نہ آسکنے کی خبر سن کر گھروں کو واپس چلے آئے۔

اس واقعے کے کچھ عرصہ بعد برصغیر پاک و ہند کے سیاسی حالات یکسر کچھ ایسی صورت اختیار کر گئے کہ امرتسر کا شہر شعلوں کا مرکز بن گیا۔ یہاں تک کہ ۱۴ اگست ۱۹۴۷ء تک شاید امرتسر کا کوئی بھی فرد ایسا نہیں ہوگا جو پاکستان کی طرف ہجرت پر مجبور نہ ہو گیا ہو۔

پاکستان کے معرض وجود میں آنے اور امرتسر سے ہجرت پر مجبور ہوجانے کے باعث میں امرتسر میں مولانا کی زیارت نہ کر سکا اور انہیں پہلی بار دیکھنے کا موقع مجھے لاہور ہی میں آ کر نصیب ہو سکا۔

جب پاکستان کا قیام عمل میں آیا تو اس وقت میں ابھی سکول کا طالب علم تھا اور آٹھویں جماعت میں پڑھتا تھا۔ لاہور آنے کے بعد جب میں نے میٹرک کا امتحان پاس کر لیا، تو گھر والوں نے مجھے اسلامیہ کالج ریلوے روڈ لاہور میں داخل کرادیا۔ یہاں میرے داخل ہونے کے چند ماہ بعد پرسید ابوبکر غزنوی صاحب اسی کالج میں عربی کے لیکچرار کی حیثیت سے تشریف لے آئے۔ میں عربی کا طالب علم تھا۔ مجھے اُن سے پڑھنے کی سعادت حاصل ہوئی۔ جب مجھے معلوم ہوا کہ ہمارے نئے پروفیسر صاحب مولانا سید داؤد غزنوی کے فرزند ارجمند ہیں تو مجھے خاص طور پر اس لیے زیادہ خوشی ہوئی کہ میرے دل میں موروثی طور پر

خانہ غزنویہ کے لیے احترام و عقیدت کے دیرینہ جذبات موجود تھے۔ کچھ ہی عرصہ بعد پروفیسر صاحب کی بدولت مجھے مولانا داؤد غزنوی (مرحوم) کا قُرب حاصل کرنے میں بہت زیادہ مدد ملی اور اُن کی زیارت کے متعدد مواقع حاصل ہو گئے جو میرے لیے ہمیشہ ہمیشہ باعث افتخار رہیں گے۔

مولانا مرحوم کی ذات میں قدرت نے متعدد اوصاف پیدا فرمائے تھے۔ میں ذاتی طور پر اُن کی جس خوبی کا سب سے زیادہ معترف ہوں، وہ مسک کے اعتبار سے اُن کی کشادہ دلی اور بلند نظری تھی۔ میں نے مولانا کی زبان سے کبھی ایسے الفاظ نہیں سُنے جن سے کسی بھی مسک کے کسی شخص کی دلآزاری ہوتی ہو۔

مجھے اکثر اہل حدیث کے علاوہ بعض دُوسرے مسک کے ایسے لوگوں سے مولانا کے بارے میں گفتگو کا موقع ملا جو کسی طرح بھی اپنے محدود دائروں سے باہر نکلنا پسند نہیں کرتے لیکن مولانا کے بارے میں اُن لوگوں کی زبانوں پر بھی میں نے احترام اور عقیدت کے الفاظ سُنے۔ بلاشبہ یہ اعتراف مولانا مرحوم کی عظمت کو بہت بڑا خراج ہے۔

مسک کے اعتبار سے مولانا کی کشادہ دلی اور بلند نظری ہی کا نتیجہ تھا کہ دیگر مساکِ حقہ کے جید علماء مثلاً مفتی محمد حسنؒ، مولانا احمد علیؒ اور سید ابوالحسن علی ندوی وغیرہ سے مولانا کے مخلصانہ اور گہرے روابط تھے۔

میں نے دیکھا کہ حضرت مولانا مفتی محمد حسنؒ (بانی جامعہ اشرفیہ لاہور) اپنی ایک ٹانگ سے محرومی اور فالج زدہ ہونے کے باوجود ایک بار ایک جیب نما گاڑی میں مولانا داؤد غزنویؒ سے ملنے کے لیے شیش محل روڈ پر تشریف لائے۔

مولانا داؤد غزنویؒ اور مولانا احمد علی مرحوم کے درمیان جو محبت آمیز روابط تھے ان سے

ان دونوں بزرگوں کے ملنے والے بانجیر ہیں۔

مجھے مولانا احمد علی مرحوم کی زندگی میں اکثر مسجد شیر انوالہ میں جمعہ پڑھنے کا موقع ملا ہے۔ ایک بار مولانا احمد علی مرحوم جمعۃ المبارک کا خطبہ ارشاد فرما رہے تھے کہ عورتوں کی صفوں سے کچھ شور سانسائی دیا۔ مولانا نے شور کا سبب معلوم کرنا چاہا تو انہیں بتایا گیا کہ کوئی دو عورتیں حنفی اور وہابی کے سوال پر جھگڑ رہی ہیں۔ مولانا احمد علی مرحوم نے یہ بات سنی تو خطبہ ہی میں فرمانے لگے :

”اس قسم کی فضول باتوں پر عورتیں کیوں جھگڑتی ہیں؟ ہم مردوں میں تو کبھی اس قسم کا اختلاف نہیں ہوتا۔ میں ہمیشہ عید کی نماز مولانا داؤد غزنویؒ کی قیادت میں ادا کرتا ہوں۔“

مولانا احمد علیؒ کے ارادتمندوں نے کئی بار اُن سے اس خواہش کا اظہار کیا کہ وہ عید کی نماز الگ پڑھانے کا انتظام کریں، لیکن مولانا احمد علی مرحوم نے اپنی زندگی میں اس وضعداری میں کوئی فرق نہ آنے دیا اور آخری وقت تک عید کی نماز اقبال پارک لاہور میں مولانا داؤد غزنویؒ کی امامت ہی میں ادا فرماتے رہے۔

جب مولانا احمد علی مرحوم انتقال فرما گئے تو مولانا داؤد غزنویؒ اپنی علالت اور نقاہت کے باوجود شیر انوالہ دروازہ سے یونیورسٹی گراؤنڈ تک جنازے کے ساتھ گئے اور مولانا احمد علی مرحوم کے اوصاف و محاسن یاد کر کے اُن کی وفات پر گہرے افسوس اور صدمے کا اظہار کرتے رہے۔ مولانا سید ابوالحسن علی ندوی ایک موقع پر پاکستان تشریف لائے اور لاہور میں بھی وارد فرمایا۔ مولانا داؤد غزنوی مرحوم نے دارالعلوم تقویۃ الاسلام کے طلبہ کی طرف سے انہیں مدعو فرمایا۔ اس موقع پر سید صاحب موصوف نے دیگر فرمودات کے علاوہ خود مولانا داؤد غزنویؒ اور خاندان غزنویہ کے دیگر بزرگوں کی دینی اور علمی خدمات کے بارے میں جو کچھ ارشاد فرمایا وہ حقیقتاً بہت بڑا اعترافِ عظمت ہے۔

مفتی محمد حسنؒ، مولانا احمد علیؒ اور سید ابوالحسن علی ندوی ایسے بزرگوں کے ساتھ مولانا داؤد غزنوی مرحوم کے تعلقات ان کی شخصیت کی جامعیت اور سہمہ گیری کا بہت بڑا ثبوت ہیں۔

آج سے چند سال پہلے جب پنجاب یونیورسٹی نے ”بین الاقوامی اسلامی مجلس مذاکرہ“ کا انتظام کیا تو اس موقع پر مولانا داؤد غزنوی مرحوم نے بعض مندوبین کو دارالعلوم تقویۃ الاسلام میں چائے کی دعوت دی اور اس موقع پر نہایت فصیح عربی میں خطبہ پیش فرمایا جسے معرف عرب عالم دین جناب مصطفیٰ الزرقا، اور دیگر مصری و شامی مندوبین مذاکرہ نے قدر و تحسین کی نگاہ سے دیکھا۔

کچھ عرصہ بعد جب مصر کے ڈاکٹر قنّام محکمہ اوقاف کے مشیر کی حیثیت سے لاہور آئے تو پروفیسر سید ابوبکر غزنوی صاحب نے اسلامیہ کالج (سول لائسنس) کی مجلس عربی و فارسی کی طرف سے اُن کو چائے کی دعوت دی۔ اس تقریب کی صدارت مولانا داؤد غزنویؒ نے فرمائی اور اس موقع پر بھی عربی میں نہایت شاندار خطبہ دیا۔

ڈاکٹر قنّام نے خطبہ سن کر مولانا مرحوم اور خاندان غزنویہ کی علمی اور دینی خدمات کا اعتراف نہایت زوردار الفاظ میں کیا۔ وہ اس موقع پر پروفیسر ابوبکر غزنوی صاحب کی عربی دانی اور زورِ خطابت پر بھی داد دیتے رہے۔

پاکستان کے معرض وجود میں آنے کے بعد جہاں اکثر کل ہند سطح کی دینی تنظیمیں ختم ہو گئیں یا اگر حالات کی دستبرد سے بچ رہیں، تو بہت حد تک کمزور ہو گئیں، وہاں جماعت اہلحدیث کو بھی اس اعتبار سے کافی نقصان کا سامنا کرنا پڑا۔ اس جماعت کے کئی علماء، کئی مدرسے اور کئی کتب خانے بھارت میں رہ گئے۔

یہ جماعت نہ جانے کب تک اسی حالت میں رہتی لیکن خدا نے اس جماعت

کی تنظیم نو کے عظیم مقصد کی بجا آوری کے لیے جس شخصیت کو منتخب کیا، وہ بھی مولانا سید داؤد غزنوی تھے۔ انہوں نے پاکستان میں جمعیت اہلحدیث کے نام سے اس جماعت کے والبنگن کو ایک نہج پر اکٹھے کیا اور توحید و سنت کے نظریہ عظیم کی اشاعت و تبلیغ کے لیے از سر نو کام کرنا شروع کر دیا۔ اس سلسلے میں کچھ ہی دیر بعد ایسی عظیم الشان کانفرنسوں کا اہتمام کیا گیا، جن کی مثالیں اس سے پہلے مفقود و معدوم تھیں۔

ایسے اجلاس مولانا کے ارادتمندوں اور عقیدت کیشوں کے لیے ان کی زیارت سے مستفید ہونے اور ان کے ارشادات سے رہنمائی حاصل کرنے کے لیے بہترین مواقع ہوتے تھے۔

راقم الحروف کو مولانا مرحوم کی ذات سے متعدد فائدے پہنچے ہیں جو مجھے زندگی کے ہر مقام پر ہمیشہ یاد رہیں گے اور کبھی فراموش نہیں ہو سکیں گے۔

۱۹۵۶ء میں مجھے ایم اے (دعویٰ) کا امتحان دینا تھا۔ نصاب میں کچھ کتابیں ایسی بھی شامل تھیں جو نہ بازار میں ملتی تھیں اور نہ لائبریریوں سے حاصل ہو سکتی تھیں۔ میں ایک روز مولانا کی خدمت میں حاضر ہوا اور میں نے برسبیل تذکرہ ان سے اپنی اس پریشانی کا ذکر کیا۔ مولانا نے فوراً مجھے اپنے ذاتی کتب خانے سے ایسی کتابیں مہیا فرما کر میری ذہنی پریشانی دور کر دی۔ اگر اس موقع پر مجھے وہ کتابیں حاصل نہ ہو سکتیں تو میں اپنے مذکورہ امتحان کے سلسلے میں خاطر خواہ تیاری نہیں کر سکتا تھا۔

۱۹۵۷ء میں میری چھوٹی ہمشیرہ کی شادی ہوئی۔ حسن اتفاق سے میری ہمشیرہ کے سسرال بھی مولانا مرحوم کے عقیدت مند اور ہم مسلک تھے۔ اس موقع پر میرے دل میں یہ خواہش پیدا ہوئی کہ اگر اس تقریب میں خطبہ نکاح مولانا پڑھ دیں، تو یہ ہمارے لیے بہت بڑی سعادت ہو سکتی ہے۔ مولانا سے عرض کیا گیا، تو مولانا ازراہ نوازش تشریف لے آئے اور انہوں نے نکاح کا خطبہ بھی ارشاد فرما دیا لیکن خطبے سے فارغ ہو کر فوراً تشریف لے جانے لگے۔ میں

نے عرض کیا: ”آپ کھانے سے فراغت کے بعد تشریف لے جائیے۔“ فرمانے لگے: ”مجھے صرف نکاح پڑھانے کے لیے کہا گیا تھا۔ اُس وقت کھانا کھانے کا ذکر نہیں آیا تھا، اس لیے میں گھر سے کھانا کھا آیا تھا۔“

اس جواب سے میں ایک طرف اپنی کوتاہی پر نادم ہوا اور دوسری طرف مولانا کی اس اصول پسندی پر ششدر رہ گیا۔

۱۹۶۰ء میں میری شادی کا موقع آیا تو میرے دل میں یہ خواہش شدت سے گھر گزنی کہ ایسا موقع تو زندگی میں عام طور پر ایک ہی بار آتا ہے، اگر میرا نکاح کسی اور نے پڑھایا تو میں ایک بہت بڑے اعزاز اور سعادت سے محروم رہ جاؤں گا۔ کیوں نہ اس بار بھی مولانا کو زحمت ہی بجائے اور اُن سے استدعا کی جائے۔

میں نے شادی سے ایک دو روز پیشتر اپنے محترم استاد پروفیسر سید ابو بکر غزنی صاحب سے کہا:

”آپ بڑے خوش نصیب ہیں کہ مولانا کے گھر میں پیدا ہوئے اور آپ کا نکاح انہوں نے پڑھایا۔ اے کاش! مجھے بھی یہ فخر حاصل ہو سکے اور زندگی کی یہ آرزو بھی پوری ہو جائے۔“

پروفیسر صاحب موصوف نے میرا اشتیاق دیکھا تو فرمایا:

”آپ کوئی فکر نہ کیجئے۔ آپ کا نکاح بھی وہی پڑھائیں گے۔ آپ مطمئن رہیے۔“

میری برات کے روز مولانا تشریف لائے اور مجھے یہ سعادت بھی نصیب ہو گئی۔

جس پر میں ساری زندگی فخر کر سکوں گا۔

مجھے کچھ دیر مولانا کے ساتھ ہفت روزہ ”الاعتصام“ کی ادارت کے سلسلے میں بھی کام کرنے کا موقع ملا ہے۔ میں اس واقعے کو بھی اپنے لیے باعث افتخار خیال کرتا رہوں گا۔

پروفیسر ابو بکر غزنی صاحب کی شادی کے موقع پر مولانا نے مجھے جو دعوت نامہ ارسال فرمایا وہ مولانا کے اپنے ہاتھ کا لکھا ہوا تھا۔ یہ دعوت نامہ میرے پاس محفوظ ہے اور انشاء اللہ

ان کی یاد کے طور پر ہمیشہ میرے پاس محفوظ رہے گا۔ مولانا نے اس موقع پر بہت کم لوگوں کو اپنے ہاتھ سے دعوت نامے لکھے تھے۔

مولانا اپنی وفاتِ حسرتِ آیات سے پہلے ایک طویل مدت تک شدید علالت میں مبتلا رہے۔ ایک موقع پر ہسپتال سے کچھ دنوں کے لیے اپنے گھر تشریف لے آئے تو میں عیادت کے لیے حاضر ہوا۔ اُن دنوں ڈاکٹروں نے انہیں عیادت کے لیے آنے والوں سے ملنے سے منع کر رکھا تھا۔ مولانا کو میرے آنے کی خبر ہوئی تو نقاہت کے باوجود بستر سے اُٹھ کر دوسری منزل کی منڈی تک آئے اور اپنے خادم محمد عمر کو آواز دے کر فرمایا:

”عمر! نیچے بزنی صاحب آئے ہیں۔ اُن سے کہو کہ میں پہلے سے بستر ہوں۔“

علالت اور نقاہت کے باوجود مولانا کی آواز اسی طرح بارعب اور گونج دار تھی۔

مذکورہ الفاظ میں نے اپنے کانوں سے سُنے اور مطمئن ہو کر واپس آیا۔

میں نے اس مختصر مضمون میں دانتہ فلفظ چند یادوں اور چند باتوں کا ذکر کیا ہے جن میں سے اکثر میری ذات سے متعلق ہیں۔ مولانا کے انتقال پر طلال کے بعد خاص طور پر علمی اور دینی حلقے ایک عظیم شخصیت سے محروم ہو چکے ہیں اور اُن کے عقیدہ مندوں کی متاق نگاہیں ہمیشہ ہمیشہ کے لیے اُن کی زیارت کے شرف سے محروم ہو چکی ہیں۔ مولانا کے علمی اور دینی مقام و فضیلت کا اندازہ کرنا اور اس کے بارے میں کچھ کہنا میرا منصب نہیں، اس سلسلے میں اُن کے بارے میں لکھنے والے علمائے کرام کے ارشادات اور اُن کی نگارشات سے استفادہ کرنا چاہیے۔

حضرت مولانا داؤد غزنویؒ

اور

حضرت مولانا مفتی محمد حسن صاحبؒ

کے باہمی تعلقات

صاحبزادہ حافظ عبدالرحمن صاحب

خلف الرشید

حضرت مولانا مفتی محمد حسن صاحبؒ

حضرت مفتی محمد حسن رحمۃ اللہ علیہ کے ساتھ حضرت والد علیہ الرحمہ کے گھر سے مراسم تھے اور یہ تعلقات للہیت اور روحانیت کی اساس پر قائم تھے۔
 آئندہ صفحات میں جو واقعات اور یادیں آپ ملاحظہ فرما رہے ہیں ان کی روایت حضرت مفتی صاحب کے صاحبزادہ مولانا حافظ عبدالرحمان صاحب نے کی ہے اور انہیں قلمبند عزیز محمد خالد بزئی صاحب نے کیا ہے۔ (مرتب)

حافظ عبدالرحمن صاحب نے فرمایا:

مولانا داؤد غزنویؒ جب بھی میرے والد مرحوم کے پاس تشریف لاتے تو عام طور پر ان دونوں بزرگوں میں گفتگو علمی ہی ہوا کرتی تھی۔

مفتی محمد حسن مرحوم ایسی مغللوں کے بعد فرمایا کرتے تھے کہ مولانا داؤد غزنویؒ جب بھی تشریف لاتے ہیں تو میرا جی چاہتا ہے کہ ہم دونوں کے درمیان علمی گفتگو ہوتی رہے۔ مفتی صاحب نے ایک موقع پر یہ بھی فرمایا کہ

”اللہ تعالیٰ نے مولانا داؤد غزنویؒ کو وہ فہم اور بصیرت عطا فرمائی ہے کہ ان کی گفتگو سے میری علمی پیاس بجھتی ہے۔“

اس موقع پر حافظ صاحب نے یہ بھی بتایا کہ حضرت مفتی محمد حسنؒ، حضرت مولانا داؤد غزنویؒ کے والد گرامی حضرت مولانا عبدالجبار غزنویؒ کے شاگرد تھے۔ مفتی صاحب ایک زمانے میں ہزارہ میں اپنے ایک اُستاد مولانا محمد معصوم صاحب سے پڑھتے تھے۔ کچھ عرصہ بعد حضرت مولانا عبدالجبار

غزنویؒ نے مولانا محمد معصوم کو مدرس کی حیثیت سے اپنے مدرسہ غزنویہ میں بلالیا مفتی صاحب اپنے پہلے استاد مولانا محمد معصوم کے ساتھ ہی اس مدرسے میں چلے آئے۔ یہاں انہیں مولانا عبد الجبار غزنویؒ سے پڑھنے کا موقع ملا اور انہوں نے دورہ حدیث کی تکمیل یہیں کی۔ یہاں مولانا داؤد غزنویؒ اور مفتی محمد حسن صاحب دونوں ہم درس تھے۔

حضرت مفتی محمد حسن فرماتے تھے :

”مولانا داؤد غزنویؒ ایک بہت بڑے ولی کے صاحبزادے ہیں اور خود بھی ولی ہیں گویا ولی ابن ولی ہیں۔“

مولانا داؤد غزنویؒ اور حضرت مفتی صاحب کے درمیان جو محبت تھی، وہ عشق کے درجے میں تھی مفتی صاحب نے ایک موقع پر کہا تھا :

”مولانا داؤد غزنویؒ کو نسبت باطنی حاصل ہے اور نسبت باطنی ایک دولتِ عظمیٰ ہے جو سخت مجاہدات اور ریاضتوں کے بعد ایک بندے کو اپنے اللہ سے حاصل ہوتی ہے۔“

حضرت مفتی محمد حسنؒ کی رائے میں مولانا داؤد غزنویؒ صاحبِ قال نہ تھے ، بلکہ صاحبِ حال تھے، وہ جب آفرت کے بارے میں گفتگو فرماتے تو لوگوں کو یوں محسوس ہوتا تھا گویا وہ جنت اور جہنم کا مشاہدہ کر کے باتیں کرتے ہیں۔

مولانا داؤد غزنویؒ اور مفتی محمد حسنؒ کی ملاقاتوں میں بعض اوقات مفتی محمد شفیع صاحب بھی شامل ہوتے تھے۔ مولانا داؤد غزنویؒ اور مفتی محمد شفیع صاحب کے درمیان بھی گہرے روابط تھے۔ مفتی محمد شفیع صاحب نے مولانا داؤد غزنویؒ اور مفتی محمد حسنؒ دونوں کی وفات کے بعد ایک محل میں فرمایا تھا۔ اب میرا کراچی سے لاہور آنے کو جی نہیں چاہتا کیونکہ مجھے مولانا داؤد غزنویؒ اور مفتی محمد حسنؒ نظر نہیں آتے اور میں ان دونوں کی علمی گفتگوؤں سے محظوظ نہیں ہو سکتا

مفتی محمد حسنؒ نے ایک بار مولانا عبدالجبار غزنویؒ کی ولایت کا ایک واقعہ سنایا۔ وہ واقعہ یوں تھا کہ امرتسر میں ایک محلہ تیلیاں تھا جس میں اہل حدیث حضرات کی اکثریت تھی۔ اس محلے کی مسجد اسی نسبت سے مسجد تیلیاں والی کہلاتی تھی۔ وہاں عبدالعلی نامی ایک مولوی امامت و خطابت کے فرائض انجام دیتے تھے۔ وہ مدرسہ غزنویہ میں مولانا عبدالجبار غزنویؒ سے پڑھا کرتے تھے ایک بار مولوی عبدالعلی نے کہا کہ ابو حنیفہ سے تو میں اچھا اور بڑا ہوں کیونکہ انہیں صرف سترہ حدیثیں یاد تھیں اور مجھے اُن سے کہیں زیادہ یاد ہیں۔

اس بات کی اطلاع مولانا عبدالجبار غزنویؒ کو پہنچی، وہ بزرگوں کا نہایت ادب و احترام کیا کرتے تھے۔ انہوں نے یہ بات سنی تو اُن کا چہرہ مبارک غصے سے سُرخ ہو گیا۔ انہوں نے حکم دیا کہ اس نالائق (عبدالعلی) کو مدرسے سے نکال دو۔ وہ طالب علم جب مدرسے سے نکالا گیا تو مولانا عبدالجبار غزنویؒ نے فرمایا:

”مجھے ایسا لگتا ہے کہ یہ شخص عنقریب مرتد ہو جائے گا۔“

مفتی محمد حسنؒ راوی ہیں کہ ایک ہفتہ نہ گزرا تھا کہ وہ شخص مرزا بن گیا اور لوگوں نے اُسے ذلیل کر کے مسجد سے نکال دیا۔

اس واقعہ کے بعد کسی نے امام صاحب مولانا عبدالجبار غزنویؒ سے سوال کیا:

”حضرت! آپ کو یہ کیسے علم ہو گیا تھا کہ وہ عنقریب کافر ہو جائے گا۔“

فرمانے لگے کہ جس وقت مجھے اس کی گستاخی کی اطلاع ملی، اُسی وقت بخاری شریف کی

یہ حدیث میرے سامنے آگئی کہ:

مَنْ عَادَى لِيْ وَوَلِيًّا فَقَدْ اَذْنَبَهُ بِالْحَرْبِ (حدیث قدسی)

(جس شخص نے میرے کسی دوست سے دشمنی کی تو میں اس کے خلاف اعلان جنگ

کرتا ہوں)

میری نظر میں امام ابو حنیفہؒ ولی اللہ تھے جب اللہ کی طرف سے اعلان جنگ ہو گیا، تو

جنگ میں ہر فریق دُوسرے کی اعلیٰ چیز کو چھینتا ہے۔ اللہ کی نظر میں ایمان سے اعلیٰ کوئی چیز نہیں، اس لیے اس شخص کے پاس ایمان کیسے رہ سکتا تھا۔

اپنے انتقال سے پیشتر مولانا داؤد غزنویؒ کافی عرصہ تک بیمار مضمحل اور کمزور رہے۔ وہ بعض اوقات اپنی کمزوری اور تقاہت کے باوجود مفتی محمد حسن صاحب سے ملاقات کے لیے جامعہ اشرفیہ تشریف لاتے۔ ان دنوں جامعہ نیلا گنبد کے پاس انارکلی بازار کی مول چند سڑکیں تھیں۔ مفتی صاحب چوتھی منزل پر مقیم تھے۔ مولانا داؤد غزنویؒ وہاں تشریف لاتے تو سڑکیاں پر ٹھہر کر چوتھی منزل تک پہنچتے اور بعض اوقات سڑکیوں میں رُک کر دم لیتے تھے، لیکن ملاقات کے معمول میں فرق نہ آنے دیتے تھے۔

میں مولانا داؤد غزنویؒ اور والدِ گرامی کی ملاقات کے وقت اکثر پاس ہوتا تھا کیونکہ چائے وغیرہ کا انتظام میرے ہی سپرد تھا۔ پھر جب مولانا داؤد غزنویؒ واپس تشریف لے جاتے تو ان کے لیے نانگے کا بندوبست بھی میری ذمہ داری تھی۔ اس خدمت اور مفتی صاحب سے نسبتِ فرزندگی کے باعث مولانا مجھ پر خاص شفقت فرمایا کرتے تھے۔

مولانا داؤد غزنویؒ ایک نیکو مزاج بزرگ تھے۔ ان کی گفتگو سے میرے والدِ گرامی بہت محفوظ ہوتے تھے۔ مجھے یاد ہے کہ ایک بار مولانا گفتگو کرتے کرتے کچھ دیر کے لیے رُکے، تو والد صاحب نے کہا:

پھر ذرا مُطرب اُسی انداز سے

جاگ اُٹھے مُردے تری آواز سے

یہ ان دنوں کی بات ہے جب ایک اپریشن میں مفتی صاحب کی ایک ٹانگ کٹ

چکی تھی۔ انہوں نے مولانا داؤد غزنویؒ کی گفتگو سے خوش ہو کر فرمایا:

”میں تو جمانی طور پر معذور ہوں، آپ کی باتوں سے میرے جسم میں زندگی آتی ہے۔“
 مولانا داؤد غزنویؒ اور والد صاحب میں زیادہ تر آخرت کی باتیں ہوتی تھیں ایسی ملاقاتوں
 میں اکثر میں نے انہیں روتے ہوئے دیکھا ہے۔

ایک دفعہ مولانا داؤد غزنویؒ والد صاحب کے پاس تشریف لائے۔ اُن کے سامنے
 چائے رکھی گئی۔ مولانا داؤد غزنویؒ نے کسی وجہ سے کچھ دیر توقف فرمایا تو والد صاحب نے کہا:
 ”آپ چائے پیتے کیوں نہیں؟“ پھر مُفتی صاحب نے کہا: ”دیکھیے میں نے یہ نہیں کہا
 کہ آپ چائے پیئیں۔ کیونکہ اس صورت میں مطلب یہ ہوتا کہ دراصل چیز تو میری ہے لیکن آپ
 حاصل کر سکتے ہیں اور پہلی صورت میں مفہوم یہ ہے کہ یہ چیز آپ ہی کا حصہ ہے پھر آپ استعمال
 کیوں نہیں کرتے؟
 اس نکتے پر مولانا داؤد غزنویؒ نے ذومعینین بات کہی۔ فرمایا: ”واہ مُفتی صاحب!
 یہ آپ ہی کا حصہ ہے۔“

ایک زمانے میں مولانا داؤد غزنویؒ حضرت مولانا اشرف علی تھانوی علیہ الرحمہ کی تفسیر
 نہایت شوق سے پڑھا کرتے تھے۔ اُن دنوں وہ جب کبھی مُفتی صاحب سے ملنے تشریف لاتے
 تو اُس تفسیر کے بارے میں اپنے خوشگوار تاثرات بیان فرماتے تھے۔ ایک روز فرمانے لگے
 کہ مولانا تھانویؒ کی تفسیر کے مطالعے کے دوران بعض اوقات میرا جی چاہتا ہے کہ میں اُن کا
 کوئی فقرہ یا لفظ بدل دوں لیکن آخر غرور و خوض کے بعد میں اس نتیجے پر پہنچتا ہوں کہ وہاں
 وہی فقرہ یا لفظ ٹھیک بیٹھتا ہے۔

یہ بات سُن کر مُفتی صاحب نے جواب میں کہا:
 ”یہ فہم بھی آپ ہی کو عطا ہوا ہے، یہ بھلا کس کس کو نصیب ہے۔“

مولانا غزنویؒ اور حضرت مفتی محمد حسن صاحبؒ کی ملاقاتوں کا مقصد زیادہ تر ایمان تازہ کرنا اور آخرت کی یاد دہانی۔

والد صاحب اکثر مولانا داؤد غزنویؒ کے بارے میں فرمایا کرتے تھے :

مجھے مولانا داؤد غزنویؒ کی بیباکی اور دلیری بہت پسند ہے۔ میرا جی چاہتا ہے کہ کوئی بات ہو تو میں اُن سے کہہ دوں اور وہ آگے لوگوں تک پہنچا دیں کیونکہ اُن کی تقریر کا انداز بہت واضح اور دل نشین ہے۔ بات اُن کے دل سے نکلتی ہے اور دلوں میں جاگزیں ہو جاتی ہے۔

مفتی صاحبؒ اور مولانا داؤد غزنویؒ دونوں میں اس قدر بے تکلفی تھی کہ وہ ایک دوسرے سے اپنی باتیں چھپاتے نہیں تھے۔ جب مفتی صاحبؒ کی ٹانگ پریشن کے ذریعے کاٹ دی گئی تو ایک روز مولانا داؤد غزنویؒ والد صاحب کی عیادت کے لیے ہسپتال میں تشریف لائے۔ وہاں مولانا سید سلیمان ندویؒ پہلے سے موجود تھے۔ انہوں نے مولانا داؤد غزنویؒ کو یہ واقعہ بتایا کہ مفتی صاحب نے اپریشن کے وقت بے ہوشی کا ٹیکہ لگانے سے انکار کر دیا تھا اور ڈاکٹروں سے کہا تھا کہ آپ لوگ اپنا کام کریں، میں اپنا کام کروں گا اور وہ کام یہ تھا کہ مفتی صاحب اس وقت اللہ کی یاد میں محو ہو گئے تھے۔

اس موقع پر مفتی صاحب نے بتایا کہ اپریشن کی رات بھی اُن کی نماز تہجد فوت نہیں ہوئی تو مولانا داؤد غزنویؒ یہ سن کر آبدیدہ ہو گئے۔

گزشتہ سال میری والدہ حج کے لیے تشریف لے گئیں۔ وہاں ایک روز زید بنہ منورہ میں ایک وظیفے کے سلسلے میں مولانا داؤد غزنویؒ کا ذکر اس طرح آیا کہ والدہ نے وہ وظیفہ پڑھا اور فرمایا: یہ وظیفہ تمہارے والد کو مولانا داؤد غزنویؒ نے بتایا تھا اور کہا تھا کہ صبح کی سنتوں اور دنوں کے درمیان یہ چالیس بار پڑھنا چاہیے۔ وہ وظیفہ یہ تھا:

يَا سَحِيُّ يَا قَيُّوْمُ لَا إِلَهَ إِلَّا أَنْتَ بِرَحْمَتِكَ أَسْتَغِيثُ -
 یہ واقعہ سن کر مجھے خیال آیا کہ مولانا داؤد غزنویؒ اور والد صاحب کے درمیان آکشر
 تبادلہ انکار کی جگہ تبادلہ اذکار بھی ہوا کرتا تھا۔

میرے والد صاحب نے ایک موقع پر مجھے یہ واقعہ سنایا کہ ایک دن مولانا داؤد غزنویؒ
 آئے اور کہنے لگے :

”میں درود شریف پڑھتا ہوں تو اس کی عظمت بڑھانے کے لیے کچھ اور
 کلمات اس میں شامل کرتا ہوں۔ سوچتا ہوں کہ یہ بے ادبی یا سنت کی
 خلاف ورزی تو نہیں؟“

یہ بات ہو رہی تھی کہ اچانک مولانا محمد ادریس کاندھلوی تشریف لے آئے۔ مفتی
 صاحب نے انہیں مخاطب کر کے کہا۔ آئیے مولانا! اس وقت آپ کی ضرورت پڑے گی۔
 پھر انہیں مولانا داؤد غزنویؒ کا سوال سنایا۔ مولانا ادریس صاحب نے کہا۔ اس میں کوئی اشکال
 نہیں اور قرآن کی اس آیت سے استنباط فرمایا کہ :

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا صَلُّوا عَلَيْهِ وَسَلِّمُوا تَسْلِيمًا

اس میں صَلُّوا اور سَلِّمُوا کے صیغے مطلق ہیں۔ اس اطلاق میں یہ خاص شکل
 بھی شامل ہے۔

مفتی صاحب نے یہ بات سنی تو فرمایا :
 ”جراک اللہ! آپ نے خوب جواب دیا۔“

مولانا داؤد غزنویؒ، مفتی محمد حسنؒ اور مولانا محمد ادریس کاندھلوی کبھی محفل میں یکجا ہونے
 تو گفتگو میں مزید تباہی پیدا ہو جاتی تھی۔

مولانا ادریس صاحب اپنے صنّفِ جہانی کے باعث دو سجدوں کے درمیان ذرا وقفہ کرتے ہیں۔ مولانا داؤدؒ ایک بار یہ صورت دیکھ کر فرمانے لگے:

”مولانا محمد ادریسؒ کا نذولِ قولاً حنفی ہے لیکن عملاً اہلحدیث ہیں۔“

مُفتی صاحبؒ نے اس بات سے محظوظ ہو کر کہا:

”کیوں نہ ہوں، حدیث کے اُستاد ہیں۔“

اس سے آپ ان بزرگوں کی بے تعصبی اور وسعتِ مسک کا اندازہ کر سکتے ہیں؛

والدِ مخترم کی وفات کے بعد ایک بار مولانا داؤد غزنویؒ کی علالت کی خبر آئی۔ میں اس خیال سے عیادت کو نہ جاسکا کہ بہت سے لوگ آتے ہوں گے اور مولانا کی استراحت میں خلل ہوگا۔ آخر ایک روز نہ سکا اور حاضر خدمت ہو گیا۔ مجھے دیکھ کر مولانا فرمانے لگے:

”آپ کے والد تو مجھ سے بڑی محبت کرتے تھے، آپ نے آنے میں اتنی دیر کر دی۔“

واقعاً ان دونوں بزرگوں کے رگ دریشہ میں ایک دوسرے کی محبت رچی ہوئی تھی۔ جب مولانا داؤد غزنویؒ مُفتی صاحبؒ سے ملنے تشریف لاتے تو مُفتی صاحبؒ کے چہرے پر خوشی کی لہر پھیل جاتی تھی، وہ الفاظ میں بیان نہیں کی جاسکتی۔

جب پاکستان کے ۳۳ علماء نے متفقہ طور پر اسلامی دستور کے نفاذ کے لیے ۲۲ نکات طے کیے، تو اجلاس کی صدارت مُفتی صاحبؒ کر رہے تھے۔ اس بات پر بحث ہو رہی تھی کہ الفاظ کیا ہوں:-

- قانونِ اسلام کے مطابق ہوگا یا
- قانونِ اسلام کے منافی نہیں ہوگا۔

مولانا ابوالاعلیٰ مودودی اور مولانا احتشام الحق عثمانوی بحث میں زیادہ حصہ لے رہے تھے کچھ دیر کے بعد مفتی صاحب نے مولانا داؤد غزنوی سے کہا:

”مولانا! آپ بھی تو کچھ فرمائیں نا۔“

اس سے آپ اندازہ کر سکتے ہیں کہ مفتی صاحب، مولانا داؤد غزنوی کی رائے کو کس قدر صائب اور ذریعہ سمجھتے تھے۔

ایک بار مولانا داؤد غزنوی میرے والد صاحب کے پاس بیٹھے تھے۔ باتوں باتوں میں انہوں نے آیام قید کا قصہ سنانے ہوئے کہا:

”مجھے جیل میں اتنی تکلیفیں پہنچیں کہ بعض اوقات میرا دم گھٹنے لگتا تھا۔ ایک بار جیل کی کوٹھڑی میں اس قدر جس تھا کہ اندر ہوا بالکل نہیں آرہی تھی اور میں دروازے کی دہلیز کے پاس ناک لگا کر باہر کی ہوا حاصل کرنے کی کوشش کرتا تھا۔“

یہ واقعہ سن کر مفتی صاحب بے چین ہو گئے اور کہنے لگے:

”مولانا! بس کیجیے، سننے کی ہمت نہیں۔“

پھر مفتی صاحب نے کہا۔ بزرگوں نے سچ کہا ہے:

الْعَطَايَا عَلَى مَثْنِ الْبَلَايَا
اور الْمَشَاهِدَةُ بِقَدْرِ الْمَجَاهِدَةِ

آپ کا موجودہ مقام اسلام کی خاطر انہی تکالیف کے باعث ہے۔

پھر مفتی صاحب نے کہا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ آپ اس شعر کے مصداق ہیں:

ابو رحمت ہے سراسر یہ بلاؤں کا ہجوم

صبر کراے دل! کہ اب فضلِ خدا ہونے کو ہے

اس کے بعد مفتی صاحب نے یہ دو شعر بھی پڑھے:

مصائب میں اُلجھ کر سکونا میری فطرت ہے
 مجھے ناکامیوں میں اشک برسانا نہیں آتا
 نگاہیں جن کی پڑ جاتی ہیں مستقبل کے چہرے پر
 انہیں ماضی کے افسانوں کو دہرانا نہیں آتا
 آپ ان مصائب کے مقابلے پر کیسے ڈٹے رہے! اللہ اکبر

مفتی محمد حسنؒ کا انتقال کراچی میں ہوا۔ اُن دنوں میرے دو بھائی عبید اللہ اور فضل الرحیم
 سچ کر کے کراچی آرہے تھے مفتی صاحب اسی خیال سے کراچی چلے گئے کہ دونوں کا استقبال
 بھی کر لیں گے اور دوستوں سے بھی مل لیں گے۔
 اس موقع پر مولانا داؤد غزنویؒ مفتی صاحب کو کراچی کے سفر سے روک رہے تھے۔
 ایک بار اُنہوں نے غصے سے کہا:

”مجھے اُس ڈاکٹر سے ملائیے جس نے آپ کو اجازت دی ہے“
 پھر جب مفتی صاحب بعض اعتراف کی خواہش پر سفر کے لیے روانہ ہو گئے تو لاہور کے
 ہوئی اڈے پر کھنکھنے لگے:

”سب لوگوں نے مجھے لاہور سے نکال دیا لیکن داؤد غزنوی نے نہیں۔ وہ

مجھے اب تک اجازت نہیں دے رہے ہیں۔“

اُس وقت کسی کو کیا خبر تھی کہ یہ سفر مفتی صاحب کا سفر آخرت ثابت ہو گا۔

ایک بار مولانا داؤد غزنویؒ مفتی صاحب سے کہنے لگے۔ میں نے بیان القرآن میں
 مولانا تھانویؒ کا ایک استنباط دیکھا جو مجھے بہت پسند آیا ہے۔ مذکورہ استنباط اس آیت کے
 ضمن میں تھا: وَمَا يَسْتَوِي الْأَعْمَىٰ وَالْبَصِيرُ وَلَا الظُّلُمَاتُ وَ

سورة فاطر

النور ولا الظل ولا الحرور

اُس روز بہت دیر تک دونوں میں زیادہ باتیں حضرت تھانویؒ ہی کے بارے میں ہوتی رہیں۔ اس موقع پر مولانا داؤدؒ کہنے لگے۔ مجھے حضرت تھانویؒ سے سنایت اُس ہے لیکن وہ امام ابن تیمیہؒ کے بارے میں بڑے سخت ہیں لیکن میں مؤخر الذکر کو اسلام کی شمشیر پہن سمجھتا ہوں۔“

مفتی صاحب نے یہ سن کر تبسم فرمایا۔

اُس نے دیکھا کہ مولانا داؤدؒ غزنویؒ کس قدر صاف گو تھے۔ وہ اختلاف کی بات بھی واضح طور پر کہہ دیتے تھے۔

ایک روز مولانا داؤدؒ غزنویؒ فرماتے لگے:

”میں جب ذکر الہی میں مشغول ہوتا ہوں تو کبھی جی چاہتا ہے کہ درود پڑھوں اور کبھی جی چاہتا ہے کہ بعض دوسرے اذکار میں سے کچھ پڑھوں۔ اس سلسلے میں نسب کیا ہے؟“

مفتی صاحب نے کہا: یہ سوال ایک بار میرے بھی دل میں پیدا ہوا تھا اور میں نے حضرت تھانویؒ کو لکھا کہ آپ نے مجھے جو وظیفہ بتایا تھا، اُس سے فراغت کے بعد کبھی میرا جی چاہتا ہے کہ فلاں ذکر کروں اور کبھی جی میں آتا ہے کہ فلاں ذکر کروں۔ اس سلسلے میں میری رہنمائی فرمائیے۔

حضرت تھانویؒ نے جواب میں لکھا:

یہ سب دسترخوانِ باطنی کے کھانے ہیں۔ جب ایک مینر پرہیز سے کھانے پڑے ہیں تو ان میں ترتیب قائم نہیں کی جاسکتی۔ ایسے ہی اوراد و اذکار میں بھی طبیعت کے مطابق عمل کیا جاسکتا ہے۔

مولانا داؤدؒ یہ بات سُن کر بولے :
 ”جَزَاءُ اللَّهِ ؛ آپ نے میرے دل سے بڑا بوجھ اتار دیا۔“

ایک روز مولانا داؤدؒ غزنویؒ والد صاحبؒ سے فرمانے لگے :
 مشکوٰۃ کی بہت سی شرحیں لکھی گئی ہیں۔ مجھے اس سلسلے میں مُلا علی قاری کی تہذیب
 بہت اچھی لگتی ہیں۔ مثلاً

فَضْلُ الْعَالِمِ عَلَى الْعَابِدِ كَفَضْلِي عَلَى أَدْنَاكُمْ

اس میں مُلا علی قاری نے یہ نکتہ پیدا فرمایا ہے کہ عالم کا جاہل سے مقابلہ نہیں کیا گیا بلکہ
 عابد کے ساتھ ہے کیونکہ فعلی عبادت کے مقابلے میں علم حاصل کرنے میں وقت لگانا افضل ہے۔
 مُفتی صاحبؒ یہ بات سُن کر بہت محظوظ ہوئے۔

مولانا داؤدؒ غزنویؒ علمی نکات سے لذت حاصل کرتے تھے۔ ایک بار کہنے لگے
 قرآن میں آیا ہے :

الْمَالُ وَالْبَنُونَ زِينَةُ الْحَيَاةِ الدُّنْيَا

اس میں مال کے ساتھ بنون (بیٹوں) کو دنیوی زندگی کی زینت کہا گیا ہے،
 بنات (بیٹیوں) کو نہیں کیونکہ وہ پردے کی چیز ہیں۔

ایک مرتبے پر مُفتی محمد حسنؒ صاحب نے مولانا داؤدؒ غزنویؒ کے بارے میں فرمایا :
 ”داؤدؒ غزنویؒ علم میں بے نظیر، عمل میں بے نظیر اور تواضع میں بھی بے نظیر
 ہیں۔ وہ ان اوصاف میں حدِ کمال تک پہنچے ہوئے ہیں۔“

ایک بار مولانا داؤد غزنوی تشریف لائے تو فرمانے لگے:
 ”مفتی صاحب! تصوف کے بارے میں کوئی اچھی کتاب بتائیے۔“
 مفتی صاحب نے کہا: آپ مولانا اشرف علی تھانویؒ کی کتاب ”تعلیم الدین“ دیکھیے۔
 مولانا داؤد نے بااثر سے کتاب منگوائی تو اس میں تصوف کا باب شامل نہیں تھا۔

اس پر مفتی صاحب نے انہیں اپنا نسخہ دے دیا اور فرمایا:
 ”میں سمجھتا ہوں کہ اصلی صوفی تو اہل حدیث کو ہونا چاہیے کیونکہ احادیث کی کتابوں
 میں حد، کینہ، کبر، غضب وغیرہ کے ابواب آتے ہیں جن میں ان بد عادات
 سے اجتناب کی تعلیم دی گئی ہے۔ اس کے برعکس فقہ کی کتب میں ایسے
 ابواب نہیں ہیں۔“

اس موقع پر مفتی صاحب نے مولانا کو مخاطب کر کے فرمایا:
 ”مولانا! آپ کو دیکھ کر میرا جی بہت خوش ہوتا ہے۔“

مجھے خود مولانا داؤد غزنویؒ سے دلی انس تھا۔ وہ جب بھی تشریف لاتے، میں نہایت
 دلچسپی سے ان کی باتیں سنا کرتا تھا اور میرا جی چاہتا تھا کہ مولانا یونہی تشریف فرما رہیں اور
 میں انہیں دیکھتا رہوں۔

مولانا سید اود غزنوی رحمۃ اللہ علیہ

مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی صاحب کی نظریہ میں

انٹرویو از: عابد نظامی

سوال : مولانا داؤد غزنوی علیہ الرحمہ سے آپ کی پہلی ملاقات کب اور کہاں ہوئی تھی ؟
 جواب : میرا اُن سے ابتدائی تعارف تحریکِ خلافت کے زمانے میں ہوا تھا، لیکن اب
 یہ یاد نہیں کہ وہ تعارف کب اور کہاں ہوا تھا۔ اُس وقت سے ہم دونوں ایک
 دوسرے کو جانتے تھے لیکن تقسیم سے قبل کچھ زیادہ میل جول کا اتفاق نہیں ہوا
 تھا کیونکہ میں دہلی یا حیدرآباد میں تھا اور وہ پنجاب میں تھے۔
 تقسیم کے بعد البتہ کچھ ملاقات بڑھی، لیکن زیادہ تر میں اپنے کاموں میں
 مشغول رہا اور وہ اپنے کاموں میں مصروف تھے۔ الّا یہ کہ کسی مجلس یا کمیٹی میں
 یکجا ہوتے ہوں۔

۱۹۵۱ء میں جب پاکستان کے تینتیس^{۳۳} علمائے اسلامی دستور کے بائیس
 نکات طے کیے، اُس مجلس میں ہم دونوں شریک تھے۔

۱۹۵۲ء میں خواجہ ناظم الدین کی دستوری ترمیم پر نظر ثانی کے لیے اُنہی علماء کا
 دوبارہ اجتماع ہوا تو ہم دونوں پھر شریکِ مجلس رہے۔

پھر ایوب صاحب کے فیملی لاز آرڈی نانس کے خلاف علماء نے جو تنقید کی
 تھی، اُس میں بھی ہم شریک رہے۔ جب ایوب صاحب نے دستوری سوالنامہ
 جاری کیا اور علماء کی طرف سے اُس کا مشترکہ جواب دیا گیا، تو اُس میں بھی میں

اور وہ برابر شریک رہے۔ اس طرح مسلسل بعض اہم مواقع پر مجھے اُن کے ساتھ شمولیت کا موقع حاصل رہا۔ باہم کم ملنے کے باوجود ہم خیالی کی وجہ سے ہمارے درمیان محبت اور اخلاص کے تعلقات تھے۔

سوال: آپ کو اُن کی شخصیت کا کونسا پہلو خاص طور پر سب سے زیادہ پسند تھا؟
جواب: اُن کی شخصیت کا یہ پہلو خصوصاً مستحسن تھا کہ وہ جب سے قومی زندگی میں نمایاں ہو کر آئے، انہوں نے ہمیشہ اسلام اور مسلمانوں کے لیے اخلاص کے ساتھ کام کیا۔ اُن کی زندگی میں کبھی دورنگی نہیں پائی گئی۔ میں چونکہ خود یک رنگ آدمی ہوں، اس لحاظ سے مجھے اُن کی یک رنگی زیادہ پسند تھی۔

سوال: اُن کی وسعتِ مشرب کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے؟
جواب: میں نے اُن کو کبھی تنگ نظر اور متعصب نہیں پایا۔ مسلمانوں کے ملی مسائل میں وہ کسی تعصب کے بغیر دوسرے مسلک کے لوگوں کے ساتھ تعاون کرتے تھے اور اپنا ایک مسلک رکھنے کے باوجود دوسرے مسلک کے لوگوں کے خلاف جنگ آزمانی کبھی اُن کا طریقہ نہیں رہا۔

سوال: مولانا کے علمی میلانات کے بارے میں آپ کی رائے؟
جواب: وہ بہر حال ایک عالم و فاضل آدمی تھے۔ اُن کے علم و فضل میں کسی شک و شبہ کی گنجائش نہیں۔ جو شخص اُن سے ملتا تھا، وہ اُن کے علم و فضیلت اور شرفیاء طرز سے متاثر ہوتا تھا۔

سوال: آپ دونوں کو جیل میں اکٹھے رہنے کا کوئی موقع تو نہیں ملا؟
جواب: نہیں ہم دونوں کبھی جیل میں اکٹھے نہیں رہے۔

سوال: سنا ہے کہ مدینہ منورہ میں آپ دونوں ایک ہی ہوٹل میں مقیم رہے۔ اس قیام و ملاقات کی کوئی تفصیل؟

جواب: مدینہ منورہ میں ملاقات کی صورت یہ تھی کہ وہ مدینہ یونیورسٹی کی کونسل کی میٹنگ میں شریک ہونے کے لیے وہاں گئے ہوئے تھے اور یہ اتفاق کی بات ہے کہ میں بھی وہاں گیا ہوا تھا۔ ہم دونوں وہاں ایک ہی ہوٹل "فندق النیسر" میں مقیم تھے۔ اس قیام کے دوران میں ایک روز یکا یک مجھے معلوم ہوا کہ انہیں ٹل کا دورہ پڑا ہے۔ میں یہ افسوسناک خبر سن کر فوراً اُن کے پاس گیا اور جو کچھ خدمت میرے بس میں تھی، وہ میں نے انجام دی اور جب تک انہیں افاقہ نہ ہو گیا، میں برابر اُن کے کمرے میں جاتا رہا۔

مولانا مودودی نے اس سوال کے جواب کے آخر میں فرمایا:

یہ بات میرے خیال میں قابل ذکر نہ تھی، مگر آپ نے پوچھا ہے، اس لیے میں نے ذکر کر دیا ورنہ یہ میرا اخلاقی فرض تھا۔

مولینا غزنوی کا حکیمانہ اندازِ تبلیغ

مولینا عبدالماجد دریا آبادی

مولینا محمد داؤد غزنوی مرحوم سے متعلق اخباروں میں غیر مسلموں کے کلمے ہوئے مضمون نظر سے گزرے کہ مرحوم جب جیل میں جاتے، تو ان کے فیض اثر سے دہریے میں خدا پرستی اور مُشرک میں توحید پیدا ہونے لگی اور وہ دونوں اسلام سے قریب تر ہو گئے۔ جب سے یہ پڑھا مولینا کی قدر و وقعت جو پہلے بھی کم نہ تھی، دل میں بہت زیادہ بڑھ گئی ہے۔

یہی معنی ہیں حکیمانہ تبلیغ کے ابوہریرہؓ جو پیش منظر سے کہیں بڑھ کر قیمتی ہے۔ یہی طریقہ تھا ہمارے پرنسپل بزرگانِ طریقت کا بلکہ خود صحابہ کرام کا کہ ان کی خود ایک خاموش و مؤثر وعظ کا کام دیتی تھی اور ”رٹے و آوازِ بہیر معجزہ مست“ کی عملی تفسیر ہوتی تھی۔

اس کے بعد اس میں شبہ کیا رہ جاتا ہے کہ وہ دین کے ایک ٹسے اور حقیقی خادم تھے۔
باقی جو کچھ کہنا تھا، صدق میں عرض کر چکا ہوں اور صاحبِ الاعتصام کی خدمت میں تعزیت نامہ خبر و فوات سنستے ہی لکھ دیا تھا۔

حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب کا مکتوب گرامی

خلیفہ اجل حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ

کر مفرمائے محترم مولانا سید ابوبکر غزنوی دام مجیدہ
السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ۔ گرامی نامہ سے مشرف درایا۔ تعمیلِ علم کے لیے چند
سطریں لکھی ہیں اور واقعہ یہ ہے کہ دل کا داعیہ بہت کچھ لکھنے کا تھا، مگر معذور ہو گیا
اسی کو قبول فرما کر ممنون فرمائیں۔ والسلام

بندہ محمد شفیع
۱۸/۴/۹۳

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

حضرت مولانا سید محمد داؤد غزنویؒ کی ذاتِ گرامی سے احقر کا تعارف تو بہت قدیم سے تھا۔
لیکن ۱۳۶۸ھ، ۱۹۴۸ء میں ہجرتِ پاکستان کے بعد سے مسلسل ملاقاتوں اور بہت سے دینی کاموں
میں رفاقت کا نثر اللہ تعالیٰ نے عطا فرمایا۔ مولانا کو قریب سے دیکھا۔ اُن کے جن علمی، عملی اخلاقی
فضائل و کمالات کا مشاہدہ ہوا، افسوس ہے کہ اپنی طویل علالت اور ضعفِ عمر کے سبب اب یہ ناکاروان
میں سے کوئی حصہ بھی لکھنے پر قادر نہیں۔

اس وقت صرف چند جملے لکھنے پر اکتفا کرنا ہوں کہ احقر نے حضرت مولانا سید محمد داؤد غزنویؒ
کو علمی کمالات کے علاوہ عملی اور اخلاقی کمالات سے بہت آراستہ پایا۔ وہ ایک باخدا بزرگ تھے۔
الہدیت ہونے کے باوجود ائمہ مجتہدین اور علماء اہل سنت کا احترام و عقیدت اُن کے قلب میں ان حضرت
کے مقصدین سے کم نہ تھا۔ حنفی علماء سے ردِ ابطال اور تعلقات بہت گہرے تھے۔ انہوں نے اپنے عمل
سے اجتہادی اختلافات کی حدود و لوگوں کو اچھی طرح بتلا دی تھیں۔ وظائف و نوافل کے پابند تھے۔
ایک مرتبہ فرمایا کہ حافظ ابن تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ کا معمول تھا کہ صبح کی نماز کے بعد چالیس مرتبہ یہ دعا پڑھا کرتے

تھے۔ یا حی یا قیوم لا الہ الا انت برحمتک استغیث اُصْبِحْ لِي شَأْنِي كُلَّهُ وَلَا
 تُكَلِّبْنِي إِلَى نَفْسِي طَرْفَةَ عَيْنٍ اور فرمایا کہ میرا بھی معمول ہے۔
 جب سے احقر نے اُن سے سنا تھا الحمد للہ احقر کا بھی معمول بن گیا۔ حضرت مولانا کا تذکرہ
 اور اتنی سی مختصر بات پر اکتفا کرنا پڑا، اس کا تلقین محسوس کر رہا ہوں۔
 دُعا کرتا ہوں کہ حق تعالیٰ حضرت مرحوم کو جنت کے درجاتِ عالیہ سے سرفراز فرمائیں
 اور اُن کے علوم اور دارالعلوم کو اُن کا صدقہ جاریہ بنادیں۔

بندہ محمد شفیع خادم دارالعلوم کراچی

۱۸ جمادی الثانیہ ۱۳۹۳ھ

سیدی وابی

ابوبکر غزنوی

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ
نَحْمَدُهٗ وَنُصَلِّیْ عَلٰی رَسُوْلِهِ الْکَرِیْمِ

حدیثے دکھن و افسانہ از افسانہ می خنیزد

دگر از سرگرمتم قصہ زلف پریشاں را

جی تو چاہتا تھا کہ حضرت والد علیہ الرحمہ کی باتیں اوروں سے سنوں اور خود خاموش رہوں مگر حبیب والد علیہ الرحمہ پر لکھے ہوئے تمام مضامین پڑھے تو محسوس کیا کہ یہ تو چند یادیں ہیں، چند تاثرات ہیں، چند نقوش ہیں، ان کی مرتب سوانح حیات تو نہیں ہے۔ میں نے محسوس کیا کہ کتاب ناقص اور ادھوری رہ جائے گی اگر والد علیہ الرحمہ کے حالات باضابطہ مرتب نہ کیے گئے اور ان کے دینی، فقہی اور علمی رجحانات کی وضاحت نہ کی گئی۔

حضرت والد علیہ الرحمہ کے ہفتہ وار رسالہ 'توحید' کی مکمل فائل اور 'الاعتصام' کی مکمل فائل اپنے کتب خانہ میں موجود ہے۔ پھر حضرت کی سینکڑوں صفحات پر مشتمل یادداشتیں، ان کے غیر مطبوعہ مقالے ان کی بیاض، ان کے روزنامے سب میرے پاس موجود ہیں۔ یہ تمام مواد بھی اس تخریب کا محرک ہوا۔ اخبارات و رسائل میں ان کے بارے میں بعض ایسے مضامین شائع ہوئے جو ساقط الاعتبار تھے۔ ان مضامین میں بعض غلط باتیں ان کی طرف منسوب کی گئی تھیں، ناگزیر معلوم ہوا کہ ان کے مستند حالات زندگی کو خود ضبط تحریر میں لاؤں۔

راقم مدقوں تفلیک کی وادیوں میں سرگرداں رہا اور تحقیق کی سنگلاخ راہوں سے گزر کر کج منزل کا سرائع بلا توبہ دیکھ کر حیرت ہوئی اور مرتت بھی کہ یہ تو وہی منزل ہے جس کی نشان دہی حضرت عبداللہ غزنوی رحمۃ اللہ علیہ نے کی تھی۔ میں حضرت یوسف علیہ السلام کی اقتداء میں پکاراٹھا

”وَاتَّبَعْتُ مِلَّةَ آبَائِي اِبْرَاهِيمَ وَاسْمٰحٰتِ وَيَعْقُوبَ“

مجھے اپنے آباؤ اجداد کا مسلک عزیز ہے اور اس کے پرچار کو بہت بڑی سعادت سمجھتا ہوں۔ اس مسلک میں اعتدال کا ایک حُسن ہے۔ یہاں بے داغ اور بے لچک توحید بھی ہے، ائمہ کرام اور اولیاءِ عظام کی غایت درجہ تعظیم و تکریم بھی ہے۔ یہاں صحابہ کرام سے بے پناہ محبت بھی ہے اور اہل بیت سے والہانہ عقیدت بھی، یہاں حدیث صحیحہ کو ائمہ کرام کے اقوال پر ترجیح دینے کا ذوق بھی ہے اور فقہائے کرام کی مساعیٰ جمیلہ کا حُسنِ اعتراف بھی، یہاں شریعت کے ظاہری احکام کا التزام بھی ہے اور تزکیہٴ نفس اور روحانیت کا شغف بھی۔

مجھے اس بات کی روحانی مسرت ہے کہ اس مقالے میں حضرت والد علیہ الرحمہ اور اپنے اسلاف کے عقائد و نظریات اجمالاً مرتب ہو گئے ہیں۔

حضرت الامام عبدالجبار غزنوی رحمۃ اللہ علیہ کے حصّے میں یہ سعادت آئی تھی کہ انہوں نے اپنے والد حضرت عبداللہ غزنوی رحمۃ اللہ علیہ کے حالات قلب بند کیے تھے۔ بارگاہِ رب العزت میں سر بسجود ہوں کہ اُس نے مجھے اپنے والد گرامی حضرت مولانا داؤد غزنوی رحمۃ اللہ علیہ کے حالات زندگی قلب بند کرنے کا شرف بخشا۔

عزیزم چودھری عبدالحمید صاحب نے اس تحریر کا مسودہ تیار کرنے میں میری بڑی مدد کی۔ اللہ تعالیٰ دونوں جانوں میں انہیں سر سبز کرے۔

ابوبکر غزنوی

۲۵ شوال المکرم ۱۳۹۴ھ

مطابق ۱۱ نومبر ۱۹۷۶ء

آبا واجداد

حضرت عبداللہ غزنویؒ
پیدائش اور نام و نسب
تعلیم
منازلِ سلوک
حضرت کا فیضان
دُنیا داروں سے گریز
اتباع و احمیائے سنت
تقدہار کے قاضی القضاة کی رائے
علماء سؤا و رحکام کی ایذا رسانی
جلا وطنی
نغرہ حق
مصائب میں استقامت
ظالم حکام کا انجام
شہر امرتسر میں
آپ کی اولاد
حضرت الامام عبدالجبار غزنویؒ

حضرت عبداللہ غزنوی رحمۃ اللہ علیہ

حضرت والد رحمۃ اللہ علیہ کے جبراً مجبوراً، تقویٰ اور علم دین میں کیتائے روزگار تھے۔ مولانا عبدالحی رحمۃ اللہ علیہ نے ”نزہۃ الخواطر“ میں حضرت عبداللہ غزنویؒ کے حالات قلب بند کرتے ہوئے اقتراح یہ لکھا ہے :

الشیخ الامام العالم المحدث عبد اللہ بن محمد بن محمد شریف الغزنوی
الشیخ محمد اعظم الزاهد المجاهد الساعی فی مرضاة اللہ المؤثر لرضوانہ
علی نفسه واهله وماله ووطنه صاحب المقامات الشہیرة والمعارج
العظيمة الکبيرة

حضرت عبداللہ بن محمد بن محمد شریف الغزنوی شیخ تھے، امام تھے، عالم تھے، زاہد تھے، مجاہد تھے۔ رضائے الہی کے حصول میں کوشاں تھے۔ اللہ کی رضا کے لیے اپنی جان، اپنا گھر بار، اپنا مال، اپنا وطن سب کچھ ٹاڈ دینے والے تھے۔ علماء سوء کے خلاف اُن کے معرکے مشہور ہیں۔

شیخ شمس الحق دیاؤی رحمۃ اللہ علیہ ”غایۃ المقصود“ کے مقدمے میں حضرت عبداللہ غزنویؒ کی مدح و توصیف میں یوں لکھتے ہیں :

انه كان في جميع احواله مستغرقاً في ذكر الله عز وجل حتى

له نزہة الخواطر وبجہۃ المسامع والنواظر“ صفحہ ۳۰۲ ج ۷۔

ان لحمه وعظامه واعصابه واشعاره وجميع بدنه كان متوجهاً
الى الله تعالى فانياً في ذكره عز وجل^۱

(وہ ہر وقت اور ہر حالت میں خدائے بزرگ و برتر کے ذکر میں ڈوبے
رہتے تھے۔ حتیٰ کہ اُن کا گوشت، اُن کی ہڈیاں، اُن کے پٹھے اور اُن کا
ہر ہر ذرہ اللہ کی طرف منوجہ تھا۔ اللہ عزوجل کے ذکر میں فنا ہو گئے تھے۔)
نواب صدیق حسن خان^۲ تقصیر من تذکار جمیود والاحرار^۳ میں حضرت عبداللہ غزنوی^۴
کے بارے میں فرماتے ہیں :

”چرخ اگر ہزار چرخ زندہ مشکل کہ چہیں ذات جامع کمالات بر روئے ظہور آرد
ہم محدث بود ہم محدث^۵“

(آسمان اگر ہزار بار بھی گردش کرے تو مشکل ہے کہ اب ایسی جامع کمالات
ہستی معرض وجود میں آئے۔ وہ محدث بھی تھے اور اللہ سے بمکالمی کا شرف
بھی انہیں حاصل تھا۔)

حضرت عبداللہ غزنوی^۶ کے فرزند حضرت الامام عبدالجبار غزنوی^۷ جو آپ کے
ساتھ دن رات سفر اور حضر میں رہے اور جنہیں آپ کو بہت قریب سے دیکھنے کا شرف
حاصل ہوا اُن کے بارے میں یوں رقمطراز ہیں :

عابد کثیر الذکر رجاء الى الله المتذل له الخاضع الخاضع الورع
المتضرع المنتبِع المتواضع المبتهل الحنيف المتبتل الى الله الكامل
البارع السليم المحدث المخاطب المخلص الصديق الكريم الجواد الاداه
الحليم المتوكل المنيب الصابر القانت لم تاخذه في الله لومة لائم قط^۸

^۱ بحوالہ نزہۃ الخواطر صفحہ ۳۰۳، ج ۷، ص ۷۰ - ۷۱ صفحہ ۱۹۲

^۲ مخطوطہ حضرت الامام سیّد عبدالجبار غزنوی^۹ صفحہ ۱

ہی بہتر ہے۔

امام صاحب لکھتے ہیں کہ عبداللہ نام آپ نے اس لیے رکھ لیا تھا کہ اس نام میں خدا کی الوہیت اور بندے کی عبودیت کا اظہار اور فوتی کا اقرار ہے۔

آپ کے جدِ اعظم محمد شریف رحمۃ اللہ علیہ ولی کامل تھے۔ ان کا نماز مرجع خلافت تھا۔ حضرت عبداللہ غزنوی رحمۃ اللہ علیہ کے والدِ بزرگوار اور جدِ امجد کا شمار بھی اولیاء و صلحاء امت میں ہوتا تھا۔ پس ہم کہہ سکتے ہیں کہ آپ کریم ابن الکریم ابن الکریم تھے۔ آپ اور آپ کے آبا و اجداد سب اقلیم فقر کے فرمانروا تھے۔ سب نشہ درویشی سے سرشار تھے اور مال و جاہ و دیوی سے یکسر بے نیاز تھے۔ ایک خط میں آپ لکھتے ہیں :

”صاحب! فقیر و فقیر زادہ ام و غریب زادہ عاجزی و گنہگاری کا راستہ و گوشہ نشینی و زلویہ گزینی شعار ما است“

حضرت الامام لکھتے ہیں :

”غزنی میں آپ کا خاندان مشہور سادات میں سے تھا، مگر جب آپ سے کوئی پوچھتا کہ کیا آپ سید ہیں؟ تو آپ فرماتے لوگ کہتے ہیں کہ ہم سید ہیں، لیکن عجم میں انساب کچھ ایسے خلط ملط ہو گئے ہیں کہ سیادت کا حال کچھ معلوم نہیں ہوتا۔“

آپ نے سید ہونے سے تو انکار نہیں کیا۔ ازراہ تواضع محض یہ کہا کہ عرب کے جب عجم میں سیادت منتقل ہوئی تو وہ کہاں تک خالص و بے آمیز رہی ہوگی۔

آپ بچپن میں غزنی کے علماء سے پڑھتے رہے۔ علوم متداولہ کی تحصیل آپ نے وہیں کی۔ آپ کی تیزی فہم اور سلامتی فکر پر لوگوں کو حیرت ہوتی تھی تفسیر حدیث سے آپ کو و امانہ شغف تھا۔ غزنی میں کوئی ایسا مقتدر عالم نہ تھا جس سے آپ کا علمی ذوق

تعلیم

۱۔ مکاتیب غیر مطبوعہ ۲۔ مخطوط

تسکین پاکستان کی مشکل مقام کے سمجھنے میں دقت ہوتی یا کسی دینی مسئلے میں اشکال پیدا ہوتا، تو غزنی کے علماء سے انہیں تسلی بخش جواب نہ ملتا۔ آپ فرماتے تھے مجھے اُن دنوں الامام ہوا کہ حضرت شیخ حبیب اللہ قندھاری رحمۃ اللہ علیہ سے رجوع کر دے۔ غزنی سے قندھار تک کاراستہ کافی طویل ہے اور اس زمانے میں تو سخت دشوار گزار بھی تھا۔

شیخ حبیب اللہ قندھاری رحمۃ اللہ علیہ کے چشمہ علم سے پیاس بجھانے کی خاطر آپ سفر کی ہمتیاں بھیلے ہوئے قندھار پہنچے۔ کچھ مدت اُن سے استفادہ کیا اور وطن لوٹ آئے۔ اس کے بعد جب کوئی مشکل مسئلہ پیش آتا آپ انہی کو لکھ بھیجتے۔ حضرت ایشخ کا جواب ہمیشہ محققانہ ہوتا۔ کچھ مدت کے بعد آپ نے ایک بار پھر قندھار کا سفر کیا اور بعض اشکالات کے حل کے لیے اپنے شیخ کے پاس حاضر ہوئے۔ حضرت ایشخ کو تعجب ہوتا کہ شخص محض چند مسائل پوچھنے کے لیے اتنی لمبی مسافت طے کرتا ہے۔ حضرت ایشخ علماء کی بھری محفل میں فوایا کرتے:

”مسائل دینیہ را چنانکہ این شخص می فهمد من خود نمی فهمم“

(دینی مسائل کو جس طرح یہ شخص سمجھتا ہے میں بھی نہیں سمجھتا ہوں)

دوسری بار جب آپ حضرت ایشخ سے رخصت ہونے لگے تو حضرت ایشخ نے آپ سے فرمایا: قندھار آپ کے شہر سے بہت دور ہے اور آپ کو یہاں تک آنے میں سخت تکلیف اٹھانی پڑتی ہے۔ آپ یہ زحمت نہ فرمایا کیجیے۔

حضرت نے فرمایا: میرا نادین کی خاطر ہے اور سفر کی یہ صعوبتیں جو میں بھیلتا ہوں تو اپنی عاقبت سنوارنے کے لیے بھیلتا ہوں۔ حضرت ایشخ نے فرمایا: میں جانتا ہوں کہ خدا خود آپ کی تربیت کر رہا ہے۔ آپ کو میری ضرورت نہیں ہے۔ خدا آپ کو کبھی ضائع نہ کرے گا۔

۱۔ حضرت الامامؒ ۳۰ میاں صاحبؒ سے سید سلیمان ندویؒ نے ۱۹۳۲ء میں افغانستان کا سفر کیا تھا۔

۲۔ انہوں نے بھی اپنے سفر نامہ میں اس راستے کی قرآنی کا ذکر کیا ہے۔ گئے مخطوطہ حضرت الامامؒ

اگر کبھی کوئی عقدہ پیش آیا تو مجھے یقین ہے کہ خدائے بزرگ و برتر کسی دیوار اور کسی درخت کو آپ کے لیے گویا کر دے گا۔ آپ فرمایا کرتے تھے:

”ربِّ ماجلِ شانہٗ موافقِ گفتہٗ شیخِ با منِ معاملہٗ کردہ است“

(میرے پروردگار نے شیخ کے ارشاد کے مطابق درو دیوار کو میرے لیے گویا کر دیا۔)

فرماتے تھے کہ جب میں الہام کی حقیقت نہیں سمجھتا تھا اور توحید کی معرفت پوری طرح مجھے حاصل نہ تھی، ایک بار میں اپنے دوا

منازلِ سلوک

محمد شریف رحمۃ اللہ علیہ کی قبر پر گیا جو اس علاقے میں مرجعِ خلافت ہے تو القا ہوا ”لا الہ غیرک“ اس وقت میں نے گمان کیا کہ یہ ورد مجھے وظیفہ کے لیے سکھایا گیا ہے۔ اب مجھے سمجھ آیا ہے کہ وہ اللہ کی طرف سے الہام تھا کہ میرے سوا کسی دوسرے کی طرح رجوع کرنا عبادت اور استعانت میں شرک ہے۔ ساری توجہ صرف اللہ ہی کی طرف کرنی چاہیے۔

بزرگوں کے مزاروں پر اس نیت سے جانا کہ میرا فلاں مطلب حاصل ہو جائے توجہ

میں رخصت ڈالتا ہے اور کلمہ شہادت کے منانی ہے۔

فرماتے تھے اگر کوئی خیال کرے کہ میں کسی نیک آدمی کی قبر پر اس لیے نہیں جاؤں گا

کہ ان سے کچھ مانگوں بلکہ اس لیے جاؤں گا کہ قبر بابرکت جگہ ہے، وہاں میری دُعا جلد قبول ہوگی تو یہ بھی شرعاً غلط ہے۔ عبادت کے لیے حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے مسجد مقرر کی ہے۔

مقبورہ عبادت کی جگہ نہیں ہے، جیسے حافظ ابن قیمؒ نے ”اغاثۃ التلمغان“ میں اس

کی وضاحت کی ہے۔ فرماتے تھے کہ بچپن میں مجھے اس بات کا بہت شوق تھا کہ جنگل میں

جا کر تنائی میں دُعا کروں۔ اس زمانے میں بعض اہل اللہ آپ سے فرماتے، تمہاری پیشانی میں ہم ایک نُور دیکھتے ہیں، دیکھو علمائے سوء کی صحبت میں رہ کر اپنے دل کو خراب نہ کر لینا اور

اے مخلوطہ حضرت الامام

تمام لوگ، کیا خواص، کیا عوام بچپن ہی میں اُن کی لُٹہیت اور پرہیزگاری پر حیرت زدہ تھے جب آپ جو ان مجوسے تو آپ کو عنایتِ ربّانی اور جُزْبِ غیبی نے پالیا اور اللہ کے سوا ہر چیز سے بیزار ہو گئے اور اپنے رب کی طرف ہمہ تن متوجہ ہو گئے۔ آپ نے خلوت اختیار کر لی اور لوگوں سے کنارہ کش ہو گئے۔ حضورِ دائمی اور پاسِ انفاس جو مرتبہ احسان سے عبارت ہے، لچکا ایک آپ کو عطا کیا گیا اور آپ مرجعِ خلافت ہو گئے۔

فرماتے تھے کچھ مبادی ہیں اور کچھ مقاصد ہیں۔ مبادی سے مراد مقاصد تک پہنچنے کے وسیلے اور واسطے ہیں۔ لوگ وسیلوں اور واسطوں کے ذریعے مقاصد کو حاصل کرتے ہیں مثلاً صوفیاء کے اشغال جو اُن کے مقرر کردہ لطائف سے متعلق ہیں، اخلاقی حمیدہ یعنی تواضع، توکل، دنیوی خواہشوں میں اختصار، قناعت، صبر، رضا، زہد، تقویٰ، رتبہ یا داد اور حضورِ دائمی کے حصول کے لیے وسائل ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے محض اپنے بے پایاں فضل سے اس حقیر کی تربیت کی ہے۔ اس فقیر کے دل میں اللہ تعالیٰ نے لطائف کے شعل کے بجائے ہی مقاصد کو دفن ڈال دیا اور تمام اوصافِ ذمیرہ کو اپنی بے انتہا رحمت سے میرے وجود سے کھینچ لیا اور احسان کا مرتبہ مجھے عطا کیا اور ماسوی اللہ کو میرے دل سے اُچک لیا اور حیثیت مجھ پر کشف ہو گئی کہ مرئی حقیقی اللہ کے سوا کوئی نہیں۔

ابتدائے سلوک میں آپ پر جذب اس قدر غالب تھا کہ مخلوق سے گریزاں تھے سب رشتہ داروں اور دوستوں سے الگ تھلک خواجہ ہلال پٹاڑ میں جہاں کسی شخص کی رہائش زحقی اقامت اختیار کرنی پس حسب ارشادِ نبوی کہ جب اللہ کسی بندے کو دوست بناتا ہے تو اس کے لیے اہل زمین کے جی میں قبولیت القاء کر دی جاتی ہے، لوگ اس جگہ بھی آپ کے پیچھے پہنچتے تھے۔ زلنے کے علماء اور فضلا آپ کے بارے میں حیرت زدہ تھے۔

بعض لوگ محض آپ کی صحبت میں بیٹھنے سے اور بعض حضرات آپ کی زیارت سے صاحبِ حال ہو گئے اور اُن پر رُوحانی

حضرت کا فیضان

کیفیات طاری ہو گئیں۔ حضرت کے لباس سے بھی استفادہ کرنے والوں کو فیض حاصل ہوا۔ ایک طالب علم محض پوسٹن اٹھانے سے وجہ میں آ گیا۔ اسی وجہ سے وہ طالب علم مرید پوسٹن کے نام سے مشہور ہوا۔

دُور دراز علاقوں سے علماء اور مشائخ آپ سے فیض حاصل کرنے کے لیے حاضر ہوتے اور حبیبُجنان اللہ اور لا الہ الا اللہ کا ورد کرتے تو جہادات بھی آپ کے ساتھ باؤز بلند بیع و بیل کرتے اور وجد و اضطراب میں آ جاتے۔

امیروں اور دُنیا داروں سے آخری دم تک گُریزاں رہے۔

دُنیا داروں سے گُریز

اُن کے انتہائی اصرار کے باوجود بھی اُن سے ملاقات نہ کرتے تھے اور اپنے بھجوں اور دوستوں کو ہمیشہ یہ نصیحت کرتے رہے کہ دُنیا داروں کی صحبت ستم قاتل ہے۔ اپنے رب کی طرف متوجہ رہو۔ اللہ تعالیٰ تمہیں ضائع نہ کریں گے۔ فرماتے تھے، الحمد للہ کہ اللہ تعالیٰ نے مجھے اُمراء اور دُنیا داروں سے عمر مجھ محفوظ رکھا۔ ابتدا میں تو حالت یہ تھی کہ امیر لوگ سیکڑوں رُپے خرچ کرتے کہ ایک بار میرا چہرہ دکھ لیس، لیکن میں انہیں ہرگز اجازت نہ دیتا تھا کہ وہ میرے گھر کے قریب بھی پھیلکیں۔

افغانستان میں اس وقت عوام اور خواص بدعات

اتباع و احیائے سنت

اور مشرکانہ رسوم میں مبتلا تھے حتیٰ کہ علماء اور مشائخ بھی بدعات اور رسوم کو دین سمجھتے تھے۔ آپ کو اللہ تعالیٰ کی جانب سے کبھی الامام کے ذریعے اور کبھی خواب میں ان بدعات سے سخت رد کا جانا اور کتاب و سنت کی ترغیب دی جاتی۔ آپ حیران تھے کہ اس ملک میں جہاں علوم کتاب و سنت کا نام و نشان تک نہیں اور نہ کتاب سنت کا مواد موجود ہے یہ کام مجھ سے کیونکر سرانجام پائے گا؟ جب آپ کو یہ خیال آتا تو آپ کو الامام ہوتا "سَيَسِّرُكَ لِلْيُسْرَى" بس آپ نے اتباع سنت پر کمر باندھی اور بدعتوں اور مشرکانہ رسوم کے خلاف آواز بلند کی اور علوم کتاب و سنت کی طرف متوجہ ہوئے۔ چونکہ

اللہ عزوجل آپ کی تربیت کرنے والے تھے، عرب و عجم سے حدیث و تفسیر کی کتابیں آپ تک پہنچنے لگیں۔ آپ نے تیزی فہم، فکر سلیم اور تائید الہی کی بنا پر محدثین کا مسک اختیار کیا۔ جب آپ مولانا حبیب اللہ قندھاری سے علمی اور روحانی استفادہ کرنے کے لیے قندھار تشریف لے گئے تو قندھار کے قاضی اور علماء آپ کو دیکھ کر بہت خوش ہوئے مگر ملاکٹہ نے آپ سے دشمنی کی اور آپ کی مخالفت کے درپے ہوا۔

قندھار کے قاضی القضاة قاضی غلام نے ملا
سعد الدین مقری کو ایک خط لکھا جس میں

قندھار کے قاضی القضاة کی رائے

ملاکٹہ کی شکایت کی اور حضرت عبداللہ عزفویؒ کے اوصافِ حمیدہ کا یوں ذکر کیا:

”حقائق و معارف آگاہ موفقی من عند اللہ قائد الخلق ابی صراط اللہ محی السنہ و قاصح

البدعت میاں محمد اعظمؒ کے حق میں یہ کتنا بجا اور درست ہے:

”مملوؤ بالسنة من الفرق الی المقدم

(یہ انسان سر سے پاؤں تک سنت میں ڈوبا ہوا ہے۔)

انہوں نے بیروسلوک باطن میں نسبت اویسی حاصل کرنے کے بعد محض اللہ تعالیٰ کی عنایت سے طریقہ نقشبندیہ میں قدم رکھا اور اس طریقہ کے بیروسلوک کی تکمیل کی اور اس میں مجاز ہوئے۔ اس کے بعد سید آدم بنوری قدس اللہ سرہ کے طریق کا بھی اکتساب کیا اور سلسلہ بنوریہ میں بھی مجاز ہوئے، مختصر یہ کہ میاں محمد اعظم کا ظاہر تقویٰ اور شریعت مصطفویٰ کے زیور سے آراستہ ہے اور ان کا باطن اہل صفا کے احوال و مقامات سے مزین ہے۔ میاں محمد اعظم میں نقص صرف یہی ہے کہ اپنے آپ کو ملاکٹہ کے محبتیں و مخلصین میں شمار نہیں کرتے۔

ملاکٹہ بزرگوار صاحب جزا و صاحب کرمی و باہمی کتاب ہے اور کبھی بدعتی کہہ کر پکارتا ہے بلکہ بعض قابل اعتماد لوگوں سے سنا ہے کہ ملاکٹہ نے غلبائی کے آس پاس کے علاقوں میں ان کے خلاف نفرت اور عداوت پھیلانے کے لیے خطوط بھی ارسال کیے۔

لے مخطوط حضرت الامامؒ مد ۱۱

علماءِ سوا اور حکام کی ایذا رسانی

حبیب آپ نے خواص توجیہ اور اتباعِ سنت کی طرف لوگوں کو دعوت دی اور بدعات اور

مشرکانہ رسوم کے خلاف آواز اٹھائی تو خواص دعوام میں سے بہت سے لوگ، علماء اور حکام جو آپ کے ارادہ مند تھے، آپ کے مخالف ہو گئے اور ایذا رسانی کے درپے ہوئے۔ اس علاقے کے علماء آپ کے ساتھ عمل بالحدیث خلاف مذہب کے مسئلہ پر مباحثہ کرنے کے لیے اکٹھے ہو گئے۔ آپ کی کرامتوں میں سے ایک کرامت تھی کہ ان تمام علماء نے اعتراف کر لیا کہ وہ غلطی پر ہیں اور مان لیا کہ آپ سخی پر ہیں حالانکہ مقابلے کے وقت ایسا اقرار علماء کے لیے بہت مشکل ہوتا ہے۔ دوسرے علاقوں کے علماء نے یہ ماجرا سنا تو وہ بھی ایسے خائف ہوئے کہ حضرت کے ساتھ گفتگو اور مباحثے کے لیے تیار نہ ہوئے۔ انہوں نے شکر اٹھا کیا اور جنگ کا ارادہ کیا، مگر چونکہ آپ کے پیروءِ محبتین اور معتقدین بھی بہت تھے، مخالفین آپ کا کچھ نہ بگاڑ سکے۔ ناچار حکام وقت کے پاس انہوں نے شکایت کی اور زرنگارنگ کے خبردار بہتان ان پر باندھے اور بعض سرداروں کی وساطت سے امیر دوست محمد خاں کے کان میں یہ بات ڈال دی کہ اس شخص کو اگر ایک سال یونہی سہلت دی گئی تو تمہاری باہنناہت کو برباد کرے گا اور نظامِ حکومت میں خلل ڈال دے گا۔ تمام امراء، وزراء اور عہدیدار اس شخص کے معتقد اور مرید ہیں۔

آپ کے بعض احباب نے آپ کو مشورہ دیا کہ مصلحت اسی میں ہے کہ امیر دوست محمد خاں کے طلب کرنے سے پہلے ہی ہم کابل چلے جائیں اور حقیقتِ حال سے امیر کو آگاہ کر دیں۔ حضرت کی مرضی تو نہ تھی مگر احباب کے پاس خاطر سے کابل روانہ ہوئے اور امیر دوست محمد خاں سے ملاقات کی۔ مخالف علماء بھی آگئے۔ ان علماء میں خان ملاذرائی، ملا مشکی اندری اور ملا فضل اللہ لومانی بھی شامل تھے۔ ان کے علاوہ سینکڑوں ملا اکٹھے ہو گئے۔ ان کے درمیان خفیہ صلاح مشورے کے بعد یہ طے پایا کہ اگر علمی مناظرہ اور فقہی مباحثہ ہوا تو

ہم کبھی اس پر غالب نہ آسکیں گے۔ اس کے سوا کوئی تدبیر نہیں کہ اس کے خلاف جھوٹی گواہی دی جائے اگر بحث تک فرسٹ پیجی، تو ہم سب کو شرمندگی اور خجالت اٹھانی پڑے گی۔ حضرت کے مخالفین نے امیر سے کہا کہ اس شخص کے ساتھ ہم کوئی گفتگو اور مناظرہ نہیں کریں گے۔ ہم گواہوں کے ذریعے ثابت کریں گے کہ یہ شخص ایسے کلمات بولتا ہے جس سے اس کے کافر اور مرتد ہونے میں کوئی شک و شبہ باقی نہیں رہتا۔ جھوٹے گواہوں نے گواہی دی کہ یتیم حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کا منکوس ہے، شفاعت کا منکوس ہے اور خود نبوت کا مدعی ہے۔ امیر سجد تو گیا کہ یہ سب جھوٹ ہے مگر اس ڈر کے مارے کہ یہ علماء ملک میں فساد اور ہنگامہ برپا کریں گے، کہنے لگا مصلحت یہی معلوم ہوتی ہے کہ آپ اس ملک سے چلے جائیں اور کابل سے آپ کو نکال دیا۔ آپ کے سب پیرو اور احباب آپ کی جدائی پر گریہ و زاری کر رہے تھے، مگر آپ کو کچھ بھی اضطراب نہ تھا اور فرمایا کہ یہ جلاوطنی، اہل و عیال سے جدائی جب آقا کی راہ میں ہے اور رب الارباب کی رضا جوئی کے لیے ہے تو پھر کیا پرواہ ہے۔

پس امیر دوست محمد خاں نے آپ کو جلاوطن کر دیا اور آپ ملک سوات، وہاں سے کوٹھ اور پھر ہزارہ تشریف لے گئے اور ایک

جلاوطنی

دُنیا اس سفر میں آپ سے فیضیاب ہوئی اور ہزارہ سے آپ حضرت میاں نذیر حسین صاحب محدث سے فیضیاب ہونے کے لیے دہلی پہنچے اور کتب احادیث کی سندان سے حاصل کی۔ جب آپ سدلے کر وٹے تو یہی دور تھا جب ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی برپا ہوئی تھی اور دہلی میں قتل و غارت کا بازار گرم تھا۔ آپ دہلی سے پنجاب تشریف لائے اور لوگوں کو اللہ کے راستے کی طرف بلانا شروع کیا۔ کتاب و سنت پر عمل پیرا ہونے کی ترغیب دینے لگے۔ کچھ عرصہ پنجاب میں قیام فرمانے کے بعد برائے ڈیرہ اسماعیل خاں اپنے وطن واپس تشریف لے گئے۔ اُن کا خیال تھا کہ اتنی مدت گزر گئی ہے، امیر دوست محمد خاں کا خیال اب تک بدل چکا ہوگا۔ ابھی وطن میں ایک مہینہ ہی قیام ہوا ہوگا کہ یکایک امیر دوست محمد خاں کے سوار

آپ کے اخراج کا پروانہ لے کر پہنچے۔ آپ ملکِ ناوہ چلے گئے اور وہاں اقامت فرمائی۔ امیر دوست محمد خاں نے آپ کو وہاں سے بھی نکالنے کا حکم بھیج دیا اور آپ کو اہل و عیال سمیت یانیکا کے پہاڑوں میں سکونت پذیر ہونا پڑا۔ اس تمام عرصے میں آپ کے عزم و تہمت اور صبرِ استقامت کا دامن کبیرے داغ رہا۔

حبیبِ ناوہ کے علماء، سود کو معلوم ہوا کہ حضرت عبداللہ غزنوی رحمۃ اللہ علیہ یا غسان کے پہاڑی علاقے میں بے یار و مددگار پڑے ہیں تو سیکڑوں آدمیوں کو ساتھ لے کر آپ پر حملہ آور ہوئے، آپ کے گھروں کو جلا دیا اور آپ کے بعض مریدوں کو زخمی کر دیا، مگر آپ اور آپ کے اہل و عیال کی اللہ تعالیٰ نے ایسی حفاظت کی کہ وہ سب اپنے دشمنوں سے سلامت نکل آئے۔ آپ کے فرزند ارجمند حضرت عبدالجبار غزنوی رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں :

”سبحان اللہ دریں امتحانات و جلا وطنی و دشمنی تمام عالم چنان مرفہ الحال و خوش عیش می ماند کہ بیچ امیری اطیب عیش از دندیدیم گو یا از عیبِ نعم گوناگون بر سرش می بارید کلامِ نعتے بود کہ ”ساں کو ہما پیشش نمیرسید“

(سبحان اللہ! ان آزمائشوں کے دور میں اور جلا وطنی اور تمام جہان کی دشمنی کے زمانے میں وہ اس قدر خوشحال تھے کہ کسی امیر کو میں نے آپ سے بڑھ کر خوشحال نہیں دیکھا۔ گویا عیب سے رنگارنگ کی نعمتیں آپ کے سر پر بہتی تھیں۔ وہ کونسی نعمت تھی جو ان پہاڑوں میں آپ کے پاس نہیں پہنچی تھی)

انہی دنوں امیر دوست محمد خان نے شہرِ وطن کو واپسی اور دوبارہ جلا وطنی

ہرات میں وفات پائی۔ آپ پھر اپنے وطن واپس چلے گئے جہاں کے اکثر باشندے آپ کے عقیدت مند تھے۔ امیر شیر علی خاں ملک کا امیر ہوا۔ علماء، سود نے امیر شیر علی خاں کو بھی آپ کے خلاف بھڑکایا۔ آپ امرایکی ملاقات سے

بہت متفرق تھے۔ اس قدر آزمائشوں میں بھی آپ کسی امیر کے پاس نہ گئے۔ آپ نے امیر شیر علی خاں کے نام ایک خط میں لکھا کہ میں مظلوم ہوں اور حاسدوں نے مجھ پر جھوٹی تمہتیں باندھی ہیں۔ تمہارے باپ نے مجھے ملک بدر کیا تھا۔ تم اس بارے میں اپنے باپ کی پیڑھی نہ کرنا۔ اس نے جواب میں لکھا کہ میں تمام رعایا کے خلاف ایک شخص کی رعایت نہیں کر سکتا۔ تم فوری طور پر ہمارے ملک سے باہر ہو جاؤ۔ اخراج کا حکم نامہ بجا لیکر ملنے پر آپ حیران تھے کہ کس طرف جائیں جینگل کی ایک غار میں جا کر چھپ گئے اور کچھ مدت وہیں پوشیدہ رہے۔ اسی دنوں آپ کو الہام ہوا:

”فقطع دابر القوم الذين ظلموا والحمد لله رب العالمين“
 (پس جن لوگوں نے ظلم ڈھایا تھا ان کی جڑ کاٹ دی گئی ہے اور حمد و ستائش اللہ ہی کے لیے ہے جو تمام جہانوں کا پروردگار ہے)

اسی زمانے میں امیر شیر علی خاں کا تختہ الٹ دیا گیا۔ وہ ذلیل و نامراد ہوا اور اس نے بہرات میں جا کر پناہ لی۔ پھر محمد افضل خاں امارت کے عہدے پر فائز ہوا۔ علماء و سونے پھروہی جھوٹی تمہتیں آپ پر باندھیں۔ محمد افضل کو آپ کے خلاف اگسایا۔ آپ کسی حاکم کے پاس جانا پسند نہ فرماتے تھے۔ امیر محمد افضل خاں نے مقرر کے حاکم کے نام خط لکھا کہ فلاں شخص کو گرفتار کر لو۔ سردار محمد عمر خاں نے اسی وقت ایک مسلح سواروں کا دستہ راتوں رات بھیج دیا جنہوں نے آدھی رات کے قریب آپ کے مکان کا احاطہ کر لیا۔ انہوں نے آپ کو گرفتار کر لیا اور آپ کو آپ کے سامان سمیت امیر دوست محمد خاں کے بیٹے سردار محمد عمر خاں کے پاس لے گئے۔ آپ کے فرزندوں میں سے اس وقت آپ کے ہمراہ مولانا محمد صاحب مولانا عبداللہ صاحب اور مولانا عبدالجبار صاحب رحمۃ اللہ علیہم اجمعین تھے۔ سب کو یقین تھا کہ آپ کو سخت سزا دی جائے گی، مگر سردار محمد عمر خاں آپ کا نورانی چہرہ دیکھتے ہی نرم پڑ گیا۔ بڑے ادب کے ساتھ کہنے لگا۔ آپ کیوں اس راستے کو چھوڑ نہیں دیتے۔ جو کچھ

وقت کے مولوی کرتے ہیں، آپ بھی اُن کے ساتھ شریک ہو جائیں مگر اُعر کے جرنیل نے کہا:
”بدست من بدہیتا بتوب پترائم“

(ا سے میرے حوالے کرو کہ میں اسے توب سے اُڑا دوں۔)

آپ نے جواب میں فرمایا کہ مجھ کو اللہ تعالیٰ کا حکم ہے کہ میں کتاب و سنت کو
جاری کروں۔ مجھے بارہا الام ہوئے ہے:

”یا عبدی هذا کتابی وھو لاء عبادی فاقرا کتابی علی عبادی“

(ا سے میرے بندے! یہ میری کتاب ہے اور یہ میرے بندے ہیں پس تو

میری کتاب میرے بندوں کو پڑھ کرنا۔)

اور یہ بھی الام ہوتا ہے:

”ولئن اتبعت اھواءھم بعد الذی جاءك من العلم مالک

من اللہ من ولی ولا نصیر“

(اگر تُو نے اُن کی خواہشوں کی پیروی کی، اُس علم کے بعد جو تیرے پاس

آچکا ہے، تو کوئی حامی اور مددگار تجھے اللہ کی سرزنش سے نہ بچا سکے گا۔)

آپ پر عجب کیفیت طاری تھی۔ پھر آپ نے یہ ایمان اندوز

کلمات کہے:

لغزہ حق

”قصد محکم دارم و عزم مصمم کہ تا جان در بدن دارم و سر بر تن در خدمت کتاب و سنت

بہ نہایت سرگرمی کو شتم۔ ایں چہ مصائب است کہ بر من می آید من از رب خود ہمیں میخواستم
کہ دریں راء کنگہ شکستہ و امعا و رود ہائے من در بیاباں بر سر لوتہ و خار افتادہ زانجا
بنولہ ہائے خود زند۔“

(میں قصد محکم اور عزم مصمم رکھتا ہوں کہ جب تک میرے بدن میں جان

باقی ہے اور میرے جسم پر سلامت ہے۔ کتاب و سنت کی خدمت نہایت گرم جوشی سے کروں۔ یہ کیا مصیبتیں ہیں جو مجھ پر آتی ہیں۔ میں تو اپنے آقا سے یہی آرزو کرتا ہوں کہ اس راتے میں میرے پُرزے اُڑا دیے جائیں اور میری اُتریاں جنگلوں کی خاردار جھاڑیوں پر پھینک دی جائیں اور کوئے اُن پر اپنی چونچیں ماریں)

آپ نے جوشِ ایمانی سے اور بھی ایسی باتیں کیں۔ تمام اہل مجلس، کیا جنیل اور کیا جاکم صوبہ سب رورہے تھے۔ سردار محمد عمر نے امیر افضل خاں اور اعظم خاں کے نام خط لکھا کہ آپ کے حکم کی تعمیل کرتے ہوئے میں نے اس شخص کو گرفتار کر لیا، مگر یہ شخص فقیر اور ولی اللہ ہے اور دنیوی اعتبار سے بالکل بے سرداماں ہے۔ بہ حال اپنے حکم سے مطلع فرمائیں۔ امیر افضل خاں اور اعظم خاں نے جواب میں لکھا کہ پوری احتیاط کے ساتھ کامل میں ہمارے پاس پہنچا دو۔ ملا منشی اور ملا نصر اللہ امیر افضل خاں اور اعظم خاں کے پاس گئے اور کہا کہ امیر دوست محمد خاں کے عہد میں ہم اس کا کفر ثابت کر چکے ہیں، اب دوبارہ تحقیق کی ضرورت نہیں ہے۔

سب نے متفق ہو کر قتل کا فتویٰ لکھا، مگر سرکاری مولویوں میں سے ملا منشی قدرے

مصائب میں استقامت

انصاف پسند تھا۔ اُس نے قتل کے فتوے پر دستخط نہ کیے۔ بڑی گفتگو کے بعد قتل کا فتویٰ واپس لیا گیا، لیکن علماء سوء کے فتوے کے مطابق آپ کو دُورے مارے گئے۔ آپ کے سر اور ڈاڑھی کو مونڈ دیا گیا۔ آپ کا چہرہ مبارک سیاہ کیا گیا اور آپ کو گدھے پر سوار کر کے شہر عجب میں گشت کرایا گیا۔ پھر آپ کو قید خانے میں ڈال دیا گیا۔

آپ کے ارادتمندوں میں سے ایک شخص آپ کے پاس قید خانے میں آکر اس واقعہ پر رونے لگا۔ فرمایا: تو کیوں روتا ہے، عزت اور ڈاڑھی کیا چیز ہے جو مولائی راہ میں اور اس

کی رضا کے لیے چلی گئی۔ شکر کرو کہ دین ہاتھ سے نہیں گیا۔ رونا تو مخالفین کو چاہیے کہ وہ دین سے ہاتھ دھو بیٹھے۔

دو سال اپنے بیٹوں کے ساتھ قید میں رہے۔ امیر افضل خاں، ۱ اکتوبر ۱۸۶۷ء کو بعارضہ وبامرگیا اور اس

ظالم حکام کا انجام

کے بعد امیر اعظم خاں تخت پر بیٹھا۔ اس نے اپنے عہد حکومت میں آپ کی جلاوطنی کے احکام صادر کیے اور آپ کو پیادہ پاپشا اور کی طرف نکال دیا گیا۔

حضرت الامام عبدالجبار غزنوی رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں:

”آپ کی جلاوطنی کے احکام صادر کیے ہوئے ابھی ایک ماہ بھی نہ گزرا تھا کہ اس کی حکومت کا تختہ الٹ گیا اور شکست کھا کر پہاڑوں میں سراسیمگی کی حالت میں حیران و سرگرداں پھرنے لگا۔ اس کے اہل و عیال جو عمر بھر کبھی گھر سے باہر نہیں نکلے تھے انہیں بھی جلاوطن کر دیا گیا۔“

”فلما آسفونا انتقمنا منهم“

(پھر جب انہوں نے ہمیں غصہ دلایا تو ہم نے ان سے انتقام لیا)

امیر دوست محمد خاں کے خاندان کو اللہ عزوجل نے اپنی قدرت کاملہ کے ساتھ ایسا پرآگندہ اور منتشر کیا، گویا: فجعلہم احادیث و مرقناہم کل ممزق۔“

(پس ہم نے انہیں افسانے بنا دیا اور ان کے پُرزے اڑا دیے) کے مصداق یہی ہیں۔

پشاور اور پنجاب میں نصاریٰ کے ہاتھوں میں قید و بند کی سختیاں جھیل رہے ہیں

اور ان میں سے بعض جنگلوں اور پہاڑوں میں پریشاں اور سرگرداں ہیں اور ایسا کیوں

نہ ہو۔ ہمارے رب کا ارشاد ہے:

”من عادى لى وليا فقد اذى لى بالحرب“

(جو میرے کسی دوست کے ساتھ دشمنی کرتا ہے، وہ حقیقت میں میرے

خلاف جنگ کا اعلان کرتا ہے، بالکل سچا ہے۔ ومن اصدق من اللہ قیلاً۔ اور اللہ سے زیادہ سچی بات کس کی ہو سکتی ہے۔“

پشاور میں کچھ مدت قیام فرمایا، پھر بعض احباب کی درخواست پر پنجاب کے شہر ام تسریں تشریف لے آئے اور کتاب و سنت کی تبلیغ و اشاعت میں دُوب گئے۔ توحید، اتباعِ سنت اور عقائدِ صحیحہ پر بہت سی کتابوں اور رسالوں کا فارسی اور اردو زبان میں ترجمہ کر داتے رہے اور عام لوگوں کے فائدے کے لیے چھپوا کر لٹہ تقسیم کرتے رہے۔

آخری عمر میں ضروری بات کے سوا کوئی بات نہ کرتے تھے۔ ہر وقت اللہ ہی کی طرف متوجہ رہتے تھے۔ تسبیح، تحمید اور دُعا کے سوا آپ کا کوئی دُوسرا شغل نہ رہا تھا یہاں تک کہ آپ ربیع الاول ۱۲۹۸ھ مطابق ۱۸۷۹ء میں آدھی رات کے وقت اپنے اللہ سے جا ملے اور زوال کے بعد ظہر کی نماز سے پہلے دفن کیے گئے۔ آپ کا مزار شہر ام تسریں دروازہ سلطان فٹڈ کے باہر عبدالصمد کاشمیری کے تالاب کے کنارے پر ہے۔ رَضِيَ اللهُ عَنْهُ وَارْضَاهُ وَجَعَلَ جَنَّةَ الْقُرُوسِ مَأْوَاهُ۔

آپ کی اولاد

آپ کے بارہ صاحبزادے اور پندرہ صاحبزادیاں تھیں۔ صاحبزادوں کے اسمائے گرامی حسب ذیل ہیں۔ حضرت مولانا محمد، حضرت مولانا عبداللہ، حضرت مولانا احمد، حضرت مولانا عبدالجبار، حضرت مولانا عبدالواحد، حضرت مولانا عبدالرحمن، حضرت مولانا عبدالستار، حضرت مولانا عبدالقیوم، حضرت مولانا عبدالعزیز، حضرت مولانا عبداللہ، حضرت مولانا عبدالقدوس، حضرت مولانا عبدالرحیم۔

لے حضرت عبداللہ غزنوی رحمۃ اللہ علیہ کے حالات میں جہاں کہیں حوالہ نہیں دیا گیا۔ وہ حضرت امام عبدالجبار غزنوی رحمۃ اللہ علیہ ہی کی روایت ہے اور مخطوطہ ہی سے اخذ کی گئی ہے۔

اللہ کا ان سب پر کرم تھا۔ سب محدث تھے اور علم دین اور فقر کی دولت سے مالا مال تھے۔ یہ مولانا محمد بن عبداللہ غزنویؒ نے تفسیر جامع البیان پر عربی میں حاشیہ لکھا جو میاں فیروز الدین مرحوم (ساکن جڑوں) نے چھپوایا اور کتاب مفت تقسیم ہوئی۔

مولانا محمد بن عبداللہ غزنویؒ کے صاحبزادے مولانا عبدالاولؒ اور مولانا عبدالغفورؒ تھے۔ مولانا عبدالاولؒ نے ”مشکوٰۃ المصابیح“ اور ”ریاض الصالحین“ کا اردو ترجمہ کیا اور حواشی لکھے۔

حضرت الامام عبدالجبار غزنوی رحمۃ اللہ علیہ

حضرت عبداللہ غزنوی رحمۃ اللہ علیہ کچھ اصل حق ہونے کے بعد ان کے بڑے صاحبزادے حضرت مولانا عبداللہ بن عبداللہ ان کے خلیفہ مقرر ہوئے۔ آپ مختصر عرصہ زندہ رہے۔ ان کی وفات کے بعد ان کے صاحبزادہ اور بندہ عاجز کے جد امجد حضرت الامام عبدالجبار غزنوی رحمۃ اللہ علیہ نے خلافت پر متمکن ہوئے۔

صاحب ”نزہۃ الخواطر“ ان کے بارے میں یوں رقمطراز ہیں :

” وہ ۱۲۶۸ھ میں غزنی میں پیدا ہوئے اور حضرت عبداللہ غزنویؒ سے مدتوں روحانی اور علمی فیض حاصل کیا۔ ابتدائی تعلیم اپنے بھائی مولانا محمدؒ اور مولانا احمدؒ سے حاصل کی۔ پھر آپ دہلی تشریف لے گئے اور میاں نذیر حسین صاحب محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ سے حدیث کی کتابوں کی سند حاصل کی۔ ان کی عمر میں برس بھی نہیں ہوئی تھی کہ وہ علوم متداولہ سے فارغ ہو چکے تھے۔ بہت ذہین تھے۔ مطالعہ بہت کرتے تھے۔ فہم و فراست سے انہیں حصہ وافر ملا تھا۔ امرتسر میں قرآن وحدیث کی تدریس کے شغل ہی میں منہمک رہتے تھے۔ دنیا و اہل دنیا سے الگ ٹھنک رہتے تھے۔ اللہ کی عبادت میں مصروف رہتے اور مخلوق کو اللہ کی طرف

لے تاریخ المحدثین صفحہ ۲۴۳ مولانا ابراہیم ساکنوٹی۔ لے ہندوستان میں اہلحدیث کی دینی خدمات صفحہ ۲۹

تالیف امام خان نوشہرویؒ سے ایضاً صفحہ ۲۶

بلانے میں مشغول رہتے۔ اللہ کا ذکر بڑی باتاعدگی اور کبیرونی سے کرتے اور ذکر کے دوران ان پر بڑی کیفیت، طاری ہوتی تھی۔ میں نے امرتسر میں ان کی کئی بار زیارت کی ہے۔ میں نے انہیں سلف صالحین کے مسلک پر پایا۔ وہ علمائے ربانی میں سے تھے۔ فتوے دیتے وقت وہ کسی معین فقہی مسلک کا التزام تو نہ کرتے تھے لیکن ائمہ مجتہدین سے سونے نکلنے نہ فرماتے تھے اور ان کا ذکر ہمیشہ اچھے الفاظ میں کرتے۔ جمعۃ الوداع، رمضان کے مہینہ ۱۳۳۱ھ میں وفات پائی۔

۱۔ نزہۃ الخواطر“ ج ۸ صفحہ ۱۹-۲۱۸

حالاتِ زندگی

پیدائش
تعلیم اور اساتذہ
حضرت عبداللہ غازی پوریؒ
تصنیفات
عملی زندگی کا آغاز
سیاسی زندگی
کانگریس سے استعفا
میدان صحافت میں
علمی مضامین
صحافیانہ نوک جھونک
توجید میں لکھنے والے
جماعت اہلحدیث کی تنظیم
چند اہم واقعات
تحریک ختم نبوت کی تحقیقاتی عدالت میں
مارشل لاء کے زمانہ میں آوازِ حق
آئین کشن کے سوالنامے کا جواب
یہ آئین نہ اسلامی ہے نہ جمہوری
مدینہ یونیورسٹی مشاورتی کونسل کی رکنیت

پیدائش

حضرت والد علیہ الرحمہ ۱۸۹۵ء میں بمقام امرتسر پیدا ہوئے۔
اُن کی ایک بیاض جسے وہ ”بیاضِ امرتسر“ کہتے تھے اُس کے پہلے صفحہ پر

ان کے ہاتھ سے لکھی ہوئی یہ عبارت ملی ہے :

”اس عاجز کی پیدائش کی تاریخ قطعی طور پر تو معلوم نہیں ہو سکی، لیکن حکیم عبدالشانی صاحب غزنوی کی تاریخ پیدائش جو میرنسپل کبیٹی امرتسر کے دفتر سے معلوم ہو سکی وہ ۲۳ جون ۱۸۹۶ء ہے۔ ان کی والدہ مرحومہ فرماتی تھیں کہ تم گیارہ ماہ حکیم عبدالشانی سے بڑے ہو۔ اس حساب سے میری پیدائش اگست ۱۸۹۵ء کے پہلے ہفتہ یا جولائی ۱۸۹۵ء کے آخری ہفتہ میں ہوئی ہے۔
والعالم عند اللہ۔“

عبد ربیعہ اسیر ذنبہ المفتقر الی رحمۃ مولاد

محمد داؤد الغزنوی

تعلیم اور اساتذہ

مجھے سنایا کرتے تھے :

”ابتدائی تعلیم میں نے حضرت والد صاحب و حضرت الامام عبدالجبار غزنویؒ اور مولانا عبدالاول صاحب غزنویؒ سے حاصل کی۔ مولانا گل محمدؒ سے اُردو اور حساب کی تعلیم حاصل کی۔“

جنین حضرت الامام عبد الجبار غزنوی رحمۃ اللہ علیہ نے مدرسہ غزنویہ میں مدرس رکھا ہوا تھا۔ وہ اپنی ان دنوں علوم دینیہ کا مرکز تھا۔ دل وہاں جانے کے لیے بیتاب تھا۔ حضرت والدہ کا اتنا رعب اور ہیبت تھی کہ ان سے اجازت لینے کی جرات نہ ہوئی۔ دہلی پہنچ کر حضرت والدہ کو خط لکھا اور دہلی میں قیام کی اجازت چاہی۔ حضرت والدہ کا اجازت نامہ آنے سے پہلے کچھ وقت مجھ پر ایسا بھی گزرا کہ میرے پاس روٹی کے لیے بھی پیسے نہ تھے۔ میں دن بھر بڑھتا اور دو دنوں وقت چنے چبا کر بسر اوقات کرتا۔“

آپ اس درسگاہ سے فیضیاب ہونے کے لیے مضطرب تھے جس سے حضرت عبد اللہ غزنوی اور حضرت الامام عبد الجبار غزنوی فیضیاب ہو چکے تھے اور یہ درسگاہ تھی حضرت میاں نذیر حسین صاحب محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ کی۔ آپ کو اساذالاساتذہ حضرت عبد اللہ غازی پوری رحمۃ اللہ علیہ سے علم حدیث پڑھنے کا شرف حاصل ہوا۔ علوم عقلی ہیں مولانا سیف الرحمن کابلی سے استفادہ کیا۔ وہ مدرسہ فتح پوری کے مشہور مدرس تھے اور حضرت مولانا محمود حسن رحمۃ اللہ علیہ کی تحریک کے خاص رکن تھے اور مولانا عبید اللہ سندھی اور مولانا آزاد سے مراسم رکھتے تھے۔

حضرت عبد اللہ غازی پوری رحمۃ اللہ علیہ

حضرت عبد اللہ غازی پوری رحمۃ اللہ علیہ کے حالات زندگی مختصر طور پر یہاں قلمبند کیے جاتے ہیں تاکہ اندازہ لگایا جاسکے کہ حضرت والد علیہ الرحمہ کن عظیم المرتبت اساتذہ سے فیضیاب ہوئے تھے حضرت میاں نذیر حسین صاحب رحمۃ اللہ علیہ فرمایا کرتے تھے:

”میرے درس میں دو عبد اللہ آئے ہیں، ایک عبد اللہ غزنوی اور دوسرے عبد اللہ غازی پوری۔“

لے۔ ترجمہ کلامے حدیث ہند“ تالیف امام ابوبیہی خاں صاحب نوشہروی صفحہ ۳۵۹

حضرت عبدالحی صاحب والدیامد حضرت میاں ابوالحسن علی صاحب ندوی نے اپنی کتاب "نزہۃ الخواطر" کی آٹھویں جلد میں جناب موصوف کے مختصر اور جامع حالات زندگی لکھے ہیں۔ حضرت مولانا عبدالحی حضرت مولانا عبداللہ غازی پوری کے معاصر ہیں۔ کتاب عربی میں ہے۔ اس کے علاوہ امام ابو یوسفی خاں صاحب نوشہروی نے "تراجم علمائے حدیث ہند" میں ان کے حالات خوش اسلوبی سے بیان کیے ہیں۔

آپ علومِ دینیہ کے بہتے ہوئے دریا تھے۔ ایک دُنیا آپ سے فیضیاب ہوئی آپ کے حلقہٴ درس سے بڑے بڑے اہل علم و فضل پیدا ہوئے۔ مولانا محمد سعید بنارسی جیسے فاضل آپ سے مستفید ہوئے۔ مولانا عبدالغفور حاجی پوری مظفر پوری اور حضرت شاہ غین الحق جیسے بزرگوں نے آپ سے استفادہ کیا۔ مولانا عبدالسلام مبارک پوری اور مولانا عبدالرحمن مبارک پوری صاحب تحفۃ الاخوذی نے آپ کے سامنے زانوئے تلمذ طے کیے۔

الشیخ الصالح علامہ عبداللہ، عبدالرحیم بن دانیال کے فرزند تھے۔ ۱۲۶۱ھ میں ضلع اعظم گڑھ میں مؤکے مقام پر پیدا ہوئے۔ آپ نے بارہ سال کی عمر میں قرآن حفظ کر لیا۔ فارسی اور عربی کی بعض درسی کتابیں مولوی قائم صاحب مودی سے ہی پڑھیں۔ یہ وہی زمانہ ہے جب ۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی برپا ہوئی تھی اور بہت سے لوگ بے خانماں ہوئے۔ آپ کے والدین نے اسی زمانے میں مسوچیپور گراہی پور میں سکونت اختیار کی۔ غازی پور کے مدرسہ "حشمتہ رحمت" میں تعلیم حاصل کرنے لگے۔ مولانا رحمت اللہ صاحب لکھنوی رحمۃ اللہ علیہ اور مفتی نعمت اللہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے درسی کتابوں کی تکمیل کی۔ پھر جوینپور تشریف لائے اور "مدرسہ امامیہ حنفیہ" سے مفتی یوسف بن محمد اصغر لکھنوی رحمۃ اللہ علیہ سے استفادہ کیا۔

مولانا عبداللہ غازی پوری رحمۃ اللہ علیہ خود فرماتے ہیں :

۱۔ "تراجم علمائے حدیث" صفحہ ۳۶۰ لے "نزہۃ الخواطر" جلد ۸ صفحہ ۲۸۷

۲۔ "نزہۃ الخواطر" ج ۸ صفحہ ۲۸۷

حقیقی معنوں میں فیضان اور رحمت کا سرچشمہ بن گیا جس سے طلباء اپنی تشنگی بجھانے کے لیے دُور دُور سے چل کر آتے رہے۔ آپ نے بدعات اور محدثات کے خلاف بڑی قوت سے آواز بلند کیا اور تمام وہ سنتیں جو مدفون اور مستور ہو چکی تھیں انہیں از سر نو زندہ کیا۔ اتباع سنت کے جُرم کی پاداش میں انہیں ایذائیں دی گئیں حتیٰ کہ انہیں اللہ کی خاطر غازی پور کو خیر باد کہنا پڑا اور مولانا عبدالعزیز صاحب اور مولانا محمد ابراہیم صاحب آروی کے اصرار پڑ مدرسہ احمدیہ آرہ کی قیادت منظور فرمائی۔ یہاں بیس سال تک یہ دولتِ علم ٹٹاتے رہے جس وقت مدرسہ احمدیہ آرہ کے بانی مولانا ابراہیم آروی رحلت فرما گئے تو مولانا عبداللہ غازی پوری رحمۃ اللہ علیہ کا قیام بھی آرہ میں نہ رہ سکا۔ دہلی والوں کی درخواست پر آپ دہلی چلے آئے اور ایک مدت تک لوگوں کو فیضیاب کیا۔ دہلی میں آٹھ سال قیام رہا۔ آپ کا معمول دہلی میں یہ تھا کہ صبح حوضِ والی مسجد (نئی سڑک) میں درسِ قرآن دیتے۔ ظہر تک "مدرسہ ریاض العلم" (نزد جامع مسجد) میں اور بعد ظہر مدرسہ علیجان (مقتل گھنٹہ گھر) میں پڑھاتے۔ جب لکھنؤ میں آپ کے عزیز خان بہادر فوت ہوئے تو ان کی تعزیت کے لیے آپ لکھنؤ تشریف لے گئے، مگر وہاں گھریلو معاملات میں ایسے الجھے کہ پھر دہلی نہ جاسکے لکھنؤ میں بھی اُن کا فیضان جاری رہا۔ ندوۃ العلماء کے بعض ممتاز طالب علم آپ سے پڑھنے آتے۔ اُن میں کچھ شامی طالب علم بھی تھے۔ یہ اُن کی زندگی کے آخری ایام تھے لکھنؤ ہی میں وفات پائی۔ اللہ تعالیٰ انہیں غریقِ رحمت کرے۔

مولانا عبدالحمیٰ رحمۃ اللہ علیہ نے تو یہ بھی لکھا ہے کہ وہ سربراہِ ورہِ فقیہ تھے اور اس قدر تبحرِ علمی کے باوجود اور درس و تدریس میں اس قدر مشغول ہونے کے باوصف وہ نہایت متقی اور پرہیزگار تھے۔

مولانا عبدالحمیٰ لکھتے ہیں: "وہ مجھ سے بہت محبت کرتے تھے۔ ہفتے میں ایک یا دو بار

میرے پاس تشریف لاتے اور جمعہ کی نماز میری آفتاد میں پڑھتے تھے۔ لے

تصنیفات

ابراہیم الحدیث والقرآن، فصول احمدی۔ یہ رسالہ علم صرف پر ہے۔
 الخ، ایک رسالہ منطق پر اردو زبان میں لکھا۔ مقدمہ صحیح مسلم دعویٰ زبان
 میں، "تسلیل الفرائض" یہ علم میراث پر ہے۔ ایک رسالہ مسئلہ تراویح کی تحقیق پر لکھا۔
 مولانا مصروف کی وفات لکھنؤ میں چار شنبہ کی شام، صفر کے مہینے میں ۱۳۳۷ھ میں ہوئی
 اور عیش باغ کے قبرستان میں عشاء کے بعد اس علم و فضل اور زہد و تقویٰ کے پیکر کو سپرد خاک
 کر دیا گیا۔

حضرت والد علیہ الرحمہ نے حضرت مولانا عبداللہ غازی پوری رحمۃ اللہ علیہ سے کتاب فیض
 کیا اور حضرت مولانا عبداللہ غازی پوری رحمۃ اللہ علیہ حضرت میاں نذیر حسین محدث دہلوی رحمۃ اللہ
 سے فیضیاب ہوئے اور حضرت میاں صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت شاہ محمد اسحق رحمۃ اللہ علیہ
 سے استفادہ کیا اور حضرت شاہ محمد اسحق صاحب رحمۃ اللہ علیہ حضرت شاہ عبدالعزیز رحمۃ اللہ علیہ
 کے خلف الرشید بھی تھے اور نواسے بھی اور شاہ عبدالعزیز رحمۃ اللہ علیہ اپنے والد ماجد حضرت شاہ
 ولی اللہ محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ کے جانشین تھے۔

حضرت والد علیہ الرحمہ کی
 عملی زندگی کا آغاز

حضرت والد علیہ الرحمہ فارغ التحصیل ہونے کے بعد مدرسہ واپس
 آگئے اور بڑی مستعدی اور ذوق و شوق کے ساتھ اپنی آبائی
 درسگاہ یعنی مدرسہ غزنویہ میں تفسیر اور حدیث کی تدریس کا کام سرانجام دینے لگے اور ایک عرصہ تک
 کتاب و سنت کے چشمہ صافی سے تشہ کا مانِ علم دین کی پیاس بجھاتے رہے۔

اس زمانے میں تدریس کے ساتھ ساتھ تبلیغ و اشاعتِ اسلام، تحریکِ آزادیِ وطن سے اپنی دلچسپی
 اور کمالِ خطابت کی وجہ سے اترتہ میں اپنا ایک مقام پیدا کر لیا تھا۔

لے "زہمة الخواطر" ج ۸ صفحہ ۲۸۷، ۲۸۸، ۲۸۹، ۲۹۰، ۲۹۱، ۲۹۲، ۲۹۳، ۲۹۴، ۲۹۵، ۲۹۶، ۲۹۷، ۲۹۸، ۲۹۹، ۳۰۰، ۳۰۱، ۳۰۲، ۳۰۳، ۳۰۴، ۳۰۵، ۳۰۶، ۳۰۷، ۳۰۸، ۳۰۹، ۳۱۰، ۳۱۱، ۳۱۲، ۳۱۳، ۳۱۴، ۳۱۵، ۳۱۶، ۳۱۷، ۳۱۸، ۳۱۹، ۳۲۰، ۳۲۱، ۳۲۲، ۳۲۳، ۳۲۴، ۳۲۵، ۳۲۶، ۳۲۷، ۳۲۸، ۳۲۹، ۳۳۰، ۳۳۱، ۳۳۲، ۳۳۳، ۳۳۴، ۳۳۵، ۳۳۶، ۳۳۷، ۳۳۸، ۳۳۹، ۳۴۰، ۳۴۱، ۳۴۲، ۳۴۳، ۳۴۴، ۳۴۵، ۳۴۶، ۳۴۷، ۳۴۸، ۳۴۹، ۳۵۰، ۳۵۱، ۳۵۲، ۳۵۳، ۳۵۴، ۳۵۵، ۳۵۶، ۳۵۷، ۳۵۸، ۳۵۹، ۳۶۰، ۳۶۱، ۳۶۲، ۳۶۳، ۳۶۴، ۳۶۵، ۳۶۶، ۳۶۷، ۳۶۸، ۳۶۹، ۳۷۰، ۳۷۱، ۳۷۲، ۳۷۳، ۳۷۴، ۳۷۵، ۳۷۶، ۳۷۷، ۳۷۸، ۳۷۹، ۳۸۰، ۳۸۱، ۳۸۲، ۳۸۳، ۳۸۴، ۳۸۵، ۳۸۶، ۳۸۷، ۳۸۸، ۳۸۹، ۳۹۰، ۳۹۱، ۳۹۲، ۳۹۳، ۳۹۴، ۳۹۵، ۳۹۶، ۳۹۷، ۳۹۸، ۳۹۹، ۴۰۰، ۴۰۱، ۴۰۲، ۴۰۳، ۴۰۴، ۴۰۵، ۴۰۶، ۴۰۷، ۴۰۸، ۴۰۹، ۴۱۰، ۴۱۱، ۴۱۲، ۴۱۳، ۴۱۴، ۴۱۵، ۴۱۶، ۴۱۷، ۴۱۸، ۴۱۹، ۴۲۰، ۴۲۱، ۴۲۲، ۴۲۳، ۴۲۴، ۴۲۵، ۴۲۶، ۴۲۷، ۴۲۸، ۴۲۹، ۴۳۰، ۴۳۱، ۴۳۲، ۴۳۳، ۴۳۴، ۴۳۵، ۴۳۶، ۴۳۷، ۴۳۸، ۴۳۹، ۴۴۰، ۴۴۱، ۴۴۲، ۴۴۳، ۴۴۴، ۴۴۵، ۴۴۶، ۴۴۷، ۴۴۸، ۴۴۹، ۴۵۰، ۴۵۱، ۴۵۲، ۴۵۳، ۴۵۴، ۴۵۵، ۴۵۶، ۴۵۷، ۴۵۸، ۴۵۹، ۴۶۰، ۴۶۱، ۴۶۲، ۴۶۳، ۴۶۴، ۴۶۵، ۴۶۶، ۴۶۷، ۴۶۸، ۴۶۹، ۴۷۰، ۴۷۱، ۴۷۲، ۴۷۳، ۴۷۴، ۴۷۵، ۴۷۶، ۴۷۷، ۴۷۸، ۴۷۹، ۴۸۰، ۴۸۱، ۴۸۲، ۴۸۳، ۴۸۴، ۴۸۵، ۴۸۶، ۴۸۷، ۴۸۸، ۴۸۹، ۴۹۰، ۴۹۱، ۴۹۲، ۴۹۳، ۴۹۴، ۴۹۵، ۴۹۶، ۴۹۷، ۴۹۸، ۴۹۹، ۵۰۰، ۵۰۱، ۵۰۲، ۵۰۳، ۵۰۴، ۵۰۵، ۵۰۶، ۵۰۷، ۵۰۸، ۵۰۹، ۵۱۰، ۵۱۱، ۵۱۲، ۵۱۳، ۵۱۴، ۵۱۵، ۵۱۶، ۵۱۷، ۵۱۸، ۵۱۹، ۵۲۰، ۵۲۱، ۵۲۲، ۵۲۳، ۵۲۴، ۵۲۵، ۵۲۶، ۵۲۷، ۵۲۸، ۵۲۹، ۵۳۰، ۵۳۱، ۵۳۲، ۵۳۳، ۵۳۴، ۵۳۵، ۵۳۶، ۵۳۷، ۵۳۸، ۵۳۹، ۵۴۰، ۵۴۱، ۵۴۲، ۵۴۳، ۵۴۴، ۵۴۵، ۵۴۶، ۵۴۷، ۵۴۸، ۵۴۹، ۵۵۰، ۵۵۱، ۵۵۲، ۵۵۳، ۵۵۴، ۵۵۵، ۵۵۶، ۵۵۷، ۵۵۸، ۵۵۹، ۵۶۰، ۵۶۱، ۵۶۲، ۵۶۳، ۵۶۴، ۵۶۵، ۵۶۶، ۵۶۷، ۵۶۸، ۵۶۹، ۵۷۰، ۵۷۱، ۵۷۲، ۵۷۳، ۵۷۴، ۵۷۵، ۵۷۶، ۵۷۷، ۵۷۸، ۵۷۹، ۵۸۰، ۵۸۱، ۵۸۲، ۵۸۳، ۵۸۴، ۵۸۵، ۵۸۶، ۵۸۷، ۵۸۸، ۵۸۹، ۵۹۰، ۵۹۱، ۵۹۲، ۵۹۳، ۵۹۴، ۵۹۵، ۵۹۶، ۵۹۷، ۵۹۸، ۵۹۹، ۶۰۰، ۶۰۱، ۶۰۲، ۶۰۳، ۶۰۴، ۶۰۵، ۶۰۶، ۶۰۷، ۶۰۸، ۶۰۹، ۶۱۰، ۶۱۱، ۶۱۲، ۶۱۳، ۶۱۴، ۶۱۵، ۶۱۶، ۶۱۷، ۶۱۸، ۶۱۹، ۶۲۰، ۶۲۱، ۶۲۲، ۶۲۳، ۶۲۴، ۶۲۵، ۶۲۶، ۶۲۷، ۶۲۸، ۶۲۹، ۶۳۰، ۶۳۱، ۶۳۲، ۶۳۳، ۶۳۴، ۶۳۵، ۶۳۶، ۶۳۷، ۶۳۸، ۶۳۹، ۶۴۰، ۶۴۱، ۶۴۲، ۶۴۳، ۶۴۴، ۶۴۵، ۶۴۶، ۶۴۷، ۶۴۸، ۶۴۹، ۶۵۰، ۶۵۱، ۶۵۲، ۶۵۳، ۶۵۴، ۶۵۵، ۶۵۶، ۶۵۷، ۶۵۸، ۶۵۹، ۶۶۰، ۶۶۱، ۶۶۲، ۶۶۳، ۶۶۴، ۶۶۵، ۶۶۶، ۶۶۷، ۶۶۸، ۶۶۹، ۶۷۰، ۶۷۱، ۶۷۲، ۶۷۳، ۶۷۴، ۶۷۵، ۶۷۶، ۶۷۷، ۶۷۸، ۶۷۹، ۶۸۰، ۶۸۱، ۶۸۲، ۶۸۳، ۶۸۴، ۶۸۵، ۶۸۶، ۶۸۷، ۶۸۸، ۶۸۹، ۶۹۰، ۶۹۱، ۶۹۲، ۶۹۳، ۶۹۴، ۶۹۵، ۶۹۶، ۶۹۷، ۶۹۸، ۶۹۹، ۷۰۰، ۷۰۱، ۷۰۲، ۷۰۳، ۷۰۴، ۷۰۵، ۷۰۶، ۷۰۷، ۷۰۸، ۷۰۹، ۷۱۰، ۷۱۱، ۷۱۲، ۷۱۳، ۷۱۴، ۷۱۵، ۷۱۶، ۷۱۷، ۷۱۸، ۷۱۹، ۷۲۰، ۷۲۱، ۷۲۲، ۷۲۳، ۷۲۴، ۷۲۵، ۷۲۶، ۷۲۷، ۷۲۸، ۷۲۹، ۷۳۰، ۷۳۱، ۷۳۲، ۷۳۳، ۷۳۴، ۷۳۵، ۷۳۶، ۷۳۷، ۷۳۸، ۷۳۹، ۷۴۰، ۷۴۱، ۷۴۲، ۷۴۳، ۷۴۴، ۷۴۵، ۷۴۶، ۷۴۷، ۷۴۸، ۷۴۹، ۷۵۰، ۷۵۱، ۷۵۲، ۷۵۳، ۷۵۴، ۷۵۵، ۷۵۶، ۷۵۷، ۷۵۸، ۷۵۹، ۷۶۰، ۷۶۱، ۷۶۲، ۷۶۳، ۷۶۴، ۷۶۵، ۷۶۶، ۷۶۷، ۷۶۸، ۷۶۹، ۷۷۰، ۷۷۱، ۷۷۲، ۷۷۳، ۷۷۴، ۷۷۵، ۷۷۶، ۷۷۷، ۷۷۸، ۷۷۹، ۷۸۰، ۷۸۱، ۷۸۲، ۷۸۳، ۷۸۴، ۷۸۵، ۷۸۶، ۷۸۷، ۷۸۸، ۷۸۹، ۷۹۰، ۷۹۱، ۷۹۲، ۷۹۳، ۷۹۴، ۷۹۵، ۷۹۶، ۷۹۷، ۷۹۸، ۷۹۹، ۸۰۰، ۸۰۱، ۸۰۲، ۸۰۳، ۸۰۴، ۸۰۵، ۸۰۶، ۸۰۷، ۸۰۸، ۸۰۹، ۸۱۰، ۸۱۱، ۸۱۲، ۸۱۳، ۸۱۴، ۸۱۵، ۸۱۶، ۸۱۷، ۸۱۸، ۸۱۹، ۸۲۰، ۸۲۱، ۸۲۲، ۸۲۳، ۸۲۴، ۸۲۵، ۸۲۶، ۸۲۷، ۸۲۸، ۸۲۹، ۸۳۰، ۸۳۱، ۸۳۲، ۸۳۳، ۸۳۴، ۸۳۵، ۸۳۶، ۸۳۷، ۸۳۸، ۸۳۹، ۸۴۰، ۸۴۱، ۸۴۲، ۸۴۳، ۸۴۴، ۸۴۵، ۸۴۶، ۸۴۷، ۸۴۸، ۸۴۹، ۸۵۰، ۸۵۱، ۸۵۲، ۸۵۳، ۸۵۴، ۸۵۵، ۸۵۶، ۸۵۷، ۸۵۸، ۸۵۹، ۸۶۰، ۸۶۱، ۸۶۲، ۸۶۳، ۸۶۴، ۸۶۵، ۸۶۶، ۸۶۷، ۸۶۸، ۸۶۹، ۸۷۰، ۸۷۱، ۸۷۲، ۸۷۳، ۸۷۴، ۸۷۵، ۸۷۶، ۸۷۷، ۸۷۸، ۸۷۹، ۸۸۰، ۸۸۱، ۸۸۲، ۸۸۳، ۸۸۴، ۸۸۵، ۸۸۶، ۸۸۷، ۸۸۸، ۸۸۹، ۸۹۰، ۸۹۱، ۸۹۲، ۸۹۳، ۸۹۴، ۸۹۵، ۸۹۶، ۸۹۷، ۸۹۸، ۸۹۹، ۹۰۰، ۹۰۱، ۹۰۲، ۹۰۳، ۹۰۴، ۹۰۵، ۹۰۶، ۹۰۷، ۹۰۸، ۹۰۹، ۹۱۰، ۹۱۱، ۹۱۲، ۹۱۳، ۹۱۴، ۹۱۵، ۹۱۶، ۹۱۷، ۹۱۸، ۹۱۹، ۹۲۰، ۹۲۱، ۹۲۲، ۹۲۳، ۹۲۴، ۹۲۵، ۹۲۶، ۹۲۷، ۹۲۸، ۹۲۹، ۹۳۰، ۹۳۱، ۹۳۲، ۹۳۳، ۹۳۴، ۹۳۵، ۹۳۶، ۹۳۷، ۹۳۸، ۹۳۹، ۹۴۰، ۹۴۱، ۹۴۲، ۹۴۳، ۹۴۴، ۹۴۵، ۹۴۶، ۹۴۷، ۹۴۸، ۹۴۹، ۹۵۰، ۹۵۱، ۹۵۲، ۹۵۳، ۹۵۴، ۹۵۵، ۹۵۶، ۹۵۷، ۹۵۸، ۹۵۹، ۹۶۰، ۹۶۱، ۹۶۲، ۹۶۳، ۹۶۴، ۹۶۵، ۹۶۶، ۹۶۷، ۹۶۸، ۹۶۹، ۹۷۰، ۹۷۱، ۹۷۲، ۹۷۳، ۹۷۴، ۹۷۵، ۹۷۶، ۹۷۷، ۹۷۸، ۹۷۹، ۹۸۰، ۹۸۱، ۹۸۲، ۹۸۳، ۹۸۴، ۹۸۵، ۹۸۶، ۹۸۷، ۹۸۸، ۹۸۹، ۹۹۰، ۹۹۱، ۹۹۲، ۹۹۳، ۹۹۴، ۹۹۵، ۹۹۶، ۹۹۷، ۹۹۸، ۹۹۹، ۱۰۰۰، ۱۰۰۱، ۱۰۰۲، ۱۰۰۳، ۱۰۰۴، ۱۰۰۵، ۱۰۰۶، ۱۰۰۷، ۱۰۰۸، ۱۰۰۹، ۱۰۱۰، ۱۰۱۱، ۱۰۱۲، ۱۰۱۳، ۱۰۱۴، ۱۰۱۵، ۱۰۱۶، ۱۰۱۷، ۱۰۱۸، ۱۰۱۹، ۱۰۲۰، ۱۰۲۱، ۱۰۲۲، ۱۰۲۳، ۱۰۲۴، ۱۰۲۵، ۱۰۲۶، ۱۰۲۷، ۱۰۲۸، ۱۰۲۹، ۱۰۳۰، ۱۰۳۱، ۱۰۳۲، ۱۰۳۳، ۱۰۳۴، ۱۰۳۵، ۱۰۳۶، ۱۰۳۷، ۱۰۳۸، ۱۰۳۹، ۱۰۴۰، ۱۰۴۱، ۱۰۴۲، ۱۰۴۳، ۱۰۴۴، ۱۰۴۵، ۱۰۴۶، ۱۰۴۷، ۱۰۴۸، ۱۰۴۹، ۱۰۵۰، ۱۰۵۱، ۱۰۵۲، ۱۰۵۳، ۱۰۵۴، ۱۰۵۵، ۱۰۵۶، ۱۰۵۷، ۱۰۵۸، ۱۰۵۹، ۱۰۶۰، ۱۰۶۱، ۱۰۶۲، ۱۰۶۳، ۱۰۶۴، ۱۰۶۵، ۱۰۶۶، ۱۰۶۷، ۱۰۶۸، ۱۰۶۹، ۱۰۷۰، ۱۰۷۱، ۱۰۷۲، ۱۰۷۳، ۱۰۷۴، ۱۰۷۵، ۱۰۷۶، ۱۰۷۷، ۱۰۷۸، ۱۰۷۹، ۱۰۸۰، ۱۰۸۱، ۱۰۸۲، ۱۰۸۳، ۱۰۸۴، ۱۰۸۵، ۱۰۸۶، ۱۰۸۷، ۱۰۸۸، ۱۰۸۹، ۱۰۹۰، ۱۰۹۱، ۱۰۹۲، ۱۰۹۳، ۱۰۹۴، ۱۰۹۵، ۱۰۹۶، ۱۰۹۷، ۱۰۹۸، ۱۰۹۹، ۱۱۰۰، ۱۱۰۱، ۱۱۰۲، ۱۱۰۳، ۱۱۰۴، ۱۱۰۵، ۱۱۰۶، ۱۱۰۷، ۱۱۰۸، ۱۱۰۹، ۱۱۱۰، ۱۱۱۱، ۱۱۱۲، ۱۱۱۳، ۱۱۱۴، ۱۱۱۵، ۱۱۱۶، ۱۱۱۷، ۱۱۱۸، ۱۱۱۹، ۱۱۲۰، ۱۱۲۱، ۱۱۲۲، ۱۱۲۳، ۱۱۲۴، ۱۱۲۵، ۱۱۲۶، ۱۱۲۷، ۱۱۲۸، ۱۱۲۹، ۱۱۳۰، ۱۱۳۱، ۱۱۳۲، ۱۱۳۳، ۱۱۳۴، ۱۱۳۵، ۱۱۳۶، ۱۱۳۷، ۱۱۳۸، ۱۱۳۹، ۱۱۴۰، ۱۱۴۱، ۱۱۴۲، ۱۱۴۳، ۱۱۴۴، ۱۱۴۵، ۱۱۴۶، ۱۱۴۷، ۱۱۴۸، ۱۱۴۹، ۱۱۵۰، ۱۱۵۱، ۱۱۵۲، ۱۱۵۳، ۱۱۵۴، ۱۱۵۵، ۱۱۵۶، ۱۱۵۷، ۱۱۵۸، ۱۱۵۹، ۱۱۶۰، ۱۱۶۱، ۱۱۶۲، ۱۱۶۳، ۱۱۶۴، ۱۱۶۵، ۱۱۶۶، ۱۱۶۷، ۱۱۶۸، ۱۱۶۹، ۱۱۷۰، ۱۱۷۱، ۱۱۷۲، ۱۱۷۳، ۱۱۷۴، ۱۱۷۵، ۱۱۷۶، ۱۱۷۷، ۱۱۷۸، ۱۱۷۹، ۱۱۸۰، ۱۱۸۱، ۱۱۸۲، ۱۱۸۳، ۱۱۸۴، ۱۱۸۵، ۱۱۸۶، ۱۱۸۷، ۱۱۸۸، ۱۱۸۹، ۱۱۹۰، ۱۱۹۱، ۱۱۹۲، ۱۱۹۳، ۱۱۹۴، ۱۱۹۵، ۱۱۹۶، ۱۱۹۷، ۱۱۹۸، ۱۱۹۹، ۱۲۰۰، ۱۲۰۱، ۱۲۰۲، ۱۲۰۳، ۱۲۰۴، ۱۲۰۵، ۱۲۰۶، ۱۲۰۷، ۱۲۰۸، ۱۲۰۹، ۱۲۱۰، ۱۲۱۱، ۱۲۱۲، ۱۲۱۳، ۱۲۱۴، ۱۲۱۵، ۱۲۱۶، ۱۲۱۷، ۱۲۱۸، ۱۲۱۹، ۱۲۲۰، ۱۲۲۱، ۱۲۲۲، ۱۲۲۳، ۱۲۲۴، ۱۲۲۵، ۱۲۲۶، ۱۲۲۷، ۱۲۲۸، ۱۲۲۹، ۱۲۳۰، ۱۲۳۱، ۱۲۳۲، ۱۲۳۳، ۱۲۳۴، ۱۲۳۵، ۱۲۳۶، ۱۲۳۷، ۱۲۳۸، ۱۲۳۹، ۱۲۴۰، ۱۲۴۱، ۱۲۴۲، ۱۲۴۳، ۱۲۴۴، ۱۲۴۵، ۱۲۴۶، ۱۲۴۷، ۱۲۴۸، ۱۲۴۹، ۱۲۵۰، ۱۲۵۱، ۱۲۵۲، ۱۲۵۳، ۱۲۵۴، ۱۲۵۵، ۱۲۵۶، ۱۲۵۷، ۱۲۵۸، ۱۲۵۹، ۱۲۶۰، ۱۲۶۱، ۱۲۶۲، ۱۲۶۳، ۱۲۶۴، ۱۲۶۵، ۱۲۶۶، ۱۲۶۷، ۱۲۶۸، ۱۲۶۹، ۱۲۷۰، ۱۲۷۱، ۱۲۷۲، ۱۲۷۳، ۱۲۷۴، ۱۲۷۵، ۱۲۷۶، ۱۲۷۷، ۱۲۷۸، ۱۲۷۹، ۱۲۸۰، ۱۲۸۱، ۱۲۸۲، ۱۲۸۳، ۱۲۸۴، ۱۲۸۵، ۱۲۸۶، ۱۲۸۷، ۱۲۸۸، ۱۲۸۹، ۱۲۹۰، ۱۲۹۱، ۱۲۹۲، ۱۲۹۳، ۱۲۹۴، ۱۲۹۵، ۱۲۹۶، ۱۲۹۷، ۱۲۹۸، ۱۲۹۹، ۱۳۰۰، ۱۳۰۱، ۱۳۰۲، ۱۳۰۳، ۱۳۰۴، ۱۳۰۵، ۱۳۰۶، ۱۳۰۷، ۱۳۰۸، ۱۳۰۹، ۱۳۱۰، ۱۳۱۱، ۱۳۱۲، ۱۳۱۳، ۱۳۱۴، ۱۳۱۵، ۱۳۱۶، ۱۳۱۷، ۱۳۱۸، ۱۳۱۹، ۱۳۲۰، ۱۳۲۱، ۱۳۲۲، ۱۳۲۳، ۱۳۲۴، ۱۳۲۵، ۱۳۲۶، ۱۳۲۷، ۱۳۲۸، ۱۳۲۹، ۱۳۳۰، ۱۳۳۱، ۱۳۳۲، ۱۳۳۳، ۱۳۳۴، ۱۳۳۵، ۱۳۳۶، ۱۳۳۷، ۱۳۳۸، ۱۳۳۹، ۱۳۴۰، ۱۳۴۱، ۱۳۴۲، ۱۳۴۳، ۱۳۴۴، ۱۳۴۵، ۱۳۴۶، ۱۳۴۷، ۱۳۴۸، ۱۳۴۹، ۱۳۵۰، ۱۳۵۱، ۱۳۵۲، ۱۳۵۳، ۱۳۵۴، ۱۳۵۵، ۱۳۵۶، ۱۳۵۷، ۱۳۵۸، ۱۳۵۹، ۱۳۶۰، ۱۳۶۱، ۱۳۶۲، ۱۳۶۳، ۱۳۶۴، ۱۳۶۵، ۱۳۶۶، ۱۳۶۷، ۱۳۶۸، ۱۳۶۹، ۱۳۷۰، ۱۳۷۱، ۱۳۷۲، ۱۳۷۳، ۱۳۷۴، ۱۳۷۵، ۱۳۷۶، ۱۳۷۷، ۱۳۷۸، ۱۳۷۹، ۱۳۸۰، ۱۳۸۱، ۱۳۸۲، ۱۳۸۳، ۱۳۸۴، ۱۳۸۵، ۱۳۸۶، ۱۳۸۷، ۱۳۸۸، ۱۳۸۹، ۱۳۹۰، ۱۳۹۱، ۱۳۹۲، ۱۳۹۳، ۱۳۹۴، ۱۳۹۵، ۱۳۹۶، ۱۳۹۷، ۱۳۹۸، ۱۳۹۹، ۱۴۰۰، ۱۴۰۱، ۱۴۰۲، ۱۴۰۳، ۱۴۰۴، ۱۴۰۵، ۱۴۰۶، ۱۴۰۷، ۱۴۰۸، ۱۴۰۹، ۱۴۱۰، ۱۴۱۱، ۱۴۱۲، ۱۴۱۳، ۱۴۱۴، ۱۴۱۵، ۱۴۱۶، ۱۴۱۷، ۱۴۱۸، ۱۴۱۹، ۱۴۲۰، ۱۴۲۱، ۱۴۲۲، ۱۴۲۳، ۱۴۲۴، ۱۴۲۵، ۱۴۲۶، ۱۴۲۷، ۱۴۲۸، ۱۴۲۹، ۱۴۳۰، ۱۴۳۱، ۱۴۳۲، ۱۴۳۳، ۱۴۳۴، ۱۴۳۵، ۱۴۳۶، ۱۴۳۷، ۱۴۳۸، ۱۴۳۹، ۱۴۴۰، ۱۴۴۱، ۱۴۴۲، ۱۴۴۳، ۱۴۴۴، ۱۴۴۵، ۱۴۴۶، ۱۴۴۷، ۱۴۴۸، ۱۴۴۹، ۱۴۵۰، ۱۴۵۱، ۱۴۵۲، ۱۴۵۳، ۱۴۵۴، ۱۴۵۵، ۱۴۵۶، ۱۴۵۷، ۱۴۵۸، ۱۴۵۹، ۱۴۶۰، ۱۴۶۱، ۱۴۶۲، ۱۴۶۳، ۱۴۶۴، ۱۴۶۵، ۱۴۶۶، ۱۴۶۷، ۱۴۶۸، ۱۴۶۹، ۱۴۷۰، ۱۴۷۱، ۱۴۷۲، ۱۴۷۳، ۱۴۷۴، ۱۴۷۵، ۱۴۷۶، ۱۴۷۷، ۱۴۷۸، ۱۴۷۹، ۱۴۸۰، ۱۴۸۱، ۱۴۸۲، ۱۴۸۳، ۱۴۸۴، ۱۴۸۵، ۱۴۸۶، ۱۴۸۷، ۱۴۸۸، ۱۴۸۹، ۱۴۹۰، ۱۴۹۱، ۱۴۹۲، ۱۴۹۳، ۱۴۹۴، ۱۴۹۵، ۱۴۹۶، ۱۴۹۷، ۱۴۹۸، ۱۴۹۹، ۱۵۰۰، ۱۵۰۱، ۱۵۰۲، ۱۵۰۳، ۱۵۰۴، ۱۵۰۵، ۱۵۰۶، ۱۵۰۷، ۱۵۰۸، ۱۵۰۹، ۱۵۱۰، ۱۵۱۱، ۱۵۱۲، ۱۵۱۳، ۱۵۱۴، ۱۵۱۵، ۱۵۱۶، ۱۵۱۷، ۱۵۱۸، ۱۵۱۹، ۱۵۲۰، ۱۵۲۱، ۱۵۲۲، ۱۵۲۳، ۱۵۲۴، ۱۵۲۵، ۱۵۲۶، ۱۵۲۷، ۱۵۲۸، ۱۵۲۹، ۱۵۳۰، ۱۵۳۱، ۱۵۳۲، ۱۵۳۳، ۱۵۳۴، ۱۵۳۵، ۱۵۳۶، ۱۵۳۷، ۱۵۳۸، ۱۵۳۹، ۱۵۴۰، ۱۵۴۱، ۱۵۴۲، ۱۵۴۳، ۱۵۴۴، ۱۵۴۵، ۱۵۴۶، ۱۵۴۷، ۱۵۴۸، ۱۵۴۹، ۱۵۵۰، ۱۵۵۱، ۱۵۵۲، ۱۵۵۳، ۱۵۵۴، ۱۵۵۵، ۱۵۵۶، ۱۵۵۷، ۱۵۵۸، ۱۵۵۹، ۱۵۶۰، ۱۵۶۱، ۱۵۶۲، ۱۵۶۳، ۱۵۶۴، ۱۵۶۵، ۱۵

سیاسی زندگی

۱۹۱۹ء کی بات ہے جب بڑک انگریز کے خلاف صف آرا تھے اور مسلمانان ہند کی ہمدردیاں ٹڑکوں کے ساتھ تھیں۔ اسی زمانے میں تحریکِ خلافت کا آغاز ہوا۔ حضرت والد علیہ الرحمہ اس تحریک کے سرگرم رکن تھے۔

حبیب انہوں نے سیاست میں قدم رکھا، وہ دور انگریز کے جبر اور استبداد کا دور تھا۔ ملک میں مارشل لا نافذ تھا۔ انہوں نے انگریز کے خلاف بھرپور آواز اٹھائی۔ وہ حق گوئی اور بیباکی کا پیکر بن گئے۔ جن لوگوں کو اس دور میں ان کی تقریریں سننے کا موقع ملا، ان کا کہنا ہے کہ حبیب وہ انگریز کے خلاف تقریر کرتے تو یوں محسوس ہوتا تھا کہ وہ آگ برسا رہے ہیں اور ان کے لفظوں پر شعلوں کا گمان ہوتا تھا۔ ان کی اور ان کے رفقاء کی بیباکانہ تقریروں کا یہ اثر ہوا کہ عوام کے دلوں سے مارشل لا کی ہیبت اٹھ گئی۔ ان کی شعلہ فشاہی نے جموں کی برف توڑ ڈالی اور عوام کے دلوں میں انگریز کے خلاف نفرت کی چنگاریاں سلگنے لگیں اور حصولِ آزادی کا جذبہ ابھرنے لگا۔ انگریز کے خلاف نفرت کی آگ بھڑک اٹھی اور وہ پوری گرم جوشی کے ساتھ اسے اپنے دامن سے ہوا دیتے رہے۔

جلینا نوالہ باغ کے حادثے میں حضرت والد علیہ الرحمہ اور میرے چچا حضرت مولانا اسماعیل علیہ الرحمہ بال بال بچ گئے۔ جس روز جلینا نوالہ باغ کا حادثہ ہوا، یہ دونوں بھائی نمازِ عصر سے فارغ ہو کر جلینا نوالہ باغ کی طرف روانہ ہوئے۔ ان دونوں بھائیوں نے اس روز جلینا نوالہ باغ میں ایک جلسہ عام سے خطاب کرنا تھا۔ مسجد غزنویہ سے نکل کر ملکہ وکٹوریہ کے بت کے قریب پہنچے تو وہاں ایک تانبولی کی دوکان پر پان کھانے کے لیے رُک گئے۔ اسی اثناء میں جنرل ڈائر اپنی گورنمنٹ کے ہمراہ جلینا نوالہ باغ کی طرف جاتے ہوئے ان کے قریب سے گزرا۔ وہ پان کھا کر

کرشنا مارکیٹ تک ہی پہنچے تھے کہ جنرل ڈائز کوئی چلا کر ہینکڑوں اور بلڈز کرنے کے بعد واپس آیا تھا۔ ۱۹۲۱ء میں جمعیتِ علمائے ہند کی تشکیل ہوئی تو اس کی سب سے پہلی مجلس میں موثر کردار ادا کیا۔ ابتدا میں مجلسِ عاملہ کے رکن تھے پھر مدتوں نائب صدر رہے۔ یہ ۱۹۲۱ء ہی کی بات ہے کہ برطانوی سامراج کے خلاف اس قدر گرجا اور آواز بلند کیا کہ تین سالوں کے لیے میانوالی جیل میں نظر بند کر دیے گئے۔ رہا ہوئے تو پہلے سے بھی زیادہ گرجاوشی کے ساتھ آواز حق بلند کیا۔ ۱۹۲۵ء میں دوسری بار گرفتار ہوئے۔ اس دفعہ انہوں نے جیل میں قیدیوں کے ساتھ حکام کے غیر انسانی سلوک کی خلاف زبردست احتجاج کیا اور حکومت کو مجبور کر دیا کہ وہ سیاسی نظر بندوں کو مناسب مراعات دے۔ ۱۹۲۷ء میں انہوں نے سائنس کمیشن کے بائیکاٹ کی تحریک میں بھرپور حصہ لیا اور تیسری بار قید و بند کی آزمائش سے دوچار ہوئے۔ ۱۹۲۹ء میں چند خلافتی ساتھیوں کو ساتھ لے کر انہوں نے مجلس احرار اسلام کی بنیاد ڈالی۔ مولانا عطاء اللہ شاہ بخاری کے اشتراک اور تعاون سے انہوں نے مجلس احرار کے پہلے سیکرٹری کی حیثیت سے دواڑھائی برس کے مختصر عرصے میں اسے ایک منظم اور جاندار تحریک بنا دیا۔ ۱۹۳۲ء میں جب احرار نے تحریک کشمیر شروع کی تو رصغیر کے ہزاروں احرار رضا کاروں سے ریاست کی جلیں بھر گئیں اور خود حضرت والد علیہ الرحمہ بھی گرفتار کر لیے گئے۔ ۱۹۳۲ء میں جب کانگریس نے "ہندوستان چھوڑ دو" کی مہم شروع کی تو وہ کانگریس میں شامل ہو گئے اور اس مہم میں بھرپور حصہ لیا اور گرفتار کر لیے گئے۔ فرماتے تھے کہ انگریز مجلس احرار کو خاطر میں نہیں لاتا تھا اور کانگریس ہی ایک ایسی فعال جماعت تھی جسے برطانوی حکومت درخورِ اعتنا سمجھتی تھی اور وہی ایک واضح اور مرتب لائحہ عمل پیش نظر رکھ کر برطانوی سامراج سے برسرِ پیکار تھی، اسی بنا پر میں کانگریس میں شامل ہوا تھا۔ کبھی کبھی یوں بھی فرماتے:

"اُن دنوں انگریزوں کی منہمکی کا عجیب عالم تھا، ہر وہ چاہتا تھا کہ انگریزوں کے خلاف آگ جل رہی ہوتی تھی ہم اس میں اور ایندھن جھونکتے تھے اور اُسے اپنے دامن

سے ہوا دیتے تھے۔“

پھر انہیں پنجاب کانگریس کا صدر منتخب کیا گیا اور وہ اس جماعت کے ٹکٹ پر پنجاب اسمبلی کے رکن منتخب ہوئے۔ یہ بات قابل ذکر ہے کہ اس وقت پورے پنجاب میں وہ تنہا تھے جو لیگی امیدوار کے مقابلے میں کانگریس کے ٹکٹ پر جیتے تھے اور یہ بات ان کے عوام میں اثر و رسوخ اور ہر دلعزیزی کا واضح ثبوت ہے۔

جب حضرت والد علیہ الرحمہ نے دیکھا کہ کانگریس کی ذہنیت تو مہاسبائیوں کی سی ہے اور ہندو مسلم اتحاد

کانگریس سے استعفا

کا محض ڈھونگ رچا رکھا ہے تو وہ کانگریس سے اسی وقت مستعفی ہو گئے۔ ۲۔ اگست ۱۹۴۶ء کے اخبارات میں ان کا جو بصیرت افوز بیان چھپا وہ یہاں درج کیا جاتا ہے :

”لاہور ۲۔ اگست۔ بہر قسم کی مساوات کی مخالفت کر کے کانگریس نے نیشنل مسلمانوں

کے لیے فکر و تدبیر کا سامان بہم پہنچا دیا ہے۔ اگر آج کانگریس کا مفہوم اور مقصد صرف اسی قدر رہ گیا ہے کہ وہ ہر ممکن طریقہ سے ہندوؤں کی سیاسی اور اقتصادی بہبود اور ترقی کے لیے کوشاں ہے تو ان مسلمانوں کے لیے اس میں ٹھہرنے کی کیا گنجائش ہو سکتی ہے جو اس میں اس لیے شامل ہوئے تھے کہ یہ آزادی کے لیے انگریز سے لڑ رہی ہے۔“

مولانا داؤد غزنوی سابق صدر پنجاب کانگریس کمیٹی نے اخبارات کے نام ایک طویل بیان دیتے ہوئے نیشنل مسلمانوں سے اپیل کی ہے کہ وہ کانگریس کے باب میں اپنے رویہ پر

نظر ثانی کریں۔ آپ اپنے بیان کے دوران میں فرماتے ہیں کہ ۱۰، ۱۱، ۱۲ جون ۱۹۴۶ء کو دہلی میں تمام نیشنل مسلمانوں کی جماعتوں مثلاً جمعیت العلماء ہند، مجلس احرار اور مومن کانفرنس کی مجالس ہائے منتظمہ کا ایک مشترکہ جلسہ ہوا تھا جس میں انہوں نے مندرجہ ذیل مطالبات وضع کیے:

۱۔ عارضی اور مستقل گورنمنٹ میں مسلمانوں اور ہندوؤں کے درمیان مساوات کا اصول

تسلیم کیا جائے۔

۲۔ اختلاف کی صورت میں مجلسِ قانون ساز کے صدر کی نہیں بلکہ فیڈرل کورٹ کے جج کی رائے حتمی تسلیم کی جائے۔

ان مطالبات کو کانگریس کی مجلسِ منتظمہ کے پاس مناسب کارروائی کے لیے بھیجا گیا لیکن نہ صرف یہ کہ کانگریس نے ان مطالبات کا کوئی نوٹس نہ لیا اور نیشنل مسلمانوں کو ان کی رسید سے بھی اطلاع نہ دی بلکہ انہوں نے اپنے مطالبات میں جو انہوں نے وزارتِ مشن کے سامنے رکھے نیشنل مسلمانوں کے مطالبات کی صریح مخالفت کی؛ چنانچہ یہ بات واضح ہے کہ کانگریس اب ہر قسم کی مساوات کی مخالفت ہے۔

اس صورت میں سوال یہ ہے کہ آیا نیشنل مسلمان کانگریس کے صرف خیمہ بردار بن کر رہ جائیں گے؟ آگے چل کر آپ اپنے بیان میں فرماتے ہیں: قانون ساز اسمبلی کے لیے کانگریس نے بعض مشورہ ماسبھاٹیوں مثلاً راجہ مہیشور دیال، ڈاکٹر شیاما پرشاد، مکھرجی اور سرٹیک چند وغیرہ کو منتخب کر کے اپنے شدید طور پر فرقہ دار جماعت ہونے کا ثبوت دیا ہے۔

مولانا صاحب نے غیر لگی مسلمانوں سے درخواست کی ہے کہ وہ واقعات کی روشنی میں اپنے موقف کا تجزیہ کریں اور مسلم لیگ میں شامل ہو کر ملت اور ملک کی بہتری کے لیے سرگرم عمل ہوں۔

میں نے ایک دفعہ ان سے پوچھا کہ آپ نے لیگ میں شامل ہوتے وقت کیا مولانا ابوالاعلام سے مشورہ کیا تھا؟ تو فرمانے لگے کہ اگر ان کے پاس مشورے کے لیے چلا جاتا تو مجھے بھی مسلم لیگ میں شامل نہ ہونے دیتے۔ قرینِ مصلحت یہی تھا کہ لیگ میں شمولیت کے اعلان کے بعد ان سے ملاقات کرتا۔

لیگ میں شامل ہونے کے بعد انہوں نے ہندوستان کے تقریباً تمام بڑے بڑے تہذیبی کاؤرہ کیا اور مسلمانوں کے سامنے ہندو اور انگریز دونوں کے عوام بے نقاب کیے اور ان کے

خلافت اگلی گامادی مسلم لیگ کو اس سے بڑی قوت حاصل ہوئی۔ مسلم لیگ کی سول نافرمانی کے پہلے روز ہی نواب ممدوٹ اور حضرت والد علیہ الرحمہ کے علاوہ درکنگ کمیٹی کے تمام رکن گرفتار کر لیے گئے۔ نواب ممدوٹ بھی گرفتار ہو گئے اور ان کے بعد تحریک چلانے کی ذمہ داری حضرت والد علیہ الرحمہ کے کندھوں پر آ پڑی۔ اسی تحریک کے سلسلے میں قائد اعظم سے ان کی مفصل ملاقات ہوئی اور قائد اعظم نے انہیں ہدایات دیں۔ قائد اعظم سے ملاقات کے بعد جب وہ واپس آئے تو وہ قائد اعظم کی ذہانت، سیاسی تدبیر اور فراست سے بہت متاثر نظر آتے تھے۔

میدان صحافت میں

یکم اپریل ۱۹۲۷ء کو امرتسر سے ہنستہ وار "توحید" کا پہلا شمارہ حضرت والد علیہ الرحمہ کی ادارت میں شائع ہوا۔ "توحید" کی مکمل فائل اس وقت راقم الحروف کے سامنے ہے۔ پہلے شمارے کے سرورق پر جلی حروف میں یہ دُعا اور اس کا ترجمہ لکھا:

"رَبِّ اَدْخِلْنِيْ مَدْخَلَ صَدَقٍ وَّاَخْرِجْنِيْ مَخْرَجَ صَدَقٍ وَّاجْعَلْ لِيْ مِنْ لَّدُنْكَ سُلْطٰنًا نَّصِيْرًا"

اے پروردگار! جس راستہ پر میں نے قدم رکھا ہے اور جو سفر میں نے اختیار کیا ہے، اس میں مجھے بہتر مقام تک پہنچائو اور تمام مشکلات اور مخالف طاقتوں کے ہجوم سے بہتر طریق سے نکالو۔ میں عاجز و کمزور اور ضعیف و ناتواں ہوں مگر تو اپنی نصرت و اعانت سے اس کا رزارحی و باطل میں فتح و غلبہ دیجیو۔ آمین۔

"توحید" کی پیشانی پر ہمیشہ یہ آیت مرقوم ہوتی تھی:

"لَا تَخْفَوْا وَلَا تَحْزَنُوا وَاَنْتُمْ اِلٰهَ عَلٰوْنَ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ" "توحید" کے پہلے شمارے میں علامہ اقبالؒ کی نظم "موتہ" چھپی جس کا مطلع یہ ہے:

ہم نشیں! مسلم ہوں میں، توحید کا حامل ہوں میں
اس صداقت پر ازل سے شاہدِ عادل ہوں میں

"توحید" میں اگرچہ علمی اور ادبی مضامین بھی ہوتے تھے لیکن اس کا اولین مقصد دعوت الی اللہ تھا۔ "توحید" کے مضامین پڑھتے ہوئے یوں محسوس ہوتا ہے جیسے کوئی صدور اسرائیل ہاتھ میں لے کر سوتے ہوئے انسانوں کو خوابِ غفلت سے چونکا رہا ہے اور مردہ انسانوں کے

لے زجر بہت مت ہارو اور غرزدہ مت ہو جاؤ۔ اگر حقیقی معنوں میں تم مومن ہو تو سب پنہمی غالب رہو گے۔

اندر زندگی کی رُوح پھونک رہا ہے۔ توحید کے پہلے شمارے کا افتتاحیہ حضرت والد علیہ الرحمہ نے عربی زبان میں لکھا جو کئی صفحات پر مشتمل ہے۔ اس افتتاحیہ میں بھٹکے ہوئے فلسفیوں، جاہل صوفیوں، صنمیر فروش مولویوں اور ملت فروش سیاسی لیڈروں کی خراب خبر لی ہے۔ اس افتتاحیہ میں معاشرے کے ہر طبقے کو الگ الگ سمجھوڑا ہے۔ اس افتتاحیہ کے آخر میں بڑے درد اور کرب کے ساتھ لکھتے ہیں:

”فيا للاسلام والمسلمين! قد اختلف دعوة الدعاة، وتشتت بهم السبل، وظهر اعجاب كل ذي رأي برأيه، وتهاون العلماء في الامر بالمعروف والنهي عن المنكر، وظهر الفساد في البر والبحر بما كسبت ايدي الناس، وانعكست القضية التي ان صارت السنة بدعة والبدعة سنة والمعروف منكراً والمنكر معروفاً وعاد الاسلام عزيباً كما بدأ عزيباً فطوبى للغرباء“

ہائے اسلام اور ملتِ اسلامیہ کی بیچارگی! ہر داعی کی بیکار مختلف ہے اور سب کی راہیں جدا جدا ہیں اور ہر ایک کو اپنی ہی رائے بھاگتی ہے۔ علماء نیکی کا حکم دینے اور بُرائی سے روکنے میں سُست ہو گئے اور لوگوں کی بد اعمالیوں کے ہاتھوں بربود بحر میں فنا پھیل گیا ہے۔ معاملہ بالکل الٹ گیا۔ سنت بدعت ہو گئی اور بدعت کو سنت سمجھا جانے لگا۔ نیکی کو بدی اور بدی کو نیکی خیال کیا جانے لگا اور اسلام پر دسی ہو گیا جیسا کہ وہ ابتداء میں پر دسی تھا۔ پس خوشخبری ہے پر دسیوں کے لیے)

اردو میں پہلا مضمون اس عنوان سے لکھا:

”توحید کا مقصد
امر بالمعروف اور نہی عن المنکر
ہماد فی سبیل اللہ“

اس مضمون کی تین قسطیں ہیں جو بالترتیب پہلے تین شماروں میں چھپا رہا۔ اس مضمون میں

”توحید کے اجراء کا مقصد شرح و بسط کے ساتھ بیان کیا گیا ہے اور تمام طاغوتی طاقتوں کے خلاف آوازہ حق پوری قوت کے ساتھ بلند کیا گیا ہے۔ فرماتے ہیں :

”یہ ایک کھلی حقیقت ہے کہ ہر اطاعت کے ساتھ ایک سرکشی اور ہر وفاداری کے ساتھ ایک بغاوت اور ہر عاجزی کے ساتھ ایک غرور و تمرد لازمی ہے۔ آپ ایک آقا کے نوکر نہیں ہو سکتے جب تک اور آقاؤں کی غلامی سے انکار نہ کریں۔ ایک چوکھٹ پر ہر عجز و نیاز جب ہی جھک سکتا ہے جب اور تمام سر جھکانے والی چوکھٹوں پر سے مغزورانہ گزر جائیں۔ آپ ایک ہی جانب اپنا منہ نہیں کر سکتے جب تک ہر طرف سے منہ نہ پھیر لیں اور ایک ہی سے اپنا رشتہ جوڑ نہیں سکتے، جب تک ہر طرف سے رشتہ نہ کاٹ لیں۔ پس خدا اور اس کے رسول کی اطاعت کے لیے سب سے پہلی چیز یہ ہے کہ اس کے سوا اور خدائی قوتیں اپنی اطاعت اور غلامی کی طرف بلاتی ہیں، ایک موجد صادق ان سے باغی ہو جائے۔ اس کی محبت میں سرشار ہو کر اس کے تمام دشمنوں کا دشمن اور اس کے دوستوں کا دوست اور محبت بن جائے۔ پس جو لوگ اس کی اطاعت کے مدعی ہیں ان کو اطاعت سے پہلے سرکشی کا، وفاداری سے پہلے بغاوت کا اور دوستی سے پہلے دشمنی کا ثبوت دینا چاہیے کیونکہ کوئی ہستی خدا کی مطیع ہو نہیں سکتی جب تک قوت ابلیسی کے تمام مظاہر سے باغی و تمرد نہ ہو جائے جس میں کاسب سے بڑا مظہر خود نفسِ انسانی ہے اور انسان سے باہر بھی طرح طرح کی گمراہیوں اور باطل پرستیوں کے مختلف مظاہر ہیں۔ انسانوں کے بے شمار غول ہیں جنہوں نے شیطان کے ہاتھ پر بیعت کر کے اس طرح اس کی اطاعت میں اپنے تئیں فنا کر دیا ہے کہ ان کا وجود ازسرا تا پایکبر شیطانی اور جسٹہ ابلیس بن گیا ہے اور ان میں سے ہر قوتِ شیطانی انسان کو اپنے آگے مرعوب دیکھنا چاہتی ہے، کہیں دولت و مال اور

دنویمی جاہ و جلال شیطان کا نشین بنا ہوا ہے، کہیں غرور علم و فضل کے اندر سے شیطان جھانک رہا ہے، کہیں مذہبی پیشواؤں کی جماعتیں اس کا آلہ کار بنی ہوئی ہیں، کہیں اہل و عیال کی محبت میں قومی رسم و رواج کی بندشوں اور آباؤی تقلید کی زنجیروں کے اندر بھی اسی کے تعید اور انقیاد کی کشش مخفی ہے۔

پس مقام ”من یطیع اللہ والرسول“ کے حاصل کرنے کے لیے اولین شرط یہ ہے کہ انسان ان تمام طاقتوں کی اطاعت و فرمانبرداری سے یکسر باغی و سرکش ہو جائے اور ان کی عظمت و جبروت کے اثر سے اپنے دل کو آزاد کر دے۔ اُنٹا ہی نہیں بلکہ جہاں تک طلبِ صادق کی قوت اور توفیقِ الہی کی بہمت اس کا ساتھ دے، ان تمام ابلسی مظاہر کے مقابلے میں ایک اولوالعزمانہ جادو کا اعلان کر دے اور اطاعت و تعبدِ الہی کی بے نیام تلوار سے گرفتار نہ کھڑا ہو جائے تاکہ بدعت و ضلالت کا ہر بت جو سامنے آئے، حق و صداقت، توحید و سنت کی بیچنا ضرب سے پاسن پاسن کر دے اور خدا کے دین کی عزت و عظمت کو بلند کرنے کے لیے اپنی زبان کو، اپنے دماغ کو اور اپنی تمام قوتوں کو وقف کر دے۔

لتكون كلمة الله هي العليا

”توحید“ کے پانچویں شمارے میں ایک معرکہ آرا مضمون :

”صراطِ مستقیم

یعنی

مسلمانوں کے لیے موجودہ تفرق و انتشار میں شاہراہِ عمل

لکھا۔ یہ مضمون بھی تین قسطوں میں چلا۔ اس مضمون میں بھی مسلمانوں کو آفتابِ رسالت سے متیز ہونے کی دعوت دی۔ لکھتے ہیں :

لع شہادہ ۲ جلد ۱ صفر ۳

”پس مسلمان اگر چاہتے ہیں کہ اس چشمہ حیات پر پہنچیں جہاں اُن کی پیاس اور تشنگامی کے لیے کافی سامانِ راحت موجود ہے تو اُن کو معلوم ہونا چاہیے کہ آج تمام عالم میں صرف ایک ہی ہاتھ ہے جو ان کی رہنمائی کر سکتا ہے اور ایک ہی چشمہ نحرالہ ہے جو لغزشوں سے اُن کو بچا سکتی ہے اور وہ وہی ہے جو کبھی دکوہ سینا، پر تجلی حق بن کر چمکی کبھی (فاران) کی چوٹیوں پر ابرِ رحمت بن کر نمودار ہوئی، کبھی (غارِ ثور) میں ”لا تحزن ان اللہ معنا“ کی صدا میں مٹی، کبھی بدر کے کنارے ”ان ینصرکم اللہ فلا غالب لکم“ کے پیغام میں مٹی اور کبھی اُحد کے ان میں ”وکان حقاً علینا نصر المؤمنین“ کی بشارت مٹی اور آج بھی بدلت و محدثات اور فسق و فجور کی تاریکیوں میں مسلمانوں کا راہِ بھولانہوا فاندہ اگر صراطِ مستقیم پر گامزن ہونا چاہتا ہے تو اس کے لیے اس عالم یاس و نا اُمیدی میں اُمید کا آخری سہارا اور بحرِ ظلمات کی تاریکیوں میں روشنی کا ایک ہی مینار ہے جس سے وہ اپنا کھویا ہوا راستہ تلاش کر سکتے ہیں۔“

اُن کی اس دور کی تحریریں بڑی ولولہ انگیز ہیں اور اُن کی تحریر میں خطابت کا زور اور روانی ہے اور تبلیغی مقاصد کے لیے ایسی تحریریں نہایت اثر آفرین ہوتی ہیں۔ ایک اقتباس ملاحظہ فرمائیے :

”اگر ہم نے اپنے تئیں اس سے محروم رکھا اور دنیا کے ہر حن و جمال سے اپنی زیربائش کو رونق دے لی تو پھر میں آپ سے کہتا ہوں اور یقین کی اس للزوال طاقت کے ساتھ جس کے لیے کبھی موت اور شکست نہیں اور اس بصیرت کے ساتھ جس میں نہ تذبذب ہے اور نہ تزلزل، از سر تا پا بدلے ربانی بن کر کہتا ہوں کہ یہ آپ کی سیاسی، اقتصادی اور تنظیمی جدوجہد تمام بے کار اور ضائع

۱۰ شمارہ نمبر ۵ - صفحہ ۴

ہوگی بلکہ جس قدر سعی و کوشش اپنی رہائی اور مخلصی کی کریں گے، اپنی ذلت و نامردی کی چاروں طرف لپٹی ہوئی زنجیروں کی بندش اور سخت تر ہو جائے گی اور دُنیا میں ایک لمحہ کے لیے بھی ہمیں کامیابی و کامرانی کا چہرہ دکھنا نصیب نہ ہوگا۔

آپ کہتے ہیں کہ آگ جلاتی ہے اور پانی ڈبوتا ہے، مچھلی خشکی میں اور پرند دریا میں زندہ نہیں رہ سکتے، لیکن میں کہتا ہوں یہ ممکن ہے کہ آگ نہ جلانے اور پانی نہ ڈبانے مچھلیاں خشکی میں اور پرند دریاؤں میں زندہ رہیں، لیکن یہ ناممکن ہے کہ خدا کا وہ قانونِ ہدایت و شقاوت بدل جائے جس کے لیے ایک بھی مشنئی نہیں جو کچھ میں آپ سے کہ رہا ہوں اس کے لیے میرے دل میں یقین و اذعان کی ایک ایسی جی و قائم آواز ہے جس کی ترجمانی کے لیے افسوس کہ میرا خزیبۃ الفاظ ناکافی ہے اور میں حیران ہوں کہ کس طرح اس دلی یقین کو آپ کے دلوں میں پیدا کروں۔ تاہم میں یہ کہوں گا اور حجب تک میرے قلم میں روانی اور زبان میں طاقت گویا بی ہے یہ کہوں گا اور کتنا چلا جاؤں گا اور یہ کہنے سے کبھی نہ تنھکوں گا کہ کتاب اللہ کے جن احکام کو اور رسول اللہ کی جن سنتوں کو تم مذہبی بندش کہہ کر گزر جاتے ہو، وہ بندش تو ضرور ہے لیکن یاد رکھو! کہ نظم کائنات کے تمام اجزاء اسی بندش سے بندھ کر مرتب اور منظم ہوئے ہیں اور یہی وہ بندش ہے جس کو سانِ الہی نے کہیں ”حدود اللہ“ اور کہیں ”سُننۃ اللہ“ کے الفاظ سے تعبیر کیا ہے اور کبھی ”صراطِ مستقیم“ اور دینِ ”قیم“ کا خطاب دیا ہے۔

”صراطِ مستقیم“ میں مذہبی فرقہ بندیوں کے خلاف انہوں نے بھرپور آواز اٹھائی اور مسلمانوں کو اتحاد و یکجا نگت کی دعوت دی۔ اس مضمون کی تیسری قسط میں یوں رقمطراز ہیں:

”قرآن کریم نے سنجی کے ساتھ اس اختلاف اور فرقہ بندی سے منع کیا اور گروہ قہوموں کے نقش قدم پر چلنے سے روکا اور مسلمانوں کی شان کے اس کو کبھی خلاف بیان کیا اور فرمایا:
 وَلَا تَكُونُوا كَالَّذِينَ تَفَرَّقُوا وَاخْتَلَفُوا مِنْ بَعْدِ مَا جَاءَهُمُ الْبَيِّنَاتُ -

”مسلمانو! تم ان لوگوں کی طرح نہ ہو جاؤ جنہوں نے اپنے آپ کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیے اور اللہ تعالیٰ کے صریح احکام کے ہوتے ہوئے پھر بھی اختلاف کیا۔ آج ہم نے بھی خدا کے صریح احکام کے ہوتے ہوئے تفرق و تحزب کی شدید ترین ملامت قرآن مجید میں پڑھتے ہوئے اور اسی اختلاف و فرقہ بندی سے اگلی امتوں کی تباہ حالیاں معلوم کر لینے کے بعد اسلام کو بھی کئی فرقوں میں تقسیم کر دیا۔ پس نہ تو گزشتہ قوموں سے ہم عبرت حاصل کر سکے اور نہ ہم نے اللہ کی کتاب کی اس بارہ میں ترغیب و ترہیب کو قبول کیا۔ اس نے تو یہ فرمایا کہ

إِنَّ الَّذِينَ تَفَرَّقُوا دِينَهُمْ وَكَانُوا شِيعًا لَسْتَ مِنْهُمْ فِي شَيْءٍ (۲۰ ع-۲۱)
 (جن لوگوں نے مذہب میں تفرقہ اندازی کی اور اسے مختلف فرقوں میں تقسیم کر دیا ہے، تمہارا ان سے کوئی واسطہ نہیں ہے)

لیکن ہم نے کہا کہ اسلام چار فرقوں میں منقسم ہے اور جو ان چار فرقوں سے علیحدہ ہو اور نہ ناری اور صہبی ہے اور اسکا اسلام سے کوئی واسطہ نہیں اور اگر اسی پر کفایت کرنے تو ایک بات بھی تھی، لیکن اس کے بعد ہنرفریق نے دوسرے فریق کے ساتھ نفرت و حقارت کا سلوک کیا۔ نماز جو سب مسلمانوں کو خدا کے حضور جمع کرنے والی چیز تھی، اس میں ہم نے کہا کہ شافعی امام کے پیچھے حنفی کی نماز جائز نہیں اور حنفی کے پیچھے شافعی کی نماز جائز نہیں۔ اس تفریق و تجزی کو ہم نے معراج کمال تک پہنچانے کے لیے بیت اللہ، مسجد الحرام کے بھی چار ٹکڑے کر دیے۔ وہ جگہ جو وحدت اسلام اور اتحاد کلمۃ المسلمین کے بہترین مناظر پیش کرتی تھی، اس میں ہم

نے یہ منظر پیش کیا کہ اگر حنفی نماز پڑھے ہیں تو شافعی بیٹھے اُن کا منہ تک رہے ہیں اور اس انتظار میں ہیں کہ کب اُن کا امام آئے تو نماز پڑھیں اور اگر شافعی نماز پڑھے ہیں تو حنفی نہایت اطمینان سے بیٹھے ہوئے منتظر ہیں کہ حنفی امام آئے تو نماز پڑھیں۔

لیکن اس جہل و بے بصیرتی کو ملاحظہ کیجیے کہ یہ اختلاف و فرقہ بندی جو مسلمانوں کی تباہی کا باعث ہوئی، اس کو ”اختلاف اُمتی و رحمة“ دیرمی اُمت کا اختلاف رحمت ہے، سنا کہ مسلمانوں کے لیے مرغوب و محبوب طبائع بنانے کی کوشش کی۔ پس اس قوم کی بدبختی و نامرادی پر جتنا بھی افسوس کیا جائے کم ہے۔ جو پیاس اور تشنگی کی ہلاکت سے بچنے کے لیے رنگ زر کی طرف دوڑی چلی جا رہی اور ریت کے چپکے ہوئے ذروں کو سمجھ رہی ہو کہ یہ میٹھے پانی کا تالاب ہے۔ لیکن یاد رکھو! کہ جس طرح ریت کا چٹیل میدان اس کے لیے سیرگامی اور سیرانی کا کوئی پیغام اپنے اندر نہیں رکھتا، ٹھیک اسی طرح یہ اختلاف اور فرقہ بندی بھی تمہارے لیے کوئی پیغام رحمت نہیں رکھتی اور اگر آج بھی اس اختلاف اور فرقہ بندی کو تم اپنے لیے رحمت سمجھتے ہو حیب کہ اس کی بدولت تمہاری قوی زندگی کا تقریباً خاتمہ ہو چکا ہے تو پھر تمہاری مثال اُس نادان مرعین کی سی ہے جو بدن کو کبھی مادہ سے چھوڑتے ہوئے دیکھ کر خوش ہو رہا ہو کہ میں تنومند اور طاقتور ہو رہا ہوں، حالانکہ وہ زندگی کے آخری لمحات ختم کر رہا ہے اور قریب ہے کہ وہ زہر اس کے بدن کے ٹکڑے ٹکڑے کر دے۔ لیکن تم نے مصری کے دھوکے میں جو زہر کی ڈلی کھائی ہے اُس نے توجہ اسلام کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیے ہیں۔ اب کس چیز کا انتظار ہے؟

”توحید“ میں ایک مضمون ”عید مولد النبی صلی اللہ علیہ وسلم“ کے عنوان سے لکھا جس میں کتاب و سنت کی روشنی میں مجالس میلاد کا تجزیہ کیا گیا ہے، لیکن ملاحظہ فرمائیے کہ کس حکمت اور حُسنِ سلیقہ سے بدعات و محدثات سے بچنے کی تلقین کی ہے مضمون کے ابتدائی حصے میں امر بالمعروف کے لیے زمین یوں ہموار کرتے ہیں :

”اس میں کوئی شک نہیں کہ عشقِ محمدیؐ اور محبتِ نبویؐ کے پاکیزہ جذبات اور ذوق و شوق کے مخلصانہ ولولے ایک مومنِ قانت اور مُسلمِ صادق کی زندگی کی سب سے قیمتی متاع اور محبوب جنس ہے اور یہ صحیح ہے کہ یہ محبت اور شیفنگلی انسانی سعادت اور صداقت کا سرچشمہ ہے کیونکہ یہ محبت و عقیدت اُس مقدس و مطہر وجود کے ساتھ ہے جس کو خدا نے تمام کائناتِ انسانی میں ہر طرح کی غیوریت اور ہر قسم کی محمودیت کے لیے چُن لیا ہے اور اس سے زیادہ کیا کہا جاسکتا ہے کہ اس کائناتِ ارضی میں بڑی سے بڑی بات جو کسی انسان کے لیے کسی جاسکتی ہے، زیادہ سے زیادہ عشق اور اعلیٰ سے اعلیٰ مدح و ثنا جو کسی انسان کے لیے کی جاسکتی ہے غرضکہ انسان کی زبان انسان کے لیے جو کچھ کہہ سکتی ہے اور کر سکتی ہے وہ سب کا سب اس کامل انسان اور اکمل ”عبد“ کیلئے ہے جس کو خدا نے اپنی غلامی کے لیے مخصوص کر لیا جس کو خدا نے عبوریت کے عہد و شرف سے سب سے زیادہ بہرہ ور کیا :

”سُبْحَانَ الَّذِي اسْرَىٰ لِعَبْدِهِ لَيْلًا مِنَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ إِلَى الْمَسْجِدِ الْأَقْصَىٰ“

دکھایا پاک ہے وہ خداوندِ قدوس جس نے ایک رات اپنے بندے کو مسجد

حرام سے مسجدِ اقصیٰ تک کی سیر کرائی۔

اور جس کو کبھی تو ”يَا أَيُّهَا الرَّسُولُ“ کے خطابِ عزت سے نوازا، اور کبھی

”یا ایہا المزمّل“ کے طریقِ محبت سے پکارا اور کبھی ”یا ایہا المدثر“ کی صدائے شفقت سے سرفرازا اور جس آبادی میں وہ بسا اور جس شہر کی گلیوں میں وہ چلا پھرا، کبھی اس کی عزت و عظمت کو دُنیا میں نمایاں کرنے کے لیے فرمایا: ”کَا اقسَم بَہَذَا البِلَدِ وَ اَنْتَ حَل بَہَذَا البِلَدِ“

(ہم مکہ کی قسم کھاتے ہیں یعنی جس سرزمین پر تو رہا اور بسا ہے)

پس جس کی محبِ پریت اور محمودیت کا یہ مرتبہ ہو اس کی یاد میں غنّی گھڑیاں کٹ جائیں اور جتنی بھی رائیں آنکھوں میں بسر ہو جائیں اور اس کی محبت و عشق اور مدح و ثنا میں جس قدر بھی زبانیں زمر نہ پیرا ہوں یقیناً روح کی سعادت اور دل کی طہارت اور نظمانیت کا حاصل ہے لیکن آپ کی ولادت، آپ کی حیاتِ طیبہ کا ذکر اور اس کے لیے مجالس کا انعقاد اسی وقت ذریعہ ارشاد و ہدایت ہو سکتا ہے جب کہ یہ مجالس و محافل ”اسرہ حسنہ“ کے جمال کی تجلی گاہ

ہوں۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے صحیح حالاتِ زندگی سنائے جائیں۔ آپ کے اخلاقِ عظیمہ، خصائلِ کریمہ اور سننِ مطہرہ کی طرف لوگوں کو دعوت دی جائے۔ یہ مضمون کے آخری حصے میں امر بالمعروف کا فریضہ یوں انجام دیتے ہیں:

”ربیع الاول کے مہینہ میں ہر جگہ عید میلاد کی مجلسیں منعقد ہوتی ہیں اور ماہِ ربیع الاول میں تشریف لانے والے مقدّس انسان کی یاد کو زندہ رکھنے کے لیے مدح و ثنا کی صدائیں بلند ہوتی ہیں اور غنا و سرود کے نعموں میں فضائلِ مدحیہ پڑھے جاتے ہیں۔ کافر و شیعوں کی فتنیلیں روشن کی جاتی ہیں، چھوٹیوں کے گلدستے سجائے جاتے ہیں۔ مجلس میں گلاب کے چھینٹوں سے مشامِ روح کو معطر کیا جاتا ہے۔“

لیکن اسے کاشن کہ جس کی یاد اور محبت میں ہم اپنے گھروں کو مجلسوں سے آباد کرتے ہیں، اس کی جگہ دل کی اجڑی ہوئی بستیوں کو آباد کرتے، پھولوں کے گلہ ستنوں کی جگہ ہم اپنے اعمالِ حسنہ کے مڑھائے ہوئے پھول کو تازہ کرتے اور روشن قندیلیوں کی جگہ ہم اپنے دل کی اندھیاری کو دور کرنے کے لیے چراغِ مصطفویٰ کو تلاش کرتے۔ نہیں بلکہ میں تو یہ کہتا ہوں کہ اگر ہماری مجلسیں تاریک ہونیں، ہمارے اینٹ اور چُونے کے مکانوں کو زریب و زینت کا ایک ذرہ بھی نصیب نہ ہوتا، ہماری آنکھیں رات رات بھر مجلسِ آراہوں میں نہ جاگتیں، ہماری زبانوں سے ماہِ ربیع الاول کی ولادت کے لیے دُنیا ایک حرف بھی نہ سُنتی، لیکن ہماری رُوح معمور ہوتی، ہماری دل کی بستی نہ اُجڑتی اور ہماری زبانوں سے نہیں بلکہ ہمارے خصائلِ حمیدہ، اخلاقِ کریمہ اور اعمالِ حسنہ کے اندر سے اسوۂ حسنہ نبویؐ کی مدح و ثنا کے ترانے اُٹھتے۔ دُنیا ہم کو، ہمارے اعمال کو، ہمارے حسنِ معاملات، شرفیاناہ عادات، مخلصانہ عبادات و اطاعات اور صدقِ عقالت کو دیکھ کر اعزاز و تعظیم کی صداؤں میں پیکار اُٹھتی کہ یہ خیر الامم "امتِ مسلمہ" ہے۔

تبلیغی مضامین کے علاوہ "توحید" میں حضرت والد علیہ الرحمہ نے بلند پایہ علمی اور تحقیقی مضامین بھی لکھے۔ ایک مضمون "امام ہدایت

علمی مضامین

اور امامِ سیاستؑ کے عنوان سے تین قسطوں میں لکھا جس میں منصبِ امامت پر نہایت شرح و بسط سے روشنی ڈالی۔ ایک تحقیقی مضمون "تدوینِ حدیث" پر لکھا جس کا عنوان: "تاریخِ جمع و تدوینِ احادیثِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم" ہے۔ اس مضمون میں یہ تحقیق کی گئی ہے کہ عہدِ نبویؐ اور عہدِ صحابہؓ و تابعینؒ میں حدیث کا کتنا سرمایہ ضبطِ تحریر میں اُچکا تھا اور آیت "يَعْلَمُهَا الْكِتَابُ وَالْحِكْمَةُ" اور "ثُمَّ اِنْ عَلَيْنَا بَيَانُهُ" کی تشریح بھی فرمائی ہے۔

لے شماره نمبر ۲، ج ۱ صفحہ ۲ سے شماره نمبر ۱۲، ۱۳، ۱۴، ۱۵، ج ۱ سے شماره نمبر ۳

صحابیانہ نوک جھونک

اپنے ہم عصر صحافیوں سے کبھی کبھار نوک جھونک بھی کرتے تھے۔ حضرت والد علیہ الرحمہ نے ایک مضمون ”توحید میں

لکھا جس میں مولانا غلام رسول ہنر کی سیاسی زندگی کی نیرنگیوں اور سائنس کمیشن کے آنے سے پہلے اور بعد کے موقف کا ذکر کرنے کے بعد دریافت کیا تھا کہ یہ مولانا ہنر کا سیاسی اصطلاح ہے؟ مولانا ہنر نے ”الغلاب“ میں ”سچائی کی شدھی“ کے عنوان سے اس کا جواب دیا۔ بڑی دلچسپ نوک جھونک رہی۔ مولانا ہنر کے جواب میں حضرت والد علیہ الرحمہ نے بھرپور وار کیا۔ مولانا ہنر سے خطاب کرتے ہوئے یوں رقمطراز ہیں:

”آپ فرماتے ہیں: ”یہ نہ سمجھا جائے کہ میں اپنے عزیز دوست کے خلاف نہایت تلخ حقائق پیش کرنے سے عاجز ہوں۔ ہرگز نہیں۔ میرے دامن معلومات میں خدا کے فضل سے بہت کچھ جمع ہے اور لغت پر بھی مجھے کم از کم اتنا عبور ضرور حاصل ہے کہ اس سے کام لے کر اپنے دوست کو برسوں انگاروں پر لوٹا سکتا ہوں۔“ اس کے جواب میں اپنے دوست سے عرض کروں گا کہ آپ بے شک میرے خلاف حقائق پیش کرنے میں کوتاہی نہ کریں اور اپنی لغت دانی سے کم از کم نہیں بلکہ زیادہ سے زیادہ فائدہ اٹھاتے ہوئے جو کچھ لکھ سکتے ہیں؟ لکھ لیجیے اور آپ کے ترکش میں جس قدر تیر ہیں ایک ایک کا مجھ کو نشانہ بنا کر دیکھیے۔ لیجیے میں آپ کو اور آپ کے تمام رفقاء کو دعوت دیتا ہوں کہ جو کچھ آپ سے بن پڑتا ہے گزر بیٹے اور پھر دیکھیے لیجیے کہ آپ مجھے کتنے سال انگاروں پر لوٹا سکتے ہیں! فاجعوا امرکم وشرکاءکم ثم لا یکن امرکم علیکم عمدہ ثم اقصوا الی ولا تنظروا۔“

تم اور تمہارے سب رفقاء مل کر ایک تدبیر کرو، پھر ہماری تدبیر تم میں سے کسی سے پوشیدہ نہ رہے اور سب کے سب اس کی تکمیل میں شریک ہو جاؤ

پھر جو کچھ تم کو میرے خلاف کرنا ہے کر گزرو اور مجھے کوئی مُسکت نہ دو۔
 عزیزِ من! سونے کو کسوٹی پر کسنے کی کیا دھمکی دیتے ہو، یہ دھمکی تو بیتیل کے
 چمکیلے زیوروں کے لیے ہو سکتی ہے جن کی چمک اور دلفریبی کو کسوٹی کی ایک
 رگڑ مات کر سکتی ہے۔ بھلا جو شخص اپنی مستقل سیاسی زندگی کے پہلے ہی سال میلن
 سیاست کی خاردار جھاڑیوں سے اُلجھ کر رہ گیا ہو اور اس راستہ کی ابھی ایک منزل
 بھی طے نہ کرنے پایا ہو کہ دلدل میں چھنسن کر قافلہ والوں سے بچھڑ گیا ہو، اور
 جوں جوں اس دلدل سے نکلنے کی کوشش کر رہا ہو اور دھنسا چلا جا رہا ہو وہ
 اُس شخص کو دھمکی دے سکتا ہے جو ایسی کئی دلدلوں سے پاؤں نکال کر گزر گیا
 ہو اور ایسی کئی جھاڑیوں سے دامن بنگال کر نکل گیا ہو، جس کو ایک سائمن کینٹن
 نہیں ایسے کئی راہزنوں نے مکند پھینکی ہو، جس کو ایک سر شفیق نہیں، ایسے کئی
 فسوں سازوں نے اپنا افسونِ محبت چھوڑا ہو، جس کو ایک سراقبال نہیں، ایسے
 کئی ہوشربا ساقیوں نے جام بھر بھر کر پیش کیے ہوں لیکن نہ لو کسی کی کند اس
 کے پاؤں کو چھنسا سکی، نہ کسی کا افسوں اس کو مسحور کر سکا۔ نہ کسی کی غمخوار آنکھ اس
 کو اپنی طرف مائل کر سکی، اس کو بھلا وہ شخص دھمکی دے سکتا ہے جس نے بازارِ طمع
 کی پہلی ہی دوکان پر اپنی عقل و خرد کی متاع کو فروخت کر دیا ہو۔ جو شخص ۱۹۱۹ء
 سے لے کر اس وقت تک برابر ایک ہی راستہ پر قائم ہو اور باوجود ہر قسم کی مالی
 پریشانیوں اور دشمنوں کی ایذا رسانیوں کے اس کا لغو ایک ہی رہا ہو:

شاد باسش اے عشقِ خوش سودائے ما
 اے طبیبِ مجملہِ علتِ ہائے ما
 اے دوائے نخوت و ناموسِ ما
 اے تو اسلاطون و جالینوسِ ما

جس کی اس نوسال کے عرصہ میں یہ حالت ہو گئی ہو کہ جس درد کو داغ اور پھر نغم بنا کر اپنے پہلو میں پالا ہوا درد ہر چند کہ صحرائے نجد کے دیوانے کی طرح وہ بتنا کرتا ہو کہ اس عشق سے توبہ کرے اور اس درد کو جو آبِ ناسور کی شکل میں نہان خانہ دل میں محفوظ ہے نکال پھینکے، لیکن اس کی حالت یہ ہو:

أَلَيْسَ وَعَدْتَنِي يَا قَلْبُ الْفِي إِذَا مَا تَبَتَّ عَنْ لَيْلِي تَتَوَّبُ
فَمَا أَنَا تَائِبٌ عَنْ حُبِّ لَيْلِي فَمَا لَكَ كَلِمًا ذَكَرْتَ تَذَوَّبُ لِي

بھلا اس شخص کو وہ دھمکی دے سکتا ہے جو اپنی منتقل سیاسی زندگی کے پہلے ہی سال گھٹنوں کے بل کر کر اپنی ٹانگوں کو نثرل کر چکا ہے؛ جس کے لیے ہماری شہادت کی ضرورت نہیں بلکہ مولانا مہر کا اپنا نامہ اعمال ”انقلاب“ خود اس کا بہترین شاہد ہے۔

اقْرَأْ كِتَابَكَ كَفَىٰ بِنَفْسِكَ الْيَوْمَ عَلَيْكَ حَسِيبًا

توحید کا آخری شمارہ یکم مئی ۱۹۲۹ء کو شائع ہوا۔ اس کے بعد حالات کی نامساعدت کی وجہ سے جاری نہ رہ سکا۔

حضرت والد علیہ الرحمہ کے علاوہ بہت سے ممتاز علماء اور مقتدر رہستیوں کے مضامین ”توحید“

توحید میں لکھنے والے

میں چھپتے رہے جن میں سے چند ایک کے اسمائے گرامی یہ ہیں:

مولانا سید سلیمان ندوی، مولانا ابوالکلام آزاد، مولانا عبدالواحد غزنوی، قاضی محمد سلیمان منصور پوری، مولانا اسماعیل غزنوی، مولانا محمد علی قصوری ایم اے، مولانا محی الدین قصوری۔

لے ترجمہ: اسے دل انونے وعدہ نہ کیا تھا کہ جب میں لیلیٰ کی محبت سے توبہ کر لوں گا تو تو بھی باز آجائے گا۔ لو میں اس کی محبت سے تائب ہوتا ہوں، لیکن اسے دل تجھے کیا ہو گیا ہے کہ جب بھی اس کا ذکر چھڑتا ہے تو گھٹنے گنتا ہے۔ (دُرُوب، ۱۷۷ شمارہ نمبر ۲۴-۲۵ ج ۳)

جماعتِ اہلحدیث کی تنظیم

۱۹۴۷ء میں تقسیم ملک کے بعد جماعتِ اہلحدیث کی از سر نو تنظیم پر انہوں نے اپنی توجہ مرکوز کر دی اور بڑی محنت اور جانفشانی سے مغربی پاکستان کے تمام علاقوں کا دورہ کیا۔ قریب قریب بستی بستی خود تشریف لے گئے اور جماعت کو منظم کیا۔ جماعت میں رکن سازی کا شعور پیدا کیا۔ ابتدائی شہری اور ضلعی جمعیتوں کا قیام عمل میں لایا گیا۔ مجلسِ شوریٰ قائم کی گئی۔ جماعتِ اہلحدیث کی تاریخ میں یہ شرف انہی کو حاصل ہوا کہ جماعت کے لیے باضابطہ دستور مرتب کیا اور اسے جماعت میں نافذ کیا۔ مختلف علاقوں کے اہلحدیث عوام میں باہم تعلق اور ربط پیدا کرنے کے لیے اور تبلیغ و اشاعتِ دین کی غرض سے متعدد سالانہ کانفرنسوں کا اہتمام کیا۔

اس دستور کا انداز اور ڈھانچہ تقریباً وہی تھا جو کانگریس کے دستور کا تھا۔ میں نے ایک دن نہایت ادب کے ساتھ ان کی خدمت میں عرض کیا:

”کانگریس ایک سیاسی جماعت ہے اور اس کے لیے یہ دستور بالکل درست ہے اور انتخابات کی ہم سے اس کے سیاسی مزاج میں پختگی پیدا ہوتی ہے لیکن جماعتِ اہلحدیث جس کا اولین مقصد تبلیغ و احیائے دین ہے اس کا الیکشن کی اکھاڑ بچھاڑ میں لگے رہنا اس کے لیے سببِ قاتل ہے۔ جماعت کے سربراہ اور وہ افراد کی صلاحیتیں انتخابات لڑنے اور جیتنے ہی میں غارت ہو جائیں گی اور وہ تمام بیماریاں جو سیاسی جماعتوں میں ہیں، جماعتِ اہلحدیث میں بھی سراپت کر جائیں گی۔ — جھوٹا پروپیگنڈا، اکھاڑ بچھاڑ، سازباز، حُبِ مال، حُبِ جاہ۔ للہیت اور رُوحانیت برباد ہو جائے گی۔ تزکیہٴ نفس، رُوحانی تربیت اور اعلیٰ کلمۃ الحق کا وہ عظیم مقصد جو ہمارے اسلاف کے پیشِ نظر تھا“

نظروں سے اوجھل ہو جائے گا۔“

حضرت والد علیہ الرحمہ سے میری یہ گفتگو ان کی آخری عمر میں ہوئی تھی، جب وہ خود بھی اس دستور کو آزما چکے تھے۔ وہ میری بات پوری توجہ اور دلچسپی سے سنتے رہے۔ اگرچہ وہ خاموش رہے لیکن ان کا چہرہ اور ان کی آنکھیں میری گفتگو پر تصدیق اور توثیق کی مہریں ثبت کر رہی تھیں۔ میں نے بات جاری رکھتے ہوئے عرض کیا:

”ایک دینی جماعت کا نظام ایسا ہونا چاہیے کہ اس میں مال اور عموں کی ہوس کے سب مواقع بند کر دیے جائیں اور صرف وہی لوگ اس میں ٹھہریں جو مشنری سپرٹ کے ساتھ محض رضائے الہی کے لیے کام کرنے کا جذبہ رکھتے ہوں، جو اپنا وقت، اپنا مال، اپنی توانائی اور اپنی تمام صلاحیتیں اللہ کی راہ میں کھپا سکیں۔“ میں نے عرض کیا: دینی جماعت کا نظام ایسا ہونا چاہیے کہ حصولِ رضائے الہی کے سوا کسی اور مقصد کے لیے داخل ہونے والوں کا سانس اس مقدس فضا میں گھٹنے لگے اور جماعت کے ہر فرد کے دل و دماغ پر ایک ہی بات چھائی ہوئی ہو۔ ————— الہی انت مقصودی و رضاٹ مطلوبی۔“

حضرت والد علیہ الرحمہ نے فرمایا تم جن خدشات کا اظہار کر رہے ہو، وہ سب معرضِ وجود میں آچکے ہیں۔ پھر زیر لب مسکراتے ہوئے یہ شعر پڑھا:

اَيْتَهَا النَّفْسُ اَجْمَلِيْ جَزَعًا اِنَّ مَا تَحْذَرِيْنَ قَدْ وَقَعَا

داغے دل، گھبراہٹ کا اظہار ذرا حُسنِ سلیقہ سے کر، جس بات سے تم ڈرتے تھے وہ معرضِ وجود میں آچکی،

چند اہم واقعات

۱۹۵۳ء میں تحریکِ ختمِ نبوت

اور اس کی تحقیقات

تحریکِ ختمِ نبوت کی تحقیقاتی عدالت میں

کے لیے حکومت کی طرف سے سابق چیف جسٹس مسٹر محمد مینز اور جسٹس ایم آر کیانی پر مشتمل ایک عدالت مقرر کی گئی۔ سب جماعتوں کے الگ الگ وکیل تھے جو تحقیقاتی عدالت کے سامنے اپنا اپنا نقطہ نظر پیش کرتے تھے۔ تحفظِ ختمِ نبوت کے راہنما جیل میں بند تھے۔ مذہبی جماعتوں کے متحہ معاذ کی مجلسِ عمل کے ناظم اعلیٰ حضرت والد علیہ الرحمہ تھے۔ مجلسِ عمل کے وکیل مسٹر حسین سہروردی مرحوم تھے اور والد علیہ الرحمہ انہیں تیاری کرتے تھے، لیکن مسئلہ میں کچھ ایسی علمی پیچیدگیاں تھیں اور اس کی نوعیت میں کچھ ایسے الجھاؤ تھے کہ سہروردی صاحب نے وکالت سے معذرت چاہی اور وکالت و نمائندگی کا تمام بوجھ حضرت والد علیہ الرحمہ پر ان پڑا۔ ان کی بحث اور دلائل سے متاثر ہو کر ایک دن جسٹس کیانی نے کہا:

”اگر میرے بس میں ہوتا، تو میں آپ کو وکالت کا لائسنس دے دیتا۔ میں

آپ کے دلائل سے بہت متاثر اور مستفید ہوتا ہوں۔“

جسٹس مینز نے ان سے سوال کیا: ”کیا آپ کے دادا مرحوم کو غزنی سے اس لیے نکال

دیا گیا تھا کہ وہ اہلحدیث تھے اور احناف انہیں برداشت نہیں کرتے تھے؟“

حضرت نے فرمایا: ”نہیں! ان کو تو اس لیے نکالا گیا تھا کہ وہ بہت بڑے ولی تھے

اور ان کا حلقہ ارادت اس قدر وسیع ہو گیا تھا کہ حکومت کو یہ خطرہ لاحق ہو گیا تھا کہ وہ کہیں حکومت

پر قابض نہ ہو جائیں۔“

میں صاحب نے درحقیقت یہ سوال اس مقصد سے کیا تھا کہ وہ لوگوں پر ظاہر کریں

کہ خود احناف اور اہلحدیث کے درمیان اختلافات کی ایک وسیع خلیج حاصل ہے، لیکن حضرت اُن کے دام میں نہیں آتے تھے۔ مُنیر صاحب نے پختہ ابدلا اور ایک اور سوال میں پھنسانا چاہا: ”کیا آپ“ یا شیخ عبدالقادر جیلانی شنیاً اللہ“ کہنے والے کو مُشرک قرار دیتے ہیں؟“ فرمایا: ”یہ کہنے والے کی تبت پر منحصر ہے۔ ہر وہ شخص جو یہ الفاظ زبان سے نکالتا ہے، مُشرک نہیں قرار دیا جاسکتا۔ ابھی آپ نے بھی یہ الفاظ زبان سے نکالے ہیں مگر ہم آپ کو مُشرک نہیں کہیں گے۔“ وہ پھر دام سے صاف بچ کر نکل گئے۔

جسٹس مُنیر صاحب نے اُن سے ایک سوال یہ بھی کیا:

”مولانا! آپ عبدالوہاب کو اپنا مذہبی راہنما مانتے ہیں؟“

اُنہوں نے جواب دیا: ”عبدالوہاب نام کا کوئی شخص ہمارا مذہبی راہنما نہیں ہے۔“

مُنیر صاحب نے اپنی بات پر اصرار کرتے ہوئے کہا:

”عبدالوہاب آپ کا راہنما ہے۔“

حضرت نے سختی سے انکار کیا کہ نہیں ہے۔ جب دو تین دفعہ دونوں کے درمیان ہے

اور نہیں ہے، کی تکرار ہوئی تو مُنیر صاحب بول کھلا گئے مُنیر صاحب کی گھبراہٹ دیکھ کر حضرت

نے کہا: ”غالبا آپ کی مُراد محمد بن عبدالوہاب سے ہے۔“

کہنے لگے: ”جی ہاں! میری مُراد یہی ہے۔“

حضرت نے فرمایا: وہ عبدالوہاب نہیں، محمد بن عبدالوہاب ہیں۔“

مُنیر صاحب نے کہا: اس سے کیا فرق پڑتا ہے؟

فرمایا: ”واہ! باپ اور بیٹے کا فرق آپ کے نزدیک کوئی فرق نہیں؟“

اس کے بعد مُنیر صاحب کو اس سلسلے میں سوال و جواب کی تہمت نہ ہوئی۔

۱۹۵۸ء میں جب مارشل لاء ملک میں

نافذ ہوا، تو ہر طرف ہراس چھایا ہوا

مارشل لاء کے زمانہ میں آوازہ سچی

تھا۔ سب کی زبانیں گنگ ہو گئی تھیں۔ بڑے بڑے جنادری لیڈروں کی تحریر و تقریر یہ اہمیت
ہو گئی تھی۔ راقم الحروف حالات کی نگینہ پر یہ شعر پڑھتا تھا :

نثار میں تیری گلیوں پر اسے وطن ! کہ جہاں
چلی ہے رسم کہ کوئی نہ سراٹھا کے چلے

اس مجھوڈ کی برف توڑنے کی سعادت حضرت والد علیہ الرحمہ کو حاصل ہوئی اور
منگل پارک کے میدان میں عید کے خطبے میں مارشل لا کی خوب دھجیاں بکھیریں اور فوجی
حکومت کی روش پر وائسٹگاف لفظوں میں تنقید کی۔

فروری ۱۹۶۰ء میں سابق صدر
ایوب نے ملک میں آئین دستور

آئین کمیشن کے سوالنامے کا جواب

کے لیے ایک آئین کمیشن مقرر کیا تھا۔ اس کمیشن کی طرف سے چالیس سوالات پر مشتمل ایک
سوالنامہ مرتب کیا گیا تھا، جو اخبارات میں شائع ہوا اور ملک کی مشہور شخصیتوں کو بھی سرکاری
طور پر بھیجا گیا تھا۔ مقصد یہ تھا کہ حکومت کو اس کا مناسب جواب دیا جائے اور آئینہ دستور اس
جواب کی روشنی میں ترتیب دیا جائے۔

اس ضمن میں حضرت والد علیہ الرحمہ نے مولانا ابوالاعلیٰ مودودی صاحب اور دوسرے
علماء سے رابطہ قائم کیا اور ۵، ۶، ۷، ۸، ۹، ۱۰، ۱۱، ۱۲، ۱۳، ۱۴، ۱۵، ۱۶، ۱۷، ۱۸، ۱۹، ۲۰، ۲۱، ۲۲، ۲۳، ۲۴، ۲۵، ۲۶، ۲۷، ۲۸، ۲۹، ۳۰، ۳۱، ۳۲، ۳۳، ۳۴، ۳۵، ۳۶، ۳۷، ۳۸، ۳۹، ۴۰، ۴۱، ۴۲، ۴۳، ۴۴، ۴۵، ۴۶، ۴۷، ۴۸، ۴۹، ۵۰، ۵۱، ۵۲، ۵۳، ۵۴، ۵۵، ۵۶، ۵۷، ۵۸، ۵۹، ۶۰، ۶۱، ۶۲، ۶۳، ۶۴، ۶۵، ۶۶، ۶۷، ۶۸، ۶۹، ۷۰، ۷۱، ۷۲، ۷۳، ۷۴، ۷۵، ۷۶، ۷۷، ۷۸، ۷۹، ۸۰، ۸۱، ۸۲، ۸۳، ۸۴، ۸۵، ۸۶، ۸۷، ۸۸، ۸۹، ۹۰، ۹۱، ۹۲، ۹۳، ۹۴، ۹۵، ۹۶، ۹۷، ۹۸، ۹۹، ۱۰۰، ۱۰۱، ۱۰۲، ۱۰۳، ۱۰۴، ۱۰۵، ۱۰۶، ۱۰۷، ۱۰۸، ۱۰۹، ۱۱۰، ۱۱۱، ۱۱۲، ۱۱۳، ۱۱۴، ۱۱۵، ۱۱۶، ۱۱۷، ۱۱۸، ۱۱۹، ۱۲۰، ۱۲۱، ۱۲۲، ۱۲۳، ۱۲۴، ۱۲۵، ۱۲۶، ۱۲۷، ۱۲۸، ۱۲۹، ۱۳۰، ۱۳۱، ۱۳۲، ۱۳۳، ۱۳۴، ۱۳۵، ۱۳۶، ۱۳۷، ۱۳۸، ۱۳۹، ۱۴۰، ۱۴۱، ۱۴۲، ۱۴۳، ۱۴۴، ۱۴۵، ۱۴۶، ۱۴۷، ۱۴۸، ۱۴۹، ۱۵۰، ۱۵۱، ۱۵۲، ۱۵۳، ۱۵۴، ۱۵۵، ۱۵۶، ۱۵۷، ۱۵۸، ۱۵۹، ۱۶۰، ۱۶۱، ۱۶۲، ۱۶۳، ۱۶۴، ۱۶۵، ۱۶۶، ۱۶۷، ۱۶۸، ۱۶۹، ۱۷۰، ۱۷۱، ۱۷۲، ۱۷۳، ۱۷۴، ۱۷۵، ۱۷۶، ۱۷۷، ۱۷۸، ۱۷۹، ۱۸۰، ۱۸۱، ۱۸۲، ۱۸۳، ۱۸۴، ۱۸۵، ۱۸۶، ۱۸۷، ۱۸۸، ۱۸۹، ۱۹۰، ۱۹۱، ۱۹۲، ۱۹۳، ۱۹۴، ۱۹۵، ۱۹۶، ۱۹۷، ۱۹۸، ۱۹۹، ۲۰۰، ۲۰۱، ۲۰۲، ۲۰۳، ۲۰۴، ۲۰۵، ۲۰۶، ۲۰۷، ۲۰۸، ۲۰۹، ۲۱۰، ۲۱۱، ۲۱۲، ۲۱۳، ۲۱۴، ۲۱۵، ۲۱۶، ۲۱۷، ۲۱۸، ۲۱۹، ۲۲۰، ۲۲۱، ۲۲۲، ۲۲۳، ۲۲۴، ۲۲۵، ۲۲۶، ۲۲۷، ۲۲۸، ۲۲۹، ۲۳۰، ۲۳۱، ۲۳۲، ۲۳۳، ۲۳۴، ۲۳۵، ۲۳۶، ۲۳۷، ۲۳۸، ۲۳۹، ۲۴۰، ۲۴۱، ۲۴۲، ۲۴۳، ۲۴۴، ۲۴۵، ۲۴۶، ۲۴۷، ۲۴۸، ۲۴۹، ۲۵۰، ۲۵۱، ۲۵۲، ۲۵۳، ۲۵۴، ۲۵۵، ۲۵۶، ۲۵۷، ۲۵۸، ۲۵۹، ۲۶۰، ۲۶۱، ۲۶۲، ۲۶۳، ۲۶۴، ۲۶۵، ۲۶۶، ۲۶۷، ۲۶۸، ۲۶۹، ۲۷۰، ۲۷۱، ۲۷۲، ۲۷۳، ۲۷۴، ۲۷۵، ۲۷۶، ۲۷۷، ۲۷۸، ۲۷۹، ۲۸۰، ۲۸۱، ۲۸۲، ۲۸۳، ۲۸۴، ۲۸۵، ۲۸۶، ۲۸۷، ۲۸۸، ۲۸۹، ۲۹۰، ۲۹۱، ۲۹۲، ۲۹۳، ۲۹۴، ۲۹۵، ۲۹۶، ۲۹۷، ۲۹۸، ۲۹۹، ۳۰۰، ۳۰۱، ۳۰۲، ۳۰۳، ۳۰۴، ۳۰۵، ۳۰۶، ۳۰۷، ۳۰۸، ۳۰۹، ۳۱۰، ۳۱۱، ۳۱۲، ۳۱۳، ۳۱۴، ۳۱۵، ۳۱۶، ۳۱۷، ۳۱۸، ۳۱۹، ۳۲۰، ۳۲۱، ۳۲۲، ۳۲۳، ۳۲۴، ۳۲۵، ۳۲۶، ۳۲۷، ۳۲۸، ۳۲۹، ۳۳۰، ۳۳۱، ۳۳۲، ۳۳۳، ۳۳۴، ۳۳۵، ۳۳۶، ۳۳۷، ۳۳۸، ۳۳۹، ۳۴۰، ۳۴۱، ۳۴۲، ۳۴۳، ۳۴۴، ۳۴۵، ۳۴۶، ۳۴۷، ۳۴۸، ۳۴۹، ۳۵۰، ۳۵۱، ۳۵۲، ۳۵۳، ۳۵۴، ۳۵۵، ۳۵۶، ۳۵۷، ۳۵۸، ۳۵۹، ۳۶۰، ۳۶۱، ۳۶۲، ۳۶۳، ۳۶۴، ۳۶۵، ۳۶۶، ۳۶۷، ۳۶۸، ۳۶۹، ۳۷۰، ۳۷۱، ۳۷۲، ۳۷۳، ۳۷۴، ۳۷۵، ۳۷۶، ۳۷۷، ۳۷۸، ۳۷۹، ۳۸۰، ۳۸۱، ۳۸۲، ۳۸۳، ۳۸۴، ۳۸۵، ۳۸۶، ۳۸۷، ۳۸۸، ۳۸۹، ۳۹۰، ۳۹۱، ۳۹۲، ۳۹۳، ۳۹۴، ۳۹۵، ۳۹۶، ۳۹۷، ۳۹۸، ۳۹۹، ۴۰۰، ۴۰۱، ۴۰۲، ۴۰۳، ۴۰۴، ۴۰۵، ۴۰۶، ۴۰۷، ۴۰۸، ۴۰۹، ۴۱۰، ۴۱۱، ۴۱۲، ۴۱۳، ۴۱۴، ۴۱۵، ۴۱۶، ۴۱۷، ۴۱۸، ۴۱۹، ۴۲۰، ۴۲۱، ۴۲۲، ۴۲۳، ۴۲۴، ۴۲۵، ۴۲۶، ۴۲۷، ۴۲۸، ۴۲۹، ۴۳۰، ۴۳۱، ۴۳۲، ۴۳۳، ۴۳۴، ۴۳۵، ۴۳۶، ۴۳۷، ۴۳۸، ۴۳۹، ۴۴۰، ۴۴۱، ۴۴۲، ۴۴۳، ۴۴۴، ۴۴۵، ۴۴۶، ۴۴۷، ۴۴۸، ۴۴۹، ۴۵۰، ۴۵۱، ۴۵۲، ۴۵۳، ۴۵۴، ۴۵۵، ۴۵۶، ۴۵۷، ۴۵۸، ۴۵۹، ۴۶۰، ۴۶۱، ۴۶۲، ۴۶۳، ۴۶۴، ۴۶۵، ۴۶۶، ۴۶۷، ۴۶۸، ۴۶۹، ۴۷۰، ۴۷۱، ۴۷۲، ۴۷۳، ۴۷۴، ۴۷۵، ۴۷۶، ۴۷۷، ۴۷۸، ۴۷۹، ۴۸۰، ۴۸۱، ۴۸۲، ۴۸۳، ۴۸۴، ۴۸۵، ۴۸۶، ۴۸۷، ۴۸۸، ۴۸۹، ۴۹۰، ۴۹۱، ۴۹۲، ۴۹۳، ۴۹۴، ۴۹۵، ۴۹۶، ۴۹۷، ۴۹۸، ۴۹۹، ۵۰۰، ۵۰۱، ۵۰۲، ۵۰۳، ۵۰۴، ۵۰۵، ۵۰۶، ۵۰۷، ۵۰۸، ۵۰۹، ۵۱۰، ۵۱۱، ۵۱۲، ۵۱۳، ۵۱۴، ۵۱۵، ۵۱۶، ۵۱۷، ۵۱۸، ۵۱۹، ۵۲۰، ۵۲۱، ۵۲۲، ۵۲۳، ۵۲۴، ۵۲۵، ۵۲۶، ۵۲۷، ۵۲۸، ۵۲۹، ۵۳۰، ۵۳۱، ۵۳۲، ۵۳۳، ۵۳۴، ۵۳۵، ۵۳۶، ۵۳۷، ۵۳۸، ۵۳۹، ۵۴۰، ۵۴۱، ۵۴۲، ۵۴۳، ۵۴۴، ۵۴۵، ۵۴۶، ۵۴۷، ۵۴۸، ۵۴۹، ۵۵۰، ۵۵۱، ۵۵۲، ۵۵۳، ۵۵۴، ۵۵۵، ۵۵۶، ۵۵۷، ۵۵۸، ۵۵۹، ۵۶۰، ۵۶۱، ۵۶۲، ۵۶۳، ۵۶۴، ۵۶۵، ۵۶۶، ۵۶۷، ۵۶۸، ۵۶۹، ۵۷۰، ۵۷۱، ۵۷۲، ۵۷۳، ۵۷۴، ۵۷۵، ۵۷۶، ۵۷۷، ۵۷۸، ۵۷۹، ۵۸۰، ۵۸۱، ۵۸۲، ۵۸۳، ۵۸۴، ۵۸۵، ۵۸۶، ۵۸۷، ۵۸۸، ۵۸۹، ۵۹۰، ۵۹۱، ۵۹۲، ۵۹۳، ۵۹۴، ۵۹۵، ۵۹۶، ۵۹۷، ۵۹۸، ۵۹۹، ۶۰۰، ۶۰۱، ۶۰۲، ۶۰۳، ۶۰۴، ۶۰۵، ۶۰۶، ۶۰۷، ۶۰۸، ۶۰۹، ۶۱۰، ۶۱۱، ۶۱۲، ۶۱۳، ۶۱۴، ۶۱۵، ۶۱۶، ۶۱۷، ۶۱۸، ۶۱۹، ۶۲۰، ۶۲۱، ۶۲۲، ۶۲۳، ۶۲۴، ۶۲۵، ۶۲۶، ۶۲۷، ۶۲۸، ۶۲۹، ۶۳۰، ۶۳۱، ۶۳۲، ۶۳۳، ۶۳۴، ۶۳۵، ۶۳۶، ۶۳۷، ۶۳۸، ۶۳۹، ۶۴۰، ۶۴۱، ۶۴۲، ۶۴۳، ۶۴۴، ۶۴۵، ۶۴۶، ۶۴۷، ۶۴۸، ۶۴۹، ۶۵۰، ۶۵۱، ۶۵۲، ۶۵۳، ۶۵۴، ۶۵۵، ۶۵۶، ۶۵۷، ۶۵۸، ۶۵۹، ۶۶۰، ۶۶۱، ۶۶۲، ۶۶۳، ۶۶۴، ۶۶۵، ۶۶۶، ۶۶۷، ۶۶۸، ۶۶۹، ۶۷۰، ۶۷۱، ۶۷۲، ۶۷۳، ۶۷۴، ۶۷۵، ۶۷۶، ۶۷۷، ۶۷۸، ۶۷۹، ۶۸۰، ۶۸۱، ۶۸۲، ۶۸۳، ۶۸۴، ۶۸۵، ۶۸۶، ۶۸۷، ۶۸۸، ۶۸۹، ۶۹۰، ۶۹۱، ۶۹۲، ۶۹۳، ۶۹۴، ۶۹۵، ۶۹۶، ۶۹۷، ۶۹۸، ۶۹۹، ۷۰۰، ۷۰۱، ۷۰۲، ۷۰۳، ۷۰۴، ۷۰۵، ۷۰۶، ۷۰۷، ۷۰۸، ۷۰۹، ۷۱۰، ۷۱۱، ۷۱۲، ۷۱۳، ۷۱۴، ۷۱۵، ۷۱۶، ۷۱۷، ۷۱۸، ۷۱۹، ۷۲۰، ۷۲۱، ۷۲۲، ۷۲۳، ۷۲۴، ۷۲۵، ۷۲۶، ۷۲۷، ۷۲۸، ۷۲۹، ۷۳۰، ۷۳۱، ۷۳۲، ۷۳۳، ۷۳۴، ۷۳۵، ۷۳۶، ۷۳۷، ۷۳۸، ۷۳۹، ۷۴۰، ۷۴۱، ۷۴۲، ۷۴۳، ۷۴۴، ۷۴۵، ۷۴۶، ۷۴۷، ۷۴۸، ۷۴۹، ۷۵۰، ۷۵۱، ۷۵۲، ۷۵۳، ۷۵۴، ۷۵۵، ۷۵۶، ۷۵۷، ۷۵۸، ۷۵۹، ۷۶۰، ۷۶۱، ۷۶۲، ۷۶۳، ۷۶۴، ۷۶۵، ۷۶۶، ۷۶۷، ۷۶۸، ۷۶۹، ۷۷۰، ۷۷۱، ۷۷۲، ۷۷۳، ۷۷۴، ۷۷۵، ۷۷۶، ۷۷۷، ۷۷۸، ۷۷۹، ۷۸۰، ۷۸۱، ۷۸۲، ۷۸۳، ۷۸۴، ۷۸۵، ۷۸۶، ۷۸۷، ۷۸۸، ۷۸۹، ۷۹۰، ۷۹۱، ۷۹۲، ۷۹۳، ۷۹۴، ۷۹۵، ۷۹۶، ۷۹۷، ۷۹۸، ۷۹۹، ۸۰۰، ۸۰۱، ۸۰۲، ۸۰۳، ۸۰۴، ۸۰۵، ۸۰۶، ۸۰۷، ۸۰۸، ۸۰۹، ۸۱۰، ۸۱۱، ۸۱۲، ۸۱۳، ۸۱۴، ۸۱۵، ۸۱۶، ۸۱۷، ۸۱۸، ۸۱۹، ۸۲۰، ۸۲۱، ۸۲۲، ۸۲۳، ۸۲۴، ۸۲۵، ۸۲۶، ۸۲۷، ۸۲۸، ۸۲۹، ۸۳۰، ۸۳۱، ۸۳۲، ۸۳۳، ۸۳۴، ۸۳۵، ۸۳۶، ۸۳۷، ۸۳۸، ۸۳۹، ۸۴۰، ۸۴۱، ۸۴۲، ۸۴۳، ۸۴۴، ۸۴۵، ۸۴۶، ۸۴۷، ۸۴۸، ۸۴۹، ۸۵۰، ۸۵۱، ۸۵۲، ۸۵۳، ۸۵۴، ۸۵۵، ۸۵۶، ۸۵۷، ۸۵۸، ۸۵۹، ۸۶۰، ۸۶۱، ۸۶۲، ۸۶۳، ۸۶۴، ۸۶۵، ۸۶۶، ۸۶۷، ۸۶۸، ۸۶۹، ۸۷۰، ۸۷۱، ۸۷۲، ۸۷۳، ۸۷۴، ۸۷۵، ۸۷۶، ۸۷۷، ۸۷۸، ۸۷۹، ۸۸۰، ۸۸۱، ۸۸۲، ۸۸۳، ۸۸۴، ۸۸۵، ۸۸۶، ۸۸۷، ۸۸۸، ۸۸۹، ۸۹۰، ۸۹۱، ۸۹۲، ۸۹۳، ۸۹۴، ۸۹۵، ۸۹۶، ۸۹۷، ۸۹۸، ۸۹۹، ۹۰۰، ۹۰۱، ۹۰۲، ۹۰۳، ۹۰۴، ۹۰۵، ۹۰۶، ۹۰۷، ۹۰۸، ۹۰۹، ۹۱۰، ۹۱۱، ۹۱۲، ۹۱۳، ۹۱۴، ۹۱۵، ۹۱۶، ۹۱۷، ۹۱۸، ۹۱۹، ۹۲۰، ۹۲۱، ۹۲۲، ۹۲۳، ۹۲۴، ۹۲۵، ۹۲۶، ۹۲۷، ۹۲۸، ۹۲۹، ۹۳۰، ۹۳۱، ۹۳۲، ۹۳۳، ۹۳۴، ۹۳۵، ۹۳۶، ۹۳۷، ۹۳۸، ۹۳۹، ۹۴۰، ۹۴۱، ۹۴۲، ۹۴۳، ۹۴۴، ۹۴۵، ۹۴۶، ۹۴۷، ۹۴۸، ۹۴۹، ۹۵۰، ۹۵۱، ۹۵۲، ۹۵۳، ۹۵۴، ۹۵۵، ۹۵۶، ۹۵۷، ۹۵۸، ۹۵۹، ۹۶۰، ۹۶۱، ۹۶۲، ۹۶۳، ۹۶۴، ۹۶۵، ۹۶۶، ۹۶۷، ۹۶۸، ۹۶۹، ۹۷۰، ۹۷۱، ۹۷۲، ۹۷۳، ۹۷۴، ۹۷۵، ۹۷۶، ۹۷۷، ۹۷۸، ۹۷۹، ۹۸۰، ۹۸۱، ۹۸۲، ۹۸۳، ۹۸۴، ۹۸۵، ۹۸۶، ۹۸۷، ۹۸۸، ۹۸۹، ۹۹۰، ۹۹۱، ۹۹۲، ۹۹۳، ۹۹۴، ۹۹۵، ۹۹۶، ۹۹۷، ۹۹۸، ۹۹۹، ۱۰۰۰، ۱۰۰۱، ۱۰۰۲، ۱۰۰۳، ۱۰۰۴، ۱۰۰۵، ۱۰۰۶، ۱۰۰۷، ۱۰۰۸، ۱۰۰۹، ۱۰۱۰، ۱۰۱۱، ۱۰۱۲، ۱۰۱۳، ۱۰۱۴، ۱۰۱۵، ۱۰۱۶، ۱۰۱۷، ۱۰۱۸، ۱۰۱۹، ۱۰۲۰، ۱۰۲۱، ۱۰۲۲، ۱۰۲۳، ۱۰۲۴، ۱۰۲۵، ۱۰۲۶، ۱۰۲۷، ۱۰۲۸، ۱۰۲۹، ۱۰۳۰، ۱۰۳۱، ۱۰۳۲، ۱۰۳۳، ۱۰۳۴، ۱۰۳۵، ۱۰۳۶، ۱۰۳۷، ۱۰۳۸، ۱۰۳۹، ۱۰۴۰، ۱۰۴۱، ۱۰۴۲، ۱۰۴۳، ۱۰۴۴، ۱۰۴۵، ۱۰۴۶، ۱۰۴۷، ۱۰۴۸، ۱۰۴۹، ۱۰۵۰، ۱۰۵۱، ۱۰۵۲، ۱۰۵۳، ۱۰۵۴، ۱۰۵۵، ۱۰۵۶، ۱۰۵۷، ۱۰۵۸، ۱۰۵۹، ۱۰۶۰، ۱۰۶۱، ۱۰۶۲، ۱۰۶۳، ۱۰۶۴، ۱۰۶۵، ۱۰۶۶، ۱۰۶۷، ۱۰۶۸، ۱۰۶۹، ۱۰۷۰، ۱۰۷۱، ۱۰۷۲، ۱۰۷۳، ۱۰۷۴، ۱۰۷۵، ۱۰۷۶، ۱۰۷۷، ۱۰۷۸، ۱۰۷۹، ۱۰۸۰، ۱۰۸۱، ۱۰۸۲، ۱۰۸۳، ۱۰۸۴، ۱۰۸۵، ۱۰۸۶، ۱۰۸۷، ۱۰۸۸، ۱۰۸۹، ۱۰۹۰، ۱۰۹۱، ۱۰۹۲، ۱۰۹۳، ۱۰۹۴، ۱۰۹۵، ۱۰۹۶، ۱۰۹۷، ۱۰۹۸، ۱۰۹۹، ۱۱۰۰، ۱۱۰۱، ۱۱۰۲، ۱۱۰۳، ۱۱۰۴، ۱۱۰۵، ۱۱۰۶، ۱۱۰۷، ۱۱۰۸، ۱۱۰۹، ۱۱۱۰، ۱۱۱۱، ۱۱۱۲، ۱۱۱۳، ۱۱۱۴، ۱۱۱۵، ۱۱۱۶، ۱۱۱۷، ۱۱۱۸، ۱۱۱۹، ۱۱۲۰، ۱۱۲۱، ۱۱۲۲، ۱۱۲۳، ۱۱۲۴، ۱۱۲۵، ۱۱۲۶، ۱۱۲۷، ۱۱۲۸، ۱۱۲۹، ۱۱۳۰، ۱۱۳۱، ۱۱۳۲، ۱۱۳۳، ۱۱۳۴، ۱۱۳۵، ۱۱۳۶، ۱۱۳۷، ۱۱۳۸، ۱۱۳۹، ۱۱۴۰، ۱۱۴۱، ۱۱۴۲، ۱۱۴۳، ۱۱۴۴، ۱۱۴۵، ۱۱۴۶، ۱۱۴۷، ۱۱۴۸، ۱۱۴۹، ۱۱۵۰، ۱۱۵۱، ۱۱۵۲، ۱۱۵۳، ۱۱۵۴، ۱۱۵۵، ۱۱۵۶، ۱۱۵۷، ۱۱۵۸، ۱۱۵۹، ۱۱۶۰، ۱۱۶۱، ۱۱۶۲، ۱۱۶۳، ۱۱۶۴، ۱۱۶۵، ۱۱۶۶، ۱۱۶۷، ۱۱۶۸، ۱۱۶۹، ۱۱۷۰، ۱۱۷۱، ۱۱۷۲، ۱۱۷۳، ۱۱۷۴، ۱۱۷۵، ۱۱۷۶، ۱۱۷۷، ۱۱۷۸، ۱۱۷۹، ۱۱۸۰، ۱۱۸۱، ۱۱۸۲، ۱۱۸۳، ۱۱۸۴، ۱۱۸۵، ۱۱۸۶، ۱۱۸۷، ۱۱۸۸، ۱۱۸۹، ۱۱۹۰، ۱۱۹۱، ۱۱۹۲، ۱۱۹۳، ۱۱۹۴، ۱۱۹۵، ۱۱۹۶، ۱۱۹۷، ۱۱۹۸، ۱۱۹۹، ۱۲۰۰، ۱۲۰۱، ۱۲۰۲، ۱۲۰۳، ۱۲۰۴، ۱۲۰۵، ۱۲۰۶، ۱۲۰۷، ۱۲۰۸، ۱۲۰۹، ۱۲۱۰، ۱۲۱۱، ۱۲۱۲، ۱۲۱۳، ۱۲۱۴، ۱۲۱۵، ۱۲۱۶، ۱۲۱۷، ۱۲۱۸، ۱۲۱۹، ۱۲۲۰، ۱۲۲۱، ۱۲۲۲، ۱۲۲۳، ۱۲۲۴، ۱۲۲۵، ۱۲۲۶، ۱۲۲۷، ۱۲۲۸، ۱۲۲۹، ۱۲۳۰، ۱۲۳۱، ۱۲۳۲، ۱۲۳۳، ۱۲۳۴، ۱۲۳۵، ۱۲۳۶، ۱۲۳۷، ۱۲۳۸، ۱۲۳۹، ۱۲۴۰، ۱۲۴۱، ۱۲۴۲، ۱۲۴۳، ۱۲۴۴، ۱۲۴۵، ۱۲۴۶، ۱۲۴۷، ۱۲۴۸، ۱۲۴۹، ۱۲۵۰، ۱۲۵۱، ۱۲۵۲، ۱۲۵۳، ۱۲۵۴، ۱۲۵۵، ۱۲۵۶، ۱۲۵۷، ۱۲۵۸، ۱۲۵۹، ۱۲۶۰، ۱۲۶۱، ۱۲۶۲، ۱۲۶۳، ۱۲۶۴، ۱۲۶۵، ۱۲۶۶، ۱۲۶۷، ۱۲۶۸، ۱۲۶۹، ۱۲۷۰، ۱۲۷۱، ۱۲۷۲، ۱۲۷۳، ۱۲۷۴، ۱۲۷۵، ۱۲۷۶، ۱۲۷۷، ۱۲۷۸، ۱۲۷۹، ۱۲۸۰، ۱۲۸۱، ۱۲۸۲، ۱۲۸۳، ۱۲۸۴، ۱۲۸۵، ۱۲۸۶، ۱۲۸۷، ۱۲۸۸، ۱۲۸۹، ۱۲۹۰، ۱۲۹۱، ۱۲۹۲، ۱۲۹۳، ۱۲۹۴، ۱۲۹۵، ۱۲۹۶، ۱۲۹۷، ۱۲۹۸، ۱۲۹۹، ۱۳۰۰، ۱۳۰۱، ۱۳۰۲، ۱۳۰۳، ۱۳۰۴، ۱۳۰۵، ۱۳۰۶، ۱۳۰۷، ۱۳۰۸، ۱۳۰۹، ۱۳۱۰، ۱۳۱۱، ۱۳۱۲، ۱۳۱۳، ۱۳۱۴، ۱۳۱۵، ۱۳۱۶، ۱۳۱۷، ۱۳۱۸، ۱۳۱۹، ۱۳۲۰، ۱۳۲۱، ۱۳۲۲، ۱۳۲۳، ۱۳۲۴، ۱۳۲۵، ۱۳۲۶، ۱۳۲۷، ۱۳۲۸، ۱۳۲۹، ۱۳۳۰، ۱۳۳۱، ۱۳۳۲، ۱۳۳۳، ۱۳۳۴، ۱۳۳۵، ۱۳۳۶، ۱۳۳۷، ۱۳۳۸، ۱۳۳۹، ۱۳۴۰، ۱۳۴۱، ۱۳۴۲، ۱۳۴۳، ۱۳۴۴، ۱۳۴۵، ۱۳۴۶، ۱۳۴۷، ۱۳۴۸، ۱۳۴۹، ۱۳۵۰، ۱۳۵۱، ۱۳۵۲، ۱۳۵۳، ۱۳۵۴، ۱۳۵۵، ۱۳۵۶، ۱۳۵۷، ۱۳۵۸، ۱۳۵۹، ۱۳۶۰، ۱۳۶۱، ۱۳۶۲، ۱۳۶۳، ۱۳۶۴، ۱۳۶۵، ۱۳۶۶، ۱۳۶۷، ۱۳۶۸، ۱۳۶۹، ۱۳۷۰، ۱۳۷۱، ۱۳۷۲، ۱۳۷۳، ۱۳۷۴، ۱۳۷۵، ۱۳۷۶، ۱۳۷۷، ۱۳۷۸، ۱۳۷۹، ۱۳۸۰، ۱۳۸۱، ۱۳۸۲، ۱۳۸۳، ۱۳۸۴، ۱۳۸۵، ۱۳۸۶، ۱۳۸۷، ۱۳۸۸، ۱۳۸۹، ۱۳۹۰، ۱۳۹۱، ۱۳۹۲

آئے۔ انہوں نے حضرت سے ملاقات کی خواہش ظاہر کی۔ حضرت نے اپنے رفقاء کے ہمراہ صدر سے ملنے گورنمنٹ ہاؤس تشریف لے گئے۔ راقم الحروف بھی ان کے ساتھ تھا۔ صدر ایوب نے دستور کے متعلق ان کی رائے طلب کی۔ حضرت نے تفصیل کے ساتھ دستور کے اچھے اور بُرے پہلوؤں پر روشنی ڈالی اور واضح لفظوں میں صدر ایوب سے کہا:

”میری رائے یہی ہے کہ یہ آئین نہ تو اسلامی ہے اور نہ جمہوری۔“

صدر ایوب کے لیے یہ جواب خلاف توقع تھا۔ صدر ایوب تعجب سے ان کی طرف دیکھنے لگے اور گفتگو کا موضوع بدل دیا۔

مئی ۱۹۶۲ء میں شاہ سعود
بن عبدالعزیز نے اپنے سفیر

مدینہ یونیورسٹی مشاورتی کونسل کی رکنیت

متبعینہ پاکستان کی وساطت سے حضرت والد علیہ الرحمہ کو مطلع فرمایا کہ انہوں نے مدینہ یونیورسٹی کے چانسلر کی حیثیت سے انہیں مدینہ یونیورسٹی مشاورتی کونسل کا رکن نامزد کیا ہے۔ شاہ سعود نے یہ خواہش ظاہر کی تھی کہ حضرت ایسے وقت سعودی عرب تشریف لائیں کہ حج بیت اللہ کی سعادت بھی حاصل کر سکیں اور ۲۰ ذی الحجہ ۱۳۸۱ھ بمطابق ۲۵ مئی ۱۹۶۲ء کو مدینہ یونیورسٹی کا جو افتتاح ہو رہا ہے اس میں بھی شرکت فرمائیں۔ حضرت نے دعوت قبول فرمائی اور مئی کو لاہور سے کراچی روانہ ہوئے اور ۹ مئی کو کراچی سے عازم حجاز ہوئے اور ۱۵ جون ۱۹۶۲ء کو لاہور واپس تشریف لے آئے۔

آخري ايام

۲۷۲

آفری آیام
آفری دن

حضرت والد علیہ الرحمہ زندگی کے آخری دو برس مسلسل بیمار رہے۔ دل کے عارضے میں بُتلا تھے۔ دل کی شریانوں میں خون گاڑھا ہو جانے کی وجہ سے دورانِ خون میں رکاوٹ پیدا ہوتی، اس رکاوٹ سے دل میں شدید درد ہوتا۔ کتنی راتیں انہیں دردِ دل کے ہاتھوں بستر پر بیٹھے بیٹھے کاٹنی پڑیں۔ رات بھر ہونٹ سی کر چُپ چاپ بیٹھے رہتے۔ جہاں تک بن پڑتا گھر والوں کو نہیں جگاتے تھے۔ آپہیں کھینچنے اور کراہنے سے بھی اجتناب کرتے۔ ۱۹۶۲ء میں جب شاہ سعود کی دعوت پر وہ حجاز تشریف لے گئے، تو مدینہ منورہ میں دل کے صے کا شدید دورہ ہوا۔ واپسی پر مجھے بتاتے تھے: ”مدینہ منورہ میں جس ہوٹل میں میرا قیام تھا۔ مولانا مردودی صاحب بھی وہیں ٹھہرے ہوئے تھے، جس رات مجھے دورہ پڑا، مولانا مردودی کئی گھنٹے میرے پاس بیٹھے رہے۔ جب تک مجھے افادہ نہیں ہوا، وہ اپنے کمرے میں نہیں گئے۔“

پھر مولانا مردودی صاحب کو دُعادی۔ ”اللہ انہیں جزائے خیر دے۔“

حجاز سے واپس آنے کے بعد گریہ اُن پر اکثر طاری رہتا تھا۔ ایک دن عشا کے وقت جب گھر کے تمام افراد اپنے اپنے کمروں میں چلے گئے اور میں اتفاقاً بیٹھا رہا۔ ذرا نلے لگے:

”لوگ سمجھتے ہیں، میں بیماری کی وجہ سے روتا ہوں۔ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی محبت کا آج کل مجھ پر شدید غلبہ ہے۔ اُن کی ذاتِ گرامی میرے دل و دماغ پر چھا گئی ہے۔“

یہ فقرے بڑی مشکل سے اُنہوں نے پُرسے کیے اور وہاں میں مار مار کر رونے لگے۔
درد و شریف ان دنوں کثرت سے پڑھتے تھے۔ مولانا عبدالرحمان جامی کے نعتیہ کلام پر ایک دن
بہت دیر تک گفتگو کرتے رہے، میں نے مولانا جامی کی نعت کا ایک مطلع پڑھا ہے

نسیم الصبح زر منی رُبّی نخب و قبِلْهَا

کہ بُوئے دوست نے آید از ان پاکیزہ منزلیا

(اے باد نسیم! میری طرف سے نجد کے ٹیلوں کے پاس جا اور اُنہیں بوسے دے

کہ اُن مقدس جگہوں سے دوست کی تک آتی ہے)

چہرے کا رنگ بدل گیا اور آنکھیں نم آلود ہو گئیں۔ باقی شعر پڑھنے کی ہمت مجھے نہ ہوئی۔

زندگی کے آخری سال میں دل کا دائمی سلسل رہا۔ بیماری اُن کے جسم کو برابر چاٹتی رہی۔

مگر اُن کے عزم، اُن کی ہمت اور اُن کی رجائیت کو چاٹنے سے یکسر قاصر رہی۔ ۵ مارچ

۱۹۶۳ء کو گلاب دیوبند ہسپتال میں داخل ہوئے۔ ہسپتال ایمبولینس کار میں ٹیچر

(STECHE) پر گئے۔ چلنے سے پہلے شہروانی سپنی، سسر پڑھی رکھی، ہاتھ میں چھڑی لی، چھڑی

سمیت ٹیچر پر لیٹ گئے۔ یہ وضع داری وہ آخری دن تک نبھاتے رہے۔ تعجب ہوتا تھا کہ

اتنی لمبی بیماری کاٹنے کے باوجود اُن کے مزاج میں چڑچڑاپن پیدا نہیں ہوا۔ بلکہ علم اور

مزاج کا وہیما پن روز بروز بڑھتا گیا۔ ذرا طبیعت سنبھلتی تو طبیعت کی ظرافت اور چہرے کی نشانت

لوٹ آتی۔ کار ہسپتال سپنی اور ڈاکٹر بلینغ الرحمن خیر مقدم کے لیے تشریف لائے۔ کہنے لگے:

”آپ کی طبیعت پہلے سے بہتر معلوم ہوتی ہے۔“ والد صاحب نے مسکرا کر غالب کا شعر پڑھا

اُن کے دیکھے سے جو آجاتی ہے منہ پر رونق

وہ سمجھتے ہیں کہ بیہمار کا حال اچھا ہے

۲۶ مئی کو وہ ہسپتال سے گھر آئے جیسا کہ وہ اپنے روزنامے میں لکھتے ہیں: آج

باجازت ڈاکٹر بلینغ الرحمن ہسپتال سے رخصت لے کر مکان پر آ گیا۔ علاج انہی کا جاری

ہے صحت بعد اللہ پہلے سے بہتر ہے۔ معدے اور جگر کی اصلاح ہو رہی ہے مگر آہستہ رفتار سے۔ سانس کی تکلیف بھی پہلے سے کم ہے۔ سات آٹھ ماہ بستر پر پڑے رہنے سے کمزوری بہت زیادہ ہے۔“

یہ طبیعت کا سنبھلنا محض عارضی تھا۔ گھر آنے کے بعد ان کی طبیعت بگڑتی چلی گئی۔ نقاہت بڑھتی گئی۔

جب تک ان میں سکت رہی، انتہائی نقاہت کے باوجود نماز باقاعدگی سے وقت پر پڑھتے رہے۔ روزے برابر رکھتے رہے، نماز تراویح التزام سے پڑھتے رہے۔ رمضان میں ۲۹ دین کی شب ہمارے ہاں قیام ہوتا تھا۔ ۱۹۶۲ء تک وہ قیام اللیل میں شریک ہوتے رہے اور رات تک نوافل پڑھتے رہے۔ ۱۹۶۲ء کے روزنامے میں ۲۹ دین رمضان کو لکھتے ہیں:

” آج رات ۲۹ دین رمضان مبارک معنی عوز الیوم سلمہ اللہ تعالیٰ نے قیام کا انتظام کیا تھا۔ شہر کے تمام اچھے اچھے قاری صاحبان میرے دستخطوں سے خطوط لکھ کر بلانے کا انتظام کیا تھا۔ سب مدعو قاری صاحبان آگئے ارات بھر قیام رہا۔ عاجز شروع میں کھڑے ہو کر پھر بیٹھ کر نوافل پڑھا رہا۔ نین بچے کے بعد وتر پڑھا مگر اس قدر تنگ گیا کہ بیٹھنے میں اعصابی درد رہا۔“

آخری ایام

آخری دنوں میں بات کم کرتے تھے۔ رب اغفر وارحم وانت خیر الراحمین اکثر پڑھتے تھے۔ کبھی کبھی بقاضائے بشریت خیال آتا کہ میرے بعد فلاں بات کا کیا ہوگا؟ تو ساتھ ہی کہہ اٹھتے اللہ سبّی کا اشرف بہ شیئاً۔

آخری دنوں میں بیماری کی شدت، نقاہت اور بے خوابی کی وجہ سے صبح کی نماز میں بعض اوقات تاخیر ہوتی تو انہیں سخت صدمہ ہوتا۔

مضطرب ہو ہو کر دعا مانگیں اللھم اغفر وارحم وانت الاعز الاکرم۔
اللھم انک عفو و تحب العفو فاعف عنی۔ اللھم مغفرتک اوسع من
ذنوبی و رحمتک ارجی عندی من عملی۔

ایک دن رات بھر شدت کا درد رہا۔ صبح کے قریب کچھ افاقہ ہوا اور نیند آگئی۔
صبح کی نماز فوت ہو گئی۔ آپ روتے تھے اور بار بار کہتے تھے:

ربنا لا تقواخذنا ان نسينا او اخطانا۔ ربنا ولا تحمل علينا
اصراً کما حملته علی الذین من قبلنا۔ ربنا ولا تحملنا مالا
طاقه لنا به و اعف عنا و اغفر لنا وارحمنا، انت مولانا فانصنا
علی القوم الکفرین۔

میں نے کبھی کوئی شکوہ شکایت کی بات ان کی زبان سے نہیں سنی۔ ہاں جس دن
نماز فوت ہوئی، اُس دن کہنے لگے: آہ! یہ زندگی بھی کیا زندگی ہے —

میں شام کے بعد بدن دبانے کے لیے جاتا۔ بدن دبا کر چارپائی سے نیچے اترتا تو بستر
کی ٹنگنیں التزام سے ٹھیک کرتا، مگر وہ احتیاطاً بستر پر ایک نظر ضرور ڈالتے۔ کبھی بستر ٹھیک
کرنا بھول جاتا تو مجھے بلا کر کہتے بستر ٹھیک کرو، ان ٹنگنوں سے مجھے تکلیف ہوتی ہے۔ ان کا
کوئی کام کرتا تو جزا اللہ اکثر کہا کرتے تھے، مگر آخری دو تین دن میں بدن دباتا،
بازار سے دوا لاتا، حتیٰ کہ پانی کا ایک گلاس بھی لاتا تو فرماتے: جزاکم اللہ احسن
الجزاء — والحمد لله علی ذالک حمداً کثیراً۔

بہ بدستی سزا گر متہم سازو مراساتی

ہنوز از بادہ دوشینہ ام بیمانہ بود دارد

آخری دن

آخری دن طبیعت میں بڑی تازگی اور نشاطت تھی۔ صبح کی نماز بالکل بھر پوری تھی۔ کچھ دنوں

سے صبح کا وظیفہ چھوٹا ہوا تھا۔ وظیفہ پڑھا۔ خلاف معمول ناشتہ سیر ہو کر کیا۔ اتنے میں میری ہمیشہ نے مین روڈ سے سیلفین پر حال پوچھا۔ فون پر کہنے لگے۔ اللہ کا شکر ہے طبیعت ابھی ہے۔ رات نیند ٹھیک آئی۔ صبح ناشتہ کرنے کو جی چاہا طبیعت بحمد اللہ پہلے سے بہتر رہی ہے۔ تم کراچی جانا چاہتی ہو تو چلی جاؤ۔

انہوں نے ریسپور رکھا ہی تھا کہ دل کا شدید دورہ پڑا۔ اس دورے کی مدت دو چار لمحوں سے زیادہ نہ تھی۔ میں کالج جانے کی تیاری کر رہا تھا غسل خانے سے نکلا تو کھسی نے بتایا مولانا صاحب کی طبیعت بہت خراب ہے، جلد جاؤ، میں بھاگ کر پہنچا اور کئی منٹ اُن کی نبض ڈھونڈتا رہا.... مگر وہ رخصت ہو چکے تھے۔

اُس رفیقِ اعلیٰ کے پیامی ۱۶ دسمبر کو پیر کے دن ٹھیک پہنچے صبح آئے۔ رُوح نے قفسِ عنصری سے اس تیزی کے ساتھ پرواز کی گویا اللہ کے بلاوے کے انتظار میں پارہ کاسختی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات پیر کے دن چاشت کے وقت ہی ہوئی تھی۔ اس مبارک وقت میں اس جہاں سے رخصت ہونے کی سعادت جو حضرت والد علیہ الرحمہ کے حصے میں آئی یہ اتباعِ سنت اور تاسی باسوءِ رسول کی بدولت تھی۔ ان کے چہرے پر ایک طمانیت اور سکون تھا۔ یوں محسوس ہوتا تھا جیسے دنیا کے جھنجھوٹوں اور ججالوں سے چھوٹ کر وہ بہت خوش ہیں۔

جنازہ اگلے روز ۱۶ بجے اٹھایا گیا۔ ہزاروں انسانوں کا ہجوم..... ایک کمرام بپا تھا۔ چار پائی کے ساتھ لمبے لمبے لباس باندھے گئے۔ شیدائی کڈھا دینے کے لیے چار پائی کی طرف یوں پکتے تھے، جیسے پتنگے شمع دان پر گرتے ہیں۔ جنازہ یونیورسٹی گراؤنڈ پہنچا، تو وہاں بھی آدمیوں کا ایک ہجوم منتظر تھا۔

برادرِ محترم سید عرفان روق غزنوی اور میری خواہش کے مطابق نمازِ جنازہ مولانا محمد اسحاق صاحب نے پڑھائی۔ میں نے سلام پھیر کر مقتدیوں پر نظر ڈالی۔ آدمیوں کا بے پناہ ہجوم

دیکھ کر امام احمد بن حنبل کا مقولہ یاد آگیا۔

الفرق بیننا و بین اهل البدع یوم الجنائز
سیدنا حضرت عبداللہ غزنوی علیہ الرحمہ کے جنازے کا حال حضرت امام عبدالجبار
غزنویؒ نے لکھا ہے :

”برجنازه اوشاں آں چناں از دھام بود کہ از کثرت مرزاں اسواق مسدود
شد و موافق و مخالف زیر جنازه اشش میدیدند نوبت برداشت آں برینان
شهر نمی آمد۔ زخمه کہ در دست رسانیدن بر نعش مبارکش دیدہ شد کم از زخمه
بر حجر اسود نبود در بسیار از بلاد ہند و پنجاب و پشاورد نماز خانانہ بروے
خواندہ شد۔“ مخطوطہ ص ۲۹

حضرت امام عبدالجبارؒ کے جنازہ پر بھی از دھام کا یہی عالم تھا۔ حضرت امام عبداللہ
غزنویؒ اور حضرت امام عبدالجبار غزنویؒ کے جنازہ کا جو حال ہم نے پڑھا اور سنا تھا، حضرت
والد علیہ الرحمہ کا جنازہ دیکھ کر اسکا ایک ایک نقش ذہن میں تازہ ہو گیا۔

وجلا السیول من الطلول کانتھا

زبر تجدد متونہا اقلماھا

فنعلم السلف ونعم الخلف ولہ نسب الفت الشمس علیہ

رداھا ولہ حسب ارحمت النجوم لدیہ اضواءھا۔

(خلف سے مراد خود حضرت والد علیہ الرحمہ ہیں)

جنازہ میانی صاحب کے قبرستان لے جایا گیا۔ میں شروع سے آخر تک چار پائی کے

ایک پائے سے چٹا رہا اور جی بار بار کہتا تھا۔

یا ابت ما خد مناک حق خد متک و ما ادینا و اجبا متنا کما

کان ینسخی لنا ان نوذیھا۔

جب ان کا جدِ مبارک معد میں اتار رہے تھے، یقین نہیں آتا تھا یہ وہی زندہ اور سرگرم عمل انسان ہے جو یوں بے حس و حرکت ہو گیا ہے۔

ماكنت احب قبل دفنك في الثرى

ان الكواكب في السراب تصور،

ماكنت آمل قبل نعشك ان ارى

رضوى على ايدى الرجال تسير

تیرے دفن سے پہلے مجھے گماں نہ تھا کہ چکتے ہوئے تارے بھی مٹی میں

مل جاتے ہیں۔ تیرا جنازہ اٹھنے سے پہلے مجھے خیال نہ تھا کہ رضوی پہاڑ

آدمیوں کے ہاتھوں پر چلے گا،

میں قبرستان سے لوٹا تو اُن کی وہ پچھلی رات رور و کر دعائیں مانگنے کی آواز

میرے کانوں میں آرہی تھی۔

يا باسط اليدين بالرحمة!

يا واسع المغفرة! مغفرتك اوسع من ذنوبنا

یوں معلوم ہوتا تھا جیسے کوئی بہت بڑا فقیر بہت بڑی بارگاہ میں گڑگڑا رہا ہے۔

ان کی وہ آواز میرے سامعہ سے آج بھی پیہم مگوار ہی ہے۔ ”رب توفني مسلماً

والمحقي يا لصالحين۔ رب هب لي من لدنك ولياً يرثني ويرث من

آل عبد الله“

کون ہوتا ہے حریفِ مئے مردانگنِ عشق

ہے مگر ربِ ساقی پر صلا تیرے بعد

اخلاق و عادات

علی شنف
ذوقِ عبادت
عملیات
حقوق العباد
مرآت اور رواداری
سن گونی و بے باکی
نفاست اور شائستگی

علمی تشغف

سیاسی ہنگاموں کے ساتھ علمی مشاغل کو جاری رکھنا بہت مشکل ہے لیکن میں نے دیکھا کہ سیاسی ہنگاموں اور جماعتی کاموں سے جب بھی انہیں فراغت میسر آتی وہ مطالعے میں محو ہو جاتے۔ گھنٹوں مطالعے میں ڈوبے رہتے۔ ہاتھ میں سرخ پینل ہوتی تھی۔ اہم باتوں پر التزام سے نشان لگاتے۔ ماشیے پر نوٹ لکھنے اور حوالے ضبط کرتے۔

علمی مسائل پر کبھی کبھی گھنٹوں ان سے گفتگو رہتی۔ بات مرتب اور مربوط کرتے تھے۔ حشو و زوائد سے ان کی گفتگو پاک ہوتی تھی۔ الفاظ کے چناؤ میں بڑی احتیاط برتتے تھے۔ کوئی اُلجھی ہوئی بات کرنا یا غیر موزوں لفظ بولنا تو انہیں سخت گراں گزرتا۔

فقہ اور تصوف کے بارے میں ان کا موقف بہت منجھا ہوا تھا۔ فقہائے کرام کی خدمات کا اعتراف کرتے تھے اور ان کا نام ادب سے لیتے تھے۔ تمام سلاسل کے مشائخ کا ذکر عقیدت اور محبت سے کرتے تھے اور ان کی شان میں گستاخی موجب حرام سمجھتے تھے اور کبھی فرماتے۔

”اہل اللہ کی شان میں گستاخی سدّہ مجاری فیض ہے۔“

تفسیرِ حدیث اور فقہ کے علاوہ تصوف کی کتابوں پر بھی خوب نظر تھی۔ رسالہ تیشیرہ العرف لذہب اہل التعمون، کیبیائے سعادت، اجبائے علوم، شہنوی مولانا روم، کشف المحجوب، مکتوباتِ حضرت مجدد الدلت ثانی رحمۃ اللہ علیہ، ان سب کتابوں کا مطالعہ

بالاستیعاب کیا تھا۔ حضرت مجدد صاحب علیہ الرحمہ سے انہیں خاص عقیدت تھی۔ آخری بار قید کا زمانہ کمتر بات ہی کے مطالعہ میں بسر ہوا۔ فرماتے تھے:

”تصوّف میں میرے امام شیخ احمد سرہندی رحمۃ اللہ علیہ ہیں۔“
ایک دن یہ بھی فرمایا:

”شریعت کا وہ حصّہ جو تزکیہ باطن سے متعلق ہے۔ اصطلاحاً تصوّف

کہلاتا ہے۔ شریعت سے ہٹ کر کسی تصوّف کا میں فائل نہیں ہوں۔“

حلول، اتحاد، وحدت الوجود اور وحدت الشہود میں فرق خوب مزے لے لے کر بیان کرتے تھے۔ وحدت الوجود کے خلاف تھے اور شیخ محی الدین ابن عربی رحمۃ اللہ علیہ سے انہیں طبعی مناسبت نہ تھی۔

اُن کی شخصیت کے بعض پہلو جو مجھے عزیز تھے، ذکر

کرتا ہوں: ذکر الہی بڑی کثرت سے کرتے تھے۔

ذوقِ عبادت

رات دو تین بجے اُٹھ کھڑے ہوتے اور مسلسل چار پانچ گھنٹے عبادت میں مشغول رہتے۔
تہجد زندگی بھر باقاعدگی سے ادا کرتے رہے۔ تہجد کی نماز میں بہت روتے تھے۔ اُن کے رونے کی آواز گھر والوں کو جگا دیتی تھی۔ روتے روتے اُن کی ہچکی بندھ جاتی۔ یوں معلوم ہوتا کہ کہیں چکی چل رہی ہے یا ہنڈیا اُبل رہی ہے بعض اوقات مصروفیتوں کا ہجوم ہوتا اور رات دیر تک جاگتے رہتے مگر ذوقِ عبادت اس قدر سُختہ ہو چکا تھا اور شب خیزی کی عادت ایسی راسخ ہو چکی تھی کہ رات کے پچھلے پہر اُٹھ بیٹھتے۔ شام کی نماز کے بعد بھی بہت دیر تک ذکر میں مشغول رہتے۔ ایک دن مجھ سے کہنے لگے:

”رات میں لا الہ الا اللہ کا ذکر کرتا تھا، تو میرے مُنہ سے نُوز نکلتا تھا۔ عجیب

کیفیت تھی۔“

ایک دن اپنی بعض پریشانیوں کا ذکر کر رہے تھے۔ یکایک اُن کے چہرے پر

بناشت آگئی اور مکتاتے ہوئے کہنے لگے :

”ابو بکر! ذکر کرتے وقت تو میں بادشاہ ہوتا ہوں۔ مجھے کوئی غم نہیں ہوتا۔“

صبح کے معمولات میں یہ ورد الترام سے پڑھتے تھے۔ فرماتے تھے کہ یہ امام شافعی

رحمۃ اللہ علیہ کا ورد تھا :

(۱) ” بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ - بِسْمِ اللّٰهِ خَیْرِ الاسْمَاءِ ، بِسْمِ اللّٰهِ الَّذِیْ لَا یَضُرُّ مَعَ اسْمِهِ اَذِیٌّ - بِسْمِ اللّٰهِ الْکَافِیِّ - بِسْمِ اللّٰهِ الْمُعَافِیِّ - بِسْمِ اللّٰهِ الَّذِیْ لَا یَضُرُّ مَعَ اسْمِهِ شَیْءٌ فِی الْاَرْضِ وَلَا فِی السَّمَاءِ وَهُوَ السَّمِیْعُ الْعَلِیْمُ ، بِسْمِ اللّٰهِ عَلٰی نَفْسِیْ وَدِیْنِیْ ، بِسْمِ اللّٰهِ عَلٰی اَهْلِیْ وَ مَالِیْ ، بِسْمِ اللّٰهِ عَلٰی کُلِّ شَیْءٍ اَعْطَانِیْهِ رَبِّیْ ، اللّٰهُ اَکْبَرُ ، اللّٰهُ اَکْبَرُ ، اللّٰهُ اَکْبَرُ ، اللّٰهُ اَکْبَرُ - اَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِمَّا اَخَافُ وَاَحْذَرُ ، اللّٰهُ اللّٰهُ رَبِّیْ لَا اُشْرُکُ بِهٖ شَیْئًا - عَزَّ جَارٌ وَجَلَّ ثَنَاءٌکَ وَ تَقَدَّسَتْ اَسْمَاءُکَ وَلَا اِلٰهَ غَیْرُکَ ، اَللّٰهُمَّ اِنِّیْ اَعُوْذُ بِکَ مِنْ شَرِّ کُلِّ جَبَّارٍ عَنِیْدٍ وَ شَیْطَانٍ مَّرِیْدٍ وَ مِنْ شَرِّ قَضَاءِ الشُّرُوْءِ ، وَ مِنْ شَرِّ کُلِّ دَابَّةٍ اَنْتَ اَخَذْتَ بِناصِیْتِہَا اِنَّ رَبِّیْ عَلٰی صِرَاطٍ مُسْتَقِیْمٍ تَبِیْرًا“

(۲) شَہِدَ اللّٰهُ اَنَّهُ لَا اِلٰهَ اِلَّا هُوَ وَالْمَلٰئِکَةُ وَاُولُو الْعِلْمِ قٰنِیْمًا بِالْقِسْطِ لَا اِلٰهَ اِلَّا هُوَ الْعَزِیْزُ الْحَکِیْمُ ، اِنَّ الدِّیْنَ عِنْدَ اللّٰهِ الْاِسْلَامُ وَ اَنَا شَہِدُ بِمَا شَہَدَ اللّٰهُ بِهٖ وَ اسْتَوْجِعُ اللّٰهُ هَذِهِ الشَّہَادَةَ وَ هِیْ وَدِیْعَةٌ لِّیْ عِنْدَهُ اِلٰی یَوْمِ الْقِیٰمَةِ ، اَللّٰهُمَّ اَعُوْذُ بِنُورِ قُدْسِکَ وَ عَظِیْمِ رُکْنِکَ وَ عَظْمَةِ طَهَارَتِکَ مِنْ کُلِّ آفَةٍ وَ عَاہَةٍ وَ مِنْ کُلِّ طَوَارِقِ اللَّیْلِ وَ النَّہَارِ اِلَّا طَارِقًا یَطْرُقُ بِخَیْرِ یَا اللّٰهُ ، اَللّٰهُمَّ اَنْتَ غَیَاثِیْ بِکَ اَسْتَعِیْتُ وَ اَنْتَ مَلٰذِیْ بِکَ اَلُوْذُ وَ اَنْتَ عِیَاذِیْ بِکَ اَعُوْذُ ، یَا مَنْ ذَلَّتْ لَہٗ رِیَابُ الْجَبَابِرَةِ وَ خَضَعَتْ لَہٗ اَعْنَاقُ الصَّرَاعِنَةِ ، اَعُوْذُ بِکَ

من كَشَفِ سَتْرِكَ وَنَشِيَانِ ذِكْرِكَ وَالْأَنْصَرَانِ عَنِ شُكْرِكَ، أَنَا فِي
حِزْبِكَ كَيْلِي وَنَهَارِي وَنَوْمِي وَفَرَارِي وَطَعْنِي وَاسْفَارِي وَحَيَاتِي وَ
مَمَاتِي، ذِكْرُكَ شِعَارِي وَتَنَاؤُكَ دِيَارِي، لَا إِلَهَ إِلَّا أَنْتَ سُبْحَانَكَ وَ
بِحَدِّكَ تَشْرِيفًا لِعَظَمَتِكَ وَتَكْرِيمًا لِنَفْعَاتِكَ وَجَهْدًا أَجْرِي مِنْ حِزْبِكَ وَ
مِنْ شَرِّ عِبَادِكَ وَاهْتِرَابَ سُرُودَاتِ حِفْظِكَ عَلَيَّ وَأَدْخَلَنِي فِي حِفْظِ
عِنَايَتِكَ وَجَدَّ عَلَيَّ بِخَيْرِيَا أَرْحَمَ الرَّاحِمِينَ وَصَلَّى اللَّهُ عَلَى النَّبِيِّ وَآلِهِ“
اس ورد کے بعض حصے آہستہ آہستہ پڑھتے ہوئے بے ساختہ اُن کی آواز بلند ہو
جاتی تھی۔ یہ مجھے اُوپنچی آواز سے کہتے تھے:

”اللَّهُمَّ أَنْتَ عِنَايَتِي بِكَ اسْتَعَيْتُ وَأَنْتَ مَلَأْتَنِي بِكَ الْوُدُوءَ وَأَنْتَ
عِيَاذِي بِكَ أَعُوذُ، يَا مَنْ ذَلَّتْ لَهُ رِقَابُ الْجَبَابِرَةِ وَخَصَعَتْ لَهُ أَعْنَاقُ
الْفِرَاعِينَةِ“

(اے اللہ! میرا مددگار تو ہے۔ میں تجھ ہی سے مدد چاہتا ہوں، میرا ملجاؤاؤی
تو ہی ہے، میں تیری پناہ میں آتا ہوں۔ اے وہ کہ جابر بادشاہوں
کی گردنیں اُس کے سامنے خم ہیں اور فرعونوں کے سر اُس کے سامنے جھکے
ہوئے ہیں۔)

ایک زمانے میں انہیں تعویذات، عملیات اور طہنی نسخے لکھنے

عملیات

کرنے کا بھی شوق رہا۔ اُن کی ایک بیاض میرے پاس ہے

جس کے پہلے صفحے پر ”مَجْرَبَاتِ وَمَعْمُولَاتِ فَقِيرِ بَارِغَاهِ صَمَدِي مُحَمَّدِ دَاوُدِ خَزَنَوِي“ لکھا ہے
اس میں ایک طرف اپنے قلم سے مختلف بزرگوں سے حاصل کیے ہوئے تعویذات اور
مَجْرَبِ عَلِّ لکھے ہیں اور دوسری طرف طہنی نسخے درج ہیں۔ حافظ محمد لکھنویؒ کے بہت سے
مَجْرَبَاتِ اس بیاض میں موجود ہیں۔ اُن کے علاوہ مندرجہ ذیل بزرگوں کے مَجْرَبَاتِ نقل

کیے گئے ہیں :

مولانا غلام رسول صاحب قلعہ والے، مولوی محمد سیامان صاحب مرید حضرت الامام عبد الجبار غزنوی، مولانا احمد غزالی، مہاجر کئی، مولانا عبداللہ شاہ غزنوی ثم افریقی مرحوم مولانا حسین علی صاحب - دوسری طرف مختلف مستدا طلبا سے حاصل کیے ہوئے طبئی نسخے درج کیے گئے ہیں کئی قسم کے سفوف اور معجونیں بنانے کی ترکیبیں لکھی ہیں۔ مہجن اور ٹرمر بنانے کے کئی طریقے لکھے ہیں۔ بیاض کے اس جھتے میں رنگارنگ نسخے درج ہیں۔ چند نسخہ جات کے عنوانات ملاحظہ فرمائیے۔

سرمد مروریدنا سفنہ از مہجرات بحکم نور الدین بھیروی - سفوف مقوی معدہ و مصلح جگر
مہرب بدر جنابت مفید از ذکر حکیم غلام احمد صاحب حیدرآبادی نزل مدینہ منورہ -
ضیق النفس (دوسر) کاسنیاسی نسخہ (ملشی عباد اللہ امرتسی کا عطیہ) روغن دافع درد
و مقوی داغ از مولانا عبدالنواب صاحب غزنوی نزل علی گڑھ تعزیت قلب کے لیے
ماخوذ از عطار الرحمن دہلوی سابق اسیر فرنگ، میانوالی جیل۔

اللہ کے حقوق تو وہ التزام سے ادا کرتے تھے، بندوں
کے حقوق بھی وہ مستعدی سے ادا کرتے تھے۔ آخری

حقوق العباد

بیماری میں بھی جب تک ان میں سکت تھی عیادت کے لیے جاتے رہے، تعزیت
کرتے رہے۔ نماز گزارہ پڑھتے اور پڑھاتے رہے۔ ان کی ۱۹۶۲ء کی ڈائری کے چند
اقتباس نقل کرتا ہوں جن کی روشنی میں ان کی شخصیت کے اس پہلو پر روشنی پڑتی ہے
۱۲ جنوری حافظ اسماعیل روپڑی کی وفات۔

”حافظ اسماعیل صاحب روپڑی بروز جمعہ صبح پونے نو بجے وفات پا گئے۔

إنا لله وإنا اليه راجعون“

۱۳ جنوری: ”حافظ عبداللہ صاحب روپڑی کے ہاں ماڈل ٹاؤن میں تعزیت

ہے لیے گیا۔ میرے ہمراہ حافظ عبدالرشید صاحب کو ٹیوی اور محمد عمر خادم تھے۔
 ۱۵ جنوری۔ ”شُرکتِ عظیم یعنی شیخ عظیم اللہ کے بڑے اپنی موٹر کے حادثے میں وفات پا گئے۔
 انا اللہ وانا الیہ راجعون۔ شوکت صاحب شیخ محمد یوسف کے داماد تھے اور شادی ۲۹ دسمبر
 ۱۹۶۱ء کو ہوئی تھی۔ جنازہ میں شرکت کی غرض سے گیا۔ میت کے وارثوں نے نماز جنازہ
 پڑھانے کو کہا۔ نماز جنازہ بالجہر پڑھائی۔“

۱۶۔ جنوری۔ علامہ حسین میر علیہ الرحمہ کی وفات۔

”علامہ حسین میر صاحب آج صبح وفات پا گئے۔ انا اللہ وانا الیہ راجعون۔ جنازہ
 میں شریک ہوا۔ جنازہ مولوی حکیم ہدایت اللہ نے پڑھایا۔ حسبِ وصیت علامہ صاحب
 جنازے کو کندھا دیا۔ درِ دِل کا دورہ شروع ہو گیا۔ پھوٹی دیر بٹھ گیا۔۔۔۔۔ رات بھر
 بالخصوص آخری حصہ شب میں درِ دِل کی تکلیف بہت زیادہ رہی۔“

۲۴۔ فروری کو مولانا احمد علی صاحب علیہ الرحمہ کی نماز جنازہ میں شرکت کی۔
 ”افسوس کہ آج رات ۱۰ بجے مولانا احمد علی صاحب کئی سال فالج کی علالت کے
 بعد حرکتِ قلب بند ہونے سے انتقال فرما گئے۔ انا اللہ وانا الیہ راجعون۔ نماز جنازہ کا تین بجے
 یونیورسٹی گراؤنڈ میں اعلان تھا۔ پہلے ان کی مسجد شہر انوالہ دروازہ میں گیا۔ پھر یونیورسٹی گراؤنڈ
 میں نماز جنازہ کے لیے گیا۔ جنازہ سے پہلے وہاں بہت زیادہ خلقت جمع تھی۔ جنازہ کے
 ساتھ اور بے شمار لوگ آ گئے۔۔۔۔۔ نماز جنازہ سے فارغ ہو کر واپس مکان آیا۔ بہت تنگ
 گیا تھا۔ الحمد للہ درِ دِل کی تکلیف نہیں ہوئی۔“

۲۵۔ فروری۔ حمید نظامی مرحوم کی وفات پر اظہارِ غم

”افسوس آج گیارہ بج کر پچاس منٹ پر حمید نظامی صاحب مدیر نوائے وقت“ دل
 کے شدید عارضے کی وجہ سے فوت ہو گئے۔ انا اللہ وانا الیہ راجعون۔ ۲۳۔ فروری کو شدید عل
 ہوا۔ مقامی ڈاکٹروں کا بورڈ علاج کے لیے حاضر تھا۔ کراچی کے مشہور ڈاکٹر ماہر امراضِ قلب

ڈاکٹر اے آر کھبانا کو ہوائی جہاز سے بلایا گیا، مگر سب کوششیں ناکام ثابت ہوئیں۔ اللہ کا حکم آپہنچا تھا۔ حیات و موت کی شدید کشمکش کے بعد ۲۵ فروری کو جان جان آفریں کے پُرد کردی۔ — اللّٰهُمَّ اغْفِرْ لَهُ وَارْحَمْهُ وَادْخُلْهُ فِي عِبَادِكِ الصَّالِحِينَ —

۲۶۔ فروری۔ ”آج ۲۶ فروری کو ۱۰ بجے نمازِ خازہ میں شرکت کے لیے یونیورسٹی گراؤنڈ میں گیا۔ مولانا احمد علی صاحب کی وفات اور کل حمید نظامی صاحب کی وفات سے جو صدمہ ہوا ہے، اس کا میرے دل پر گہرا اثر ہوا۔“

دوست دشمن سب کے ساتھ موت سے پیش آتے۔ وہ لوگ جنہوں نے زندگی بھر انہیں بیزادی

موت اور رواداری

اور اُن سے بغض و عناد رکھا، اُن کے ساتھ بھی تپاک سے ملتے۔ انہیں علم ہوتا تھا کہ یہ شخص میری غیر حاضری میں مجھے گالیاں دیتا ہے لیکن شناسائی کے اس معیار سے جو انہوں نے اپنے لیے عطا لیا تھا، وہ نیچے اُترنے کے لیے تیار نہ ہوتے تھے۔ ان لوگوں کی عدم موجودگی میں بھی کوئی ناشائستہ لفظ اُن کے بارے میں مُنہ سے نہ نکالتے تھے۔

ترا کے میسر شود ایں ممتام کہ بادوسانت خلاف ست وجنگ
(تمہیں یہ مقام کیونکر میسر ہو سکتا ہے کہ تم تو اپنے دوستوں کے ساتھ ہی ہاتھ پائی کر رہے ہو)
وہ ایک تختین اور واضح مسک رکھتے تھے اور زندگی بھر پورے یقین اور اذعان کے ساتھ اس مسک کا پرچار کرتے رہے، مگر دوسروں کے عقائد و افکار کی تضحیک نہیں کرتے تھے۔ تمام جماعتوں کے زعماء کے ساتھ عزت و احترام کے ساتھ پیش آتے۔

اگر کسی بات کو حق سمجھتے اور پورا ملک بھی اگر اس کے خلاف ہوتا تو ڈنکے کی چوٹ بر ملا اس بات کو بیان کرتے۔

حق گوئی و بیباکی

مجھے یاد ہے کہ ایک عید کے موقع پر منٹو پارک کے میدان میں تقریر کے دوران حریفوں نے ہڑ بھایا اور اُن پر پتھر پھینکے۔ سنگ باری نے اُن کی قوتِ بیانیہ پر ہمیشہ کا کام دیا۔ اُن

کی خطابت کا زور اور روانی تیز تر ہو گئی۔ پتھر اُن کے سر کے پاس سے گزر رہے تھے مگر اُن کے اعصاب اس قدر مضبوط تھے کہ خوف و ہراس کی کوئی بھی سی چھینٹ بھی اُس وقت اُن کے دامنِ صبر و وقار پر نظر نہ آتی تھی۔

طبیعت میں نفاست بہت تھی۔ بدتمیزی اور شائستگی سے اُن کی طبیعت مکدر بہت

نفاست اور شائستگی

ہوتی تھی۔ کپڑا ہمیشہ نفیس پہنتے۔ کتاب کی جلد نفیس بندھواتے، قلم نفیس خریدتے۔ ان کی کتابوں پر کبھی کوئی داغ و دھبہ نہیں نے نہیں دیکھا۔ لباس ہمیشہ اُجلا پہنتے تھے۔ ان کے کپڑوں پر کبھی میل نہیں دیکھی۔ سلیقہ اُن کے خمیر میں گندھا ہوا تھا۔ وہ اپنے کمرے کی ہر چیز بڑے قریب سے متین جگہ پر رکھتے تھے۔ کسی چیز کو اس کی اصل جگہ سے کوئی ہٹا دیتا تو کمرے میں داخل ہوتے ہی پوچھتے:

”میرے کمرے میں کون آیا تھا؟ یہ چیز کس نے چھیری ہے؟“

حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کی کتاب ”ارواحِ ثلاثہ“ جو بزرگوں کے حالات پر مشتمل ہے، کے حاشیے پر جگہ جگہ انہوں نے اپنے قلم سے نوٹ لکھے ہیں۔ حضرت مرزا مظہر جان جاناں رحمۃ اللہ علیہ کے حالات میں مندرجہ ذیل حکایت لکھی ہے:

”بے قاعدہ رکھی ہوئی چیز دیکھ کر مرزا صاحب کے سر میں درد ہونے لگتا تھا۔ ایک دن بہادر شاہ بہت الماح و التجا کے بعد اجازتِ حضورِ طے پر زیارت کے لیے حاضر ہوا۔ موسمِ تھا گرمی کا، بادشاہ کو پیاس لگی اور پانی طلب کیا۔ حضرت نے فرمایا وہ گھڑا رکھا ہوا ہے، پیالہ میں لے کر پانی پیو۔ بادشاہ نے پانی پیا اور پیالہ گھڑے پر رکھ دیا۔ مرزا صاحب کی نظر جو گھڑے پر پڑی تو پیالہ ذرا ترچھا دھرا ہوا تھا۔ دیر تک ترچھی نگاہ سے دیکھتے رہے۔ آخر ضبط نہ ہو سکا۔ فرمایا:

خواب آپ بادشاہ بہت کیا کرتے ہوں گے، ابھی تک خدمتِ گاری تو آئی ہی نہیں

دیکھو تو گھڑے پر پیالہ رکھنے کا یہی طور ہے۔
حضرت نے اس حکایت کے حاشیے پر اپنے قلم سے لکھا ہے :
”اس عاجز کی بھی یہی حالت ہے۔“

داؤد غزنویؒ

مرزا جانِ جانان رحمۃ اللہ علیہ کی لطافتِ طبع کے بہت سے قیصے ”ارواحِ ثلاثہ“ میں
درج کیے گئے ہیں۔ ایک اور حکایت کے حاشیے پر حضرتؒ لکھتے ہیں :
”اس عاجز کو حضرت مرزا صاحب سے بعض احوال واذواق میں مناسبت ہے۔“
حضرت مرزا صاحبؒ کے حالات میں یہ بھی مندرج ہے :

”حضرت مرزا صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا امتحان اور مجاہدہ سب سے نفیست و نزاکتِ طبع
میں تھا۔ ایک عورت تھی نہایت بد مزاج، کج خلق، منہ پھٹ رحضرت مرزا صاحبؒ کو امام ہوا
کہ اگر اس عورت سے نکاح کرو اور اس کی بد زبانی و اینداز ہی پر صبر کرو گے تو تم کو نواز لیا جائیگا۔
حضرت نے فوراً پیام بھیجیا اور اس سے نکاح کر لیا۔ وہ عورت اس درجہ تندخو و بد خصلت
سخت دل اور عرش گو تھی کہ الاماں حضرت مرزا صاحبؒ خوشی خوشی دولت خانہ پر تشریف
لے جاتے اور وہ سڑی سڑی سنانی شروع کرتی۔ چکے بیٹھے سنتے رہتے، زبان سے اُف نہ
نکالتے۔ اندر گھولتے آخر واپس تشریف لے آتے تھے۔ آپ کا معمول تھا کہ روزانہ صبح
ہونے ہی خادم کو حکم فرماتے کہ جاؤ دروازہ پر حاضر ہو کر میرا سلام عرض کرو اور پوچھو کوئی
کار خدمت ہو تو انجام دیا جائے۔“

اس پر حضرت نے لکھا ہے : یہ مقام اس عاجز کو کہاں نصیب ہے۔ داؤد غزنویؒ
آدابِ مجلس کا بہت خیال رکھتے تھے۔ کوئی چائے پیتے وقت زور زور سے چسکیاں
لیتا یا روٹی کھاتے وقت آواز کاتا تو انہیں ناگوار ہوتا تھا۔

۱۔ ارواحِ ثلاثہ ص ۱۸ ۲۔ ایضاً ص ۱۷ ۳۔ ایضاً حاشیہ ص ۲۵

اندازِ خطابت

خطبہ صدارت کل مغربی پاکستان اہل حدیث کانفرنس سرگودھا

یادداشتگان

مقصد

سب سے بڑا فتنہ فریجی تھا

فریجی تھا کی خطرناک چال

اسلامی معاشرے کی تشکیل

کا نشانہ نبوت کے فیض یافتگان

ما فوق العادۃ نظام

حفظ حدیث کے عوامل

حدیث کے زندہ نسخے

جابر بن عبد اللہ

ابو ایوب انصاریؓ

ایک عاشق حدیث صحابی

عمر بن الخطاب

جوانی میں شعلہ نوا خطیب تھے۔ انگریزوں کے خلاف تقریروں میں آگ برساتے رہے۔ آواز میں گھن گرج تھی۔ سراپا یقین اور اذعان بن کر سامعین کے دلوں میں اتر جاتے تھے۔ تقریر مرتب اور مربوط کرتے تھے۔ الفاظ کے چناؤ میں احتیاط برتتے تھے اور اپنے مافی الضمیر کے اظہار کے لیے موزوں ترین الفاظ چنتے تھے۔ تقریر مناسبت اور سنجیدگی سے کرتے تھے۔ تقریر کے دوران ہنسی مذاق کو دقار کے منافی سمجھتے تھے۔ جوانی میں جذباتیت علیت پر غالب ہوتی تھی، لیکن جوں جوں عمر گزرتی گئی، علیت جذباتیت پر غالب آئی گئی، ہم یہاں اُن کے آخری دور کی ایک تقریر کا مقتدر حصہ نقل کرتے ہیں تاکہ قارئین اُن کے اندازِ خطاب سے لطف اندوز ہو سکیں۔

خُطْبَةُ صَدْرَاتِ

کل مغربی پاکستان اہل حدیث کانفرنس سرگودھا

منفقہ ۱۱، ۱۵، ۱۶ مارچ ۱۹۵۸ء

معتبر معاصرین! مرکزی جمعیت اہل حدیث مغربی پاکستان کی یہ پانچویں سالانہ کانفرنس ہے جو سرگودھا میں منفقہ ہو رہی ہے۔ اس سے پہلے چار سالانہ کانفرنسیں ہو چکی ہیں۔ ان کانفرنسوں کی صدارت کے فرائض جماعت کے مقتدر حضرات سرانجام دیتے رہے۔ میری ہمیشہ خواہش رہی ہے کہ سالانہ کانفرنس کی صدارت جماعت کے برگزیدہ افراد میں سے کوئی صاحبِ فرائض ہو۔ اس طرزِ عمل کے مطابق اس دفعہ مجلس عاملہ نے یہ فیصلہ کیا کہ مولانا عبدالعزیز صاحب

سے "الاقتضام" جلد ۹ شمارے ۳۴ تا ۳۷

مہین پر پروفیسر کراچی یونیورسٹی سے درخواست کی جائے کہ صدارت کے فرائض سرانجام دیں لیکن انہوں نے اپنی مصروفیتوں کی بنا پر معذرت کا اظہار کیا اور مجلسِ عاملہ کے فیصلہ کے مطابق اس عا جہ کو کانفرنس کی صدارت کے بھی فرائض سرانجام دینے پڑے۔ یہ عا جہ ۱۹۵۲ء سے عارضہ قلب میں مبتلا ہے۔ بے شمار مصروفیتوں اور ذمہ داریوں کی وجہ سے مجھے ڈاکٹروں کے مشورے کے خلاف اپنی طاقت سے بہت زیادہ کام کرنا پڑتا ہے جس کی وجہ سے روز بروز میری صحت کمزور ہو رہی ہے۔ میرا نظامِ عصبی کسی وقت اتنا بوجھ محسوس کرتا ہے کہ میں کام سے بالکل عا جہ ہو جاتا ہوں۔ میں نے ہر چند کوشش کی، منت سماجت کی کہ کانفرنس کی صدارت سے مجھے معاف فرمایا جائے لیکن میری ایک نہ سنی گئی۔ مجبوراً اس دلِ ناتواں نے جماعت کی نفاذی کے بندھنوں کی بنا پر اس خدمت کو قبول کر لیا۔

دل کو میں اور مجھے دل محو دف رکھتا ہے

کس قدر ذوق گرفتاری ہم ہے ہم کو

اگرچہ تقسیم کے تیز و تند آلہ نے برصغیر کے دو ٹوٹے کر دیئے لیکن رُوحوں کا ملاپ اور قلوب کا اتصال ناقابلِ انفکاک ہوتا ہے۔ گزشتہ

یادِ فرنگیان

چند ماہ میں مولانا ابوالکلام آزاد اور مولانا حسین احمد حبیبی المرتبت شخصیتوں کا انتقالِ ملتِ اسلامیہ کے لیے بہت بڑا صدمہ ہے۔ مولانا ابوالکلام آزاد اس برصغیر میں علامہ جمال الدین افغانی کے ایک طرح نائیب تھے۔ مولانا حسین احمد مدنی حضرت شیخ الحدیث علیہ السلام کے شاگرد اور جانشین صادق تھے۔ ان حضرات کا نظریہ یہ تھا کہ اسلام اور ملتِ اسلامیہ کا طاقتور حریف انگریز ہے اس لیے انہوں نے اور ان کے رفقاء نے اپنی ساری قوتیں اس امر کے لیے وقف کر دیں کہ انگریز کو اس ملک سے نکال دیا جائے۔ یہی وقت کا سب سے بڑا جہاد اور اسلام کی سب سے بڑی خدمت ہے۔ اس نظریہ کے تحت انہوں نے ہر اس پتھر کو راستے سے ہٹانے کی کوشش کی جو انگریز کے اقتدار کے لیے اس ملک میں

ممد و معادن ہو سکتا تھا، ہر اُس بُت کو توڑنے کی کوشش کی جس کی پرستش سے انگریز کا تقرب حاصل ہو سکتا تھا۔ وہ اپنی اور اپنی قوم کی مادی بے لیاہتی کا خیال نہ کرتے ہوئے عظیم روحانی طاقت سے انگریز کے مقابلہ میں میدانِ جہاد میں اُتر آئے۔ انگریز دنیا کی عظیم ترین طاقت کا مالک تھا اور یہ بزرگ اور اُن کے رُفقا، مادی طاقت کے لحاظ سے کمزور اور اجتماعی قوت کے لحاظ سے صفر تھے اور قوم مختلف فرقوں اور گروہوں میں تقسیم تھی، مگر ان حضرات نے اپنی ساری خُدا داد و صلاحیتوں کو کام میں لاتے ہوئے اپنی صفوں کو اس طرح منظم کیا اور دلولہ جہاد سے اس طرح قوم کے دلوں کو گریبا کیا کہ وہ قوم جو دُنیا میں سب سے زیادہ ضعیف اور ناتواں سمجھی جاتی تھی، اُس نے دُنیا کی سب سے بڑی سلطنت کو شکست دے دی اور اس کو مجبور کر دیا کہ وہ بوریا بستر باندھ کر اس ملک سے چلا جائے اور اس کے بعد وہ دُنیا کی تیسرے درجہ کی طاقت بن کر رہ جائے۔

ان بزرگوں کا وجود اگرچہ پورے برصغیر کے لیے ایک نعمتِ عظمیٰ تھا لیکن اس میں کوئی شک نہیں کہ تقسیم ملک کے بعد جو حالات ہندوستان میں پیدا ہوئے ان کو دیکھتے ہوئے ہر ہوشمند انسان پر اُنے رکھتا ہے کہ ہندوستان کے مسلمانوں کے لیے اُن کا وجود ایک بیش بہا نعمت اور بہت بڑا سہارا تھا، اس لیے ہم سب ان بزرگوں کے سانحہ ارتحال کو ملتِ اسلامیہ کے لیے بہت بڑا صدمہ سمجھتے ہیں۔ ایسی ہستیاں صدیوں میں بھی مشکل سے پیدا ہوتی ہیں :

عمر ہا در کعبہ دُبت خانہ نے نالہ حیات

تا زبزمِ عشق یک دانائے راز آید بروں

ہم سب ان بزرگوں کے لیے دُعا، مغفرت کرتے ہیں اور بارگاہِ رب العزت سے انجا کرتے ہیں کہ ان کو اپنے جوارِ رحمت میں جگہ دے۔ یہ بزرگ اپنی اپنی زندگیاں اعلیٰ مقاصد کی راہ میں قربان کر کے ہم سے رخصت ہو کر اپنے رب عزوجل کے پاس جا پہنچے

ہیں۔ ہم بھی رختِ سفر باندھے ہوئے منظر میں کہ اللہ کا فائدہ کب آتا ہے:
 کمر باندھے ہوئے چلنے کو یاں سب یار بیٹھے ہیں
 بہت آگے گئے باقی جو ہیں تیر بیٹھے ہیں

مقصد

حضرات! ہماری کانفرنسوں کے انعقاد کا مقصد کوئی سالانہ میلہ یا
 کوئی رسمی اجتماع مستعد کرنا نہیں اور نہ صرف چند مواعظ کا سنا ہے

بلکہ اصل مقصد یہ ہے کہ ہم اپنی جماعتی زندگی کا جائزہ لیں اور یہ دیکھیں کہ ہمارا جماعتی قافلہ
 جن جن منازل سے گزرا ہے، اُسے کن کن مشکلات سے دوچار ہونا پڑا، ہم نے گزشتہ
 سال کے سفر میں کیا کچھ کھویا اور کیا کچھ پایا؟ غرض پوری تفصیلات سے مطلع ہونا اور
 سابقہ تجربہ کی بنا پر آئندہ کے لیے واضح پروگرام مرتب کرنا ہے۔

دوستو! آج ہم بڑے نازک دور سے گزر رہے ہیں۔ بیسیوں نازک مسائل ہمارے
 سامنے ہیں۔ اُن میں جماعتی مسائل کے علاوہ سیاسی، معاشی، اقتصادی اور تعلیمی مسائل ہیں،
 جنہوں نے ملک میں بے چینی اور بے اطمینانی پیدا کر رکھی ہے۔ معاشرے کی خرابی نے ہماری
 اخلاقی قدروں کو تباہ کر رکھا ہے۔ غرض بے حد اہم مسائل ملک و ملت کے سامنے ہیں اور
 ہم جب تک اپنی منتشر قوتوں کو ایک مرکز پر جمع نہیں کرتے اور اپنے قرائے عمل میں مرکزیت
 اور تنظیم پیدا نہیں کرتے، ہم نہ جماعتی مشکلات کو حل کر سکیں گے اور نہ مستقبل کے لیے کوئی
 واضح موقف متعین کر سکیں گے۔

تمام علماء کرام، معزز اراکین مرکزی جمعیت اور محترم نائبانہ گان سے انتہائی دلسوزی
 کے ساتھ یہ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ زمانہ بجلی کی سی تیزی کے ساتھ مسافت طے کر رہا ہے۔ جو
 جماعت اپنی سستی اور کاہلی کے طوق اپنی گردن سے اتار نہیں پھینکے گی اور اپنے ذہن و فکر
 کے خفتہ گوشوں کو بیدار نہیں کرے گی اور کسی واضح اور متعین نصب العین کی طرف قدم زن
 نہیں ہوگی، زمانہ اُس کو اپنے ساتھ ملانے کے لیے اپنی رفتار کو نہیں روکے گا اور اس

انتظار میں نہیں رہے گا کہ وہ سست رجوعت اپنا رختِ سفر باندھے تو اس کو اپنا رفیقِ راہ بنا کر چلے۔

دوستو! میں کس طرح یہ حقیقت آپ کے دلوں میں اتار دوں کہ یہ دورِ سستی کا دور نہیں اور نہ الفزادیت کا دور ہے، بلکہ یہ دور ایک متحرک زندگی کا طالب ہے اور اس کے ساتھ یہ اجتماعیت کا دور ہے۔ یہ اجتماعی کشش، اجتماعی جدوجہد اور اجتماعی عمل و کردار کا متقاضی ہے۔ یاد رکھو! جن لوگوں کا دامن اجتماعی زندگی کی دولت سے محروم ہوگا، وہ اس دور کے تیز رو فاصلوں کے ساتھ ہرگز نہیں چل سکیں گے اور اس کا نتیجہ اس کے سوا کوئی دوسرا نہیں ہو سکتا کہ وہ زندگی کی آخری رتق سے بھی آہستہ آہستہ محروم ہو جائیں گے۔ جب جماعتی روح سے جماعت کے افراد محروم ہو جاتے ہیں، تو وہ انسانوں کی ایک پھیڑ ہوتی ہے بلکہ انسانوں کے خالی ڈھانچے ہوتے ہیں۔ ان کا وجود عدم برابر ہو جاتا ہے کوئی ان کی طرف نظر اٹھا کر بھی نہیں دیکھتا اور کچھ عرصہ کے بعد وہ دلوں سے بھی محروم ہو جاتے ہیں اور مورخ ان کے لیے صفحاتِ تاریخ میں ایک سطر کے برابر بھی جگہ دینے کو تیار نہیں ہوتا۔ معزز حاضرین! میں آپ سے اجازت چاہتا ہوں کہ اپنے ملک سے متعلق کچھ عرض کر دوں کہ ہم آزاد ہو جانے کے بعد اسلام کے حفظ و بقا کے لیے کیا کچھ کر چکے ہیں اور تعلیماتِ اسلام کو الحاد پسند طبائع سے بچانے کے لیے کس حد تک کامیاب ہوئے ہیں؟ مجھے نہایت افسوس کے ساتھ کناٹا پڑتا ہے کہ پاکستان جس کی بنیادی اینٹ اسلام پر رکھی گئی تھی، اس پاکستان میں اسلام کے چہرے کو مسح کرنے میں بلکہ الحاد و زندقہ کو اسلام کا نام دے کر پھیلانے میں ہنس و فحش کی وہ راہیں جو تقسیم ملک سے پہلے محدود تھیں، اس کو پھیلانے میں ہم نہ صرف یہ کہ کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ کو پس پشت ڈال کر بہرہ کی طرح ونبذ و کتاب اللہ و راء ظہور ہم — کے مصداق بن گئے ہیں بلکہ عام اخلاق و عاداتِ حسہ، شرم و حیا، عفت و عصمت، صداقت و دیانت اور با احترام

غرض شرافت، دنجابت کے تمام طور طریقے چھوڑ کر جانوروں کی سی زندگی بسر کرنے لگے ہیں اور اس راہ پر اس طرح بگٹ ڈوڑ رہے ہیں کہ کسی ناصح کی آواز کسی منیہ کا مشورہ اور کسی درد مند کی بچار سُننے کے لیے تیار نہیں ہیں۔

اس سلسلہ میں آپ کے سامنے میں سب سے بڑا فتنہ پہلے بیان کرنا چاہتا ہوں۔ اُمید ہے

سب سے بڑا فتنہ فرنگی مُلا

آپ غور سے سُنیں گے اور اس فتنہ کے اسناد کے لیے مؤثر مذاہیر آپ اپنے اس عظیم انسان اجتماع میں سوچیں گے۔

دوستو! آج ہمارے ملک میں ایسے مسلمانوں کی کمی نہیں اور حکومت کی سرپرستی کی وجہ سے ایسے مسلمانوں کی کثرت روز بروز بڑھ رہی ہے جن کی زبانیں مذہب کے خلاف بے لگام ہیں۔ یہ لوگ اسلام کے زیر سایہ پروان نہیں چڑھے بلکہ انہوں نے غیر اسلامی ماحول میں تربیت پائی ہے اور مستشرقین کے لٹریچر سے اسلام کا مطالعہ کیا اور جو کچھ غیر ملکی لٹریچر میں پڑھا ہے، اسے اب اسلام کے نام سے پھیلا رہے ہیں۔ یہ ناقابل انکار حقیقت ہے کہ ان کے انکار کا منبع قرآن و سنت نہیں بلکہ ان کی ہزلیات و کُفریات کا سرچشمہ مستشرقین کی کتابیں ہیں

آپ جانتے ہیں کہ جو شخص اپنی پاک دامن کو کھول بیٹھا ہے وہ لوگوں کے طمن سے بچنے کے لیے دُردردوں کو بھی اس گناہ میں ملوث دکھا کر اپنے عیب کو مٹا کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ یہی حال یورپ کے مستشرقین کا ہے۔ عیسائی اپنے دین کی بے لیاقتی سے اچھی طرح آگاہ ہیں۔ وہ جانتے ہیں کہ ان کی کتابیں تورات و انجیل حضرت موسیٰ اور حضرت عیسیٰ علیہما السلام کے صدیوں بعد تئیں کی گئیں اور ان میں بھی بارہا تحریف اور تبدل ہوا۔ اس کے سلسلے وہ یہ بھی جانتے ہیں کہ تمام ادیان و مذاہب میں سے صرف اسلام ہی ایک ایسا مذہب ہے جس کی تعلیمات محفوظ ہیں۔ قرآن مجید آغاز نزولِ وحی سے لے کر آج تک اپنی اصلی شکل

میں محفوظ ہے۔ صحیح احادیث کے مجموعے مؤطا امام مالکؒ، صحیح بخاریؒ، صحیح مسلمؒ اور دوسری کتب صحاح محفوظ ہیں۔ محدثین کرام کی مساعی جمیلہ کی بدولت ضعیف اور موضوع و آیات چھانٹ چھانٹ کر الگ کر دی گئیں۔ راویان حدیث کے حالات و کوائف مرتب کرنے کے لیے اسما الرجال کا عظیم اٹلان فن ایجاد کیا گیا جس کی نظیر دنیا کی تاریخ میں نہیں مل سکتی اور جس کی بدولت کئی لاکھ راویوں کے حالات اس تفصیل کے ساتھ درج ہیں — ان کا نام، ولدیت، سکونت، دیانت، ذہنی قابلیت، قوتِ حافظہ، تقویٰ و عام کردار اور کس کس سے علم حاصل کیا اور کس کس کو پڑھایا — اور یہ صرف اس لیے کہ یہ وہ لوگ ہیں جو نبی اکرمؐ کے اقوال و افعال اور تعلقات زندگی کے بیان کرنے والے ہیں۔ جن میں صحابہ کرام، تابعین، تبع تابعین اور بعد کے چوتھی بھری تک کے اشخاص داخل ہیں۔ یورپ کے سامراجیوں نے اپنے دنیوی اقتدار کو سامنے رکھتے ہوئے حسب اپنی مذہبی کتابوں کو اسلام کی مذہبی کتابوں کے مقابلے میں دیکھا تو انہیں بڑی مایوسی ہوئی۔ بجائے اس کے کہ وہ اسلام کی اس برتری سے متاثر ہوتے، انہوں نے قرآن مجید اور کتب حدیث کو حاسدانہ نگاہوں سے دیکھا اور محض بغض و حسد سے اس کے درپے ہو گئے کہ قرآن مجید اور پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی کے مکمل نقوش کس طرح متغیر کیے جائیں تاکہ اس محام عالم میں سبھی ننگے نظر آئیں اور اس طرح دنیوی سرکندی کے ساتھ دینی امور میں بھی علم برداری کا مقام انہیں حاصل ہو۔

وہ قوم جو تاریخ کے پُرانے کتبہ کھنڈروں سے تلاش کر کے فخر کرتی ہے کہ ہم نے نزع انسانی کی مدفن تاریخ کو زندہ کیا ہے۔ افسوس کہ وہ اس پر فخر نہ کر سکی کہ انسان کی نزع میراث میں ایک اور صرف ایک ایسا موجود ہے جو تیز رفتاری سے اب تک محفوظ ہے — پیغمبر خدا کی زندگی کا مکمل ریکارڈ ڈیڑھ ہزار سال گزر جانے کے باوجود کتابی شکل میں موجود ہے — علم ہاں علم انسانیت کی سب سے بڑی میراث ہے۔ یورپ کے مدعیان علم کو خوش ہونا چاہیے تھا کہ انسانیت کی اس سب سے بڑی میراث

کو مسلمانوں کی کوششوں سے حیاتِ جاوید حاصل ہوئی مگر افسوس! خدا تعالیٰ اور حمد نے ان کی آنکھوں پر پٹی باندھ دی اور عظمتِ انسانی کے اس بے با جوہر کے دیکھنے سے محروم ہو گئے۔

لیکن ان مغرب پرست مسلمانوں کو کون سمجھائے، جو غلامانہ ذہنیت میں مبتلا ہو کر عزتِ نفس کے احساسات سے نا آشنا ہو کر اس نعمت کے قبول کرنے سے انکار کر رہے ہیں! جو نہ صرف اسلام کی رخصت اور عظمت کی دلیل ہے بلکہ خود انسانیت کے لیے موجبِ فخر و مباحثات ہے یہ مستشرقین کی میز سے گرے ہوئے ٹکڑے کھانے والے مسلمان! یہ کچھ یورپ کے شرق میں لیکر کے فقیر بنے ہوئے ہیں۔ شیدائے مغرب ہونے کے بعد یہ بد قسمت مسلمان مشرقیت سے محروم ہو رہی گئے مگر اہل مغرب میں بھی انہیں کوئی مقام نہیں ملا۔ یہ گھر اور گھاٹ کے درمیان روایتی کتے کی طرح چکر لگا رہے ہیں۔

فرنگی ملا کی خطرناک چال

ان مغرب پرست مسلمانوں نے اپنے آقاؤں کو دیکھا کہ انجیل ترجموں سے پڑھی جاتی ہے،

اس لیے کہ اصل انجیل (اور جنل ٹیکسٹ) ناپید ہے۔ یہ بھی اپنے آقاؤں کی نقالی میں ترقی پزیر ہے۔ کوانگریزی یا اردو کے تراجم سے سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں اور بزعم خود اس امر کے مدعی ہیں کہ قرآن فہمی کا حق ادا ہو گیا۔ اگر ترجموں کا سہارا اتنا کامیاب ہوتا تو بلا و عرب کے تمام باشندے علماء و فضلاء ہوتے کیونکہ وہ عربی زبان سے آشنا ہی نہیں بلکہ عربی ان کی مادری زبان ہے اور انگلستان، جرمنی، فرانس اور امریکہ کا ہر فرد ڈاکٹر، فلسفی اور سائنسدان ہوتا کیونکہ ان کے ہاں ان کی مادری زبانوں میں یہ علوم پڑھائے جاتے ہیں لیکن واقعہ اس کے خلاف ہے، نہ تو ہر عرب عالم قرآن و سنت ہے اور نہ ہر انگریز سائنسدان اور فلسفی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ زبانِ دانی اور فنِ دانی دو بالکل جدا چیزیں ہیں۔ فنِ دانی کیلئے زبانِ دانی بنیادی شرط ہے لیکن محض زبانِ دانی سے فنِ دانی نہیں ہوتی۔

عربی زبان میں مہارت حاصل کیے بغیر بعض نادان قرآن مجید کے اُردو، انگریزی ترجمہ پڑھ کر علوم اسلامیہ کی مہارت کے مدعی ہیں اور بزعم خود یہ سمجھ بیٹھے ہیں کہ ہم نے جس طرح قرآن کو سمجھا ہے، وہی صحیح ہے، اسے ہماری اصطلاح میں جمل مرتب کہتے ہیں۔ یہ لوگ کون ہیں؟ یہ وہ لوگ ہیں جنہیں انگریزی اقتدار کی خیرات سے کچھ عہدے اور اچھی تنخواہیں میسر آ گئی ہیں۔ ان کی تربیت — سرکارِ برطانیہ کے ظلِ عاطفت میں ہوئی تھی اور غلامانہ ذہنیت لے کر جو ان ہوئے۔ ان کی تعلیم کا معیار اور حصولِ تعلیم کی غرض و غایت اس کے سوا اور کچھ نہ تھی کہ وہ انگریزی کی اُونچی ڈگریاں حاصل کر کے ذمہ دارانہ غلامی کی جگہیں (اسامیاں) حاصل کر سکیں۔ ان بے چاروں کو علوم کتاب و سنت کی ہوا بھی نہ لگی تھی لب بدلتے ہوئے حالات میں جب کہ اجنبی آقا کا سایہ سر سے اُٹھ گیا ہے اور فضاؤں میں قرآن و سنت کی گونج سنائی دے رہی ہے تو ان کو اپنے اقتدار کے زوال کا اندیشہ ہے۔ یہ برطانوی سامراج کے فکری النسل مُسلمان آزادی و غلامی، مشرقیت و مغربیت و نیداری و لادینی، عیسائیت اور اسلام کی آخری جگ لڑ رہے ہیں۔ ان کی پہلی کوشش یہ تھی کہ اسلام نامی مذہب کی آواز بالکل دبا دی جائے اور قرآن و سنت کا کوئی تذکرہ حدودِ پاکستان میں باقی نہ رہے اور اس خدا واد مملکت میں سیکولرازم (لادینیت) کے جھنڈے بلند ہوں، مگر اس محاذ پر نکتہ کھا جانے کے بعد عیارانِ فن نے اپنے پینتے بدل دیے۔ اپنے آپ کو کتاب و سنت کا عالم قرار دے کر اپنے آپ ہی اپنے سروں پر دستارِ فضیلت کو بیچ دینے کی کوشش شروع کر دی اور یہ نعرہ لگایا کہ اسلام میں ملازم کے لیے کوئی جگہ نہیں۔ اس کا معنی کسی نے یہ نہیں لیا کہ یہ کٹھن ملا کو گالی دے رہے ہیں یا یہ علماء سٹوڈنٹس رہے ہیں بلکہ یہ سمجھا گیا کہ کتے تو "ملازم" ہی ہیں لیکن دراصل یہ لوگ دین و مذہب اور اس کے مسائل و اصول اور ان کی پابندی کے خلاف منافقانہ زبان استعمال کر رہے ہیں۔ یہ مذہب سے بیزار ہیں اور بیزاروں کا اظہار ملا کو گالی دے کر کرتے ہیں۔ یہ فرنگی ملا دینی علوم سے بے بہرہ ہیں اور اپنی

جہالت کو چھپانے کے لیے علماء پر برستے ہیں یا یہ لوگ علماء کو اپنا سیاسی حریف سمجھتے ہیں اور اس کا ذہنی انتقام ملنا کو گالی دے کر لیتے ہیں یا ان کو بادہ گوئی کی عادت ہے اور زبانِ قلم کی آوارگی کے لیے کوئی لفظ نہیں ملتا تو ملنا کو گالی سے اپنے نفس کے خبث کے لیے تسکین کا سامان مہیا کرتے ہیں۔

علماء کی بزرگوں خود تذلیل و تحقیر کر کے اور اپنے آپ کو عالمِ دین قرار دے کر معلوم ہے،

اُن کی کوششیں کیا ہیں؟

اُن کی نامبارک و نامعروف کوششیں یہ ہیں کہ علومِ دینیہ کی جو اساس ہیں یعنی قرآنِ سُنت اور اس کے بعد صحابہ کرام اور ائمہ دین کی تشریحات اُن کو ایک ایک کر کے اس طرح ساقط کر دیا جائے کہ وہ مذہب جس کی حفاظت علماء کرام نے چودہ سو برس سے اپنے خونِ پیسنے سے کی غرُبت و افلاس کی زندگی بسر کر کے، سادہ خوراک، معمولی لباس اور گھاس پھوس کی جھونپڑیوں میں بیٹھ کر امراء و سلاطین کی دولت سے مُنہ موڑ کر قناعت کی زندگی اختیار کر کے کی، اس مذہب کا چراغ اُن کی چھونچوں سے گل ہو جائے۔

”یُریدون لیطفوا نورا اللہ بافواہم واللہ مُتم نورہ و

لوکرہ الکافرون۔“

اس لیے اُنہوں نے احادیث کے خلاف کھلی بغاوت اختیار کر لی اور یک مُسلم احادیثِ نبوی کو من گھڑت اور طومار کہہ کر مُسترد کر دیا اور اس کے ساتھ ہی محدثین کرام اور ائمہ دین کے خلاف طوفانِ بے تمیزی برپا کر دیا اور جیسا کہ پہلے کہہ چکا ہوں، اپنے آقا یا انِ مغرب کی تقلید میں جو اعتراضات مستشرقین نے احادیث پر کیے، وہی اعتراض ان مغرب پرستوں نے کسی قدر عبارتِ آرائی کے ساتھ پیش کر کے مسلمانوں کو بہکانا شروع کر دیا۔ مجھے اس میں ذرا شک و شبہ نہیں کہ یہ یورپ کے عیسائیوں اور مستشرقین کے فتنہ کا لُٹ ہیں اور یہ کھلے ہوئے منافق ہیں جو اسلام کا لبادہ پن کر دہی کام کر رہے ہیں

جو یورپ کے عیسائی مشنری کسی وقت انگریز کے ظلِ عاطفت میں کیا کرتے تھے۔

معزز حاضرین! اس وقت میں آپ کے سامنے

اسلامی معاشرے کی تشکیل

قرآنِ کریم، احادیثِ نبویہ اور صحابہ کرام کے

طرزِ عمل سے حجیتِ حدیث پر دلائل نہیں پیش کرنا چاہتا، اس کے لیے کسی اور صحبت کی ضرورت ہے۔ اس وقت مجھے جو آپ سے اس بارے میں عرض کرنا ہے وہ یہ ہے کہ اسلامی معاشرے کی تکمیل حدیثِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے بغیر ناممکن ہے۔ صرف اسوۂ حسنہ محمدیہ (علیٰ صاحبنا الف الف نجاتہ وسلم) ہی ایک ایسی مشعل ہے جس کی روشنی میں ہم اپنے کھوئے ہوئے راستے کو معلوم کر سکتے ہیں اور وہ اسلامی معاشرہ جو قرنِ اول میں ایک خیرِ العقول انقلاب کا ذریعہ بنا تھا، اگر اس کی تشکیل کے عناصر معلوم کرنا چاہیں تو وہ یہ تین چیزیں ہی نظر آئیں گی:

۱- قرآن مجید

۲- آپ کے ارشادات و نواہی اور تعلیم و تلقین

۳- رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ گرامی اور آپ کی زندگی کا عملی نمونہ یا اسوۂ حسنہ۔

اگر آپ بنظرِ غائر مطالعہ فرمائیں گے تو آپ کو صاف نظر آئے گا، بعنّتِ نبوی کے

مقاصد و نتائج کے ظہور میں اور جدید امت کی تعمیر و تشکیل میں ان تینوں عناصر کا دخل ہے اور

حقیقت بھی یہی ہے کہ ان تینوں چیزوں کے بغیر ایک مکمل معاشرہ اور ایک ایسی زندگی جس میں

عقائد، اعمال، اخلاق، جذبات و کیفیات، ذوق و شوق، ایثار و حسن سلوک، مؤاسات،

مکارمِ اخلاق اور اس کے ساتھ خوف و خشیتِ الہی، توبہ و انابتِ الی اللہ، دعا و تضرع

زہد و تقاضت، شوقِ آخرت اور دنیا کی فانی دولت کی تحقیر سب ہی ہوں، وجود میں نہیں سکتی۔

میری بات یاد رکھو۔ زندگی زندگی سے مل سکتی ہے یعنی دیئے سے دیا جلتا ہے۔

صحابہ کرام اور ان کے اتباع کی زندگیوں میں جو عہدیں گھرے دینی جذبات و کیفیات نظر آتی

ہیں، وہ تہاتلادت کتاب کا نتیجہ نہیں بلکہ اس محبوب ترین، مؤثر ترین اور کامل ترین زندگی کا بھی اثر ہے جو شب و روز ان کے سامنے رہتی تھی۔ ان مجالس اور صحبتوں کا بھی فیض ہے اور ان ارشادات و نصح کا بھی جس سے وہ آپ کی حیاتِ طیبہ میں برابر مستفیض ہوتے تھے۔ ان سب کے مجرے سے وہ نیا اسلامی معاشرہ قائم ہوا جسے عہد رسالت اور عہد صحابہ کرامؓ کہا جاتا ہے اور اسلام کے عہد زریں سے بھی تعبیر کیا جاتا ہے۔ اس ماحول میں اسلام کا وہ مزاجِ خاص وجود میں آیا جس میں صرف قواعد و ضوابط کی قانونی پابندی نہ تھی، بلکہ ان پر عمل کرنے کے محرکات و ترغیبات اور اسوۂ نبویؐ کی صحیح کیفیات اور عملِ صالح کی روح بھی موجود تھی۔

غرض رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی حیاتِ طیبہ، ارشادات و نصح کا مجموعہ جسے ہم حدیث و سنت کے نام سے پکارتے ہیں، دین کے لیے وہ فضا اور ماحول تھا کہ اسے جس میں دین کا پودا سرسبز و بار آور ہوتا ہے۔ یہودی، عیسائی اور ایشیا کے دوسرے مذاہب اس لیے بہت جلد مسخ ہو گئے کہ ان کے پاس اپنے پیغمبروں کی زندگی کے صحیح اور مستند حالات اور ان کے کلام کا کوئی ایمان آفریں مجموعہ محفوظ نہیں تھا اور ان مذاہب کو وہ روحانی فضا اور ذہنی ماحول میسر نہ ہوا جس میں ان کے پیرونی نشو و ارتقاء حاصل کرتے اور مادیت کے حملوں سے محفوظ رہتے۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ پیروانِ مذاہب نے اس کمی کو پورا کرنے کے لیے احبار و رہبان اور قسین کے ملفظات و واقعات کا سہارا لیا، لگرا اس "خانہ پوری" نے رفتہ رفتہ مذاہب کو بدعات و رسوم کا مجموعہ بنا دیا اور نئی نئی تفسیروں نے اصل مذہب کو مسخ کر دیا۔

اسلام جس کو اللہ تعالیٰ نے دُنیا کا آخری مذہب قرار دیا، بحمد اللہ اس حادثہ سے محفوظ رہا یعنی جس روحانی اور ذہنی ماحول میں اور جن قلبی کیفیات کے ساتھ صحابہ کرامؓ نے زندگی گزارا، حدیث کے ذریعے اس پورے ماحول کو قیامت تک کے لیے محفوظ کر دیا۔ بعد

کو آنے والی نسلوں اور صدیوں بعد کے آنے والے انسان کے لیے یہ بالکل ممکن ہے کہ کتبِ حدیث کے ذریعے وہ اپنے ماحول سے کٹ کر ایک دم اس ماحول میں پہنچ جائے جہاں رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم بنفسِ نفیس موجود اور ارشادات و نصائح سے صحابہ کرامؓ کو مستفیض فرما رہے ہیں اور صحابہ کرامؓ تمہیں گوشِ بنائے ہوئے ارشاداتِ گرامی سُن رہے ہیں اور اس ہمکے ساتھ صحابہ کرامؓ کے جذبہ اطاعت و التقیاد کے ایمان افزہ نظارے بھی دیکھنے میں آتے ہیں۔

دوستو! حدیثِ ایک ایسی دُور بہن ہے جس سے رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی خانگی زندگی، آپ کے رات کے معمولات، دن کی مصروفیتیں انہی آنکھوں سے دیکھی جاسکتی ہیں — ہاں ہاں آپ کے قیام و سجد کی کیفیت ان آنکھوں سے اور آپ کی دُعا و مناجات کا زمزمہ کانوں سے سُنا جاسکتا ہے۔

مجھے بتلاؤ! جو آنکھیں آپ کو دھاؤں میں گھر گڑاتے ہوئے انگ بار آنکھوں سے دیکھیں اور قدمِ مبارک تروڑم دیکھیں اور جو کان اپنے سوال کے جواب میں یہ آواز سنیں کہ ”افلا اکون عبداً شکوراً“ (کیا میں خدا کا شکر گزار بندہ نہ بنوں) وہ غفلت کا شکار ہو سکتی ہیں —؟ اور جن لوگوں نے کائناتِ نبوت میں دو دو سینے جو ہما گرم ہوتے نہیں دیکھا، جنہوں نے آپ کو پیٹ پر پتھر باندھے ہوئے دیکھا، جنہوں نے آپ کی کپتہ مبارک پر خالی چٹائی پر لیٹے رہنے سے چٹائی کے نشانات پڑے دیکھے جنہوں نے سونے سے پہلے آپ کو سیرابی کے ساتھ صدقہ کا بچا ہوا سونا راہِ خدا میں خرچ کرتے دیکھا جنہوں نے مرضِ وفات میں چراغِ کاتیل پڑوسی کے گھر سے قرض آتے ہوئے دیکھا ان سے دنیاوی کی حقیقت کیسے چھپ سکتی ہے اور زہد و تقویٰ کا جذبہ کیسے ان کے اندر نہ اُجرتا؟

دوستو! جن نفوسِ قدسیہ نے رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنے گھروالوں کی خدمت، اپنے بچوں کے لیے سایہِ شفقت، اپنے خادموں کے ساتھ رحمدلی، اپنے رفقاء کے ساتھ

ہمدردی، اپنے ہمسایوں کے ساتھ حسن سلوک، اپنے مہمانوں کے ساتھ فیاضانہ میزبانی اور اپنے دشمنوں کے ساتھ صبر و تحمل اور فتوحات کے بعد عفو و درگزر فرماتے دیکھا ہو، ان کے اندر مکارم اخلاق اور انسانیتِ کاملہ کا ظور رکھوں کہ نہ ہو؟

یہ جو آپ سے کہ رہا ہوں کہ دینی ماحول، روحانی فضا اور ایمانی کیفیت کی بستی جس

کاشانہ نبوت کے فیض یافتگان

میں صحابہ کرامؓ نے پرورش پائی۔ اس بستی کے حالات حدیث کے ذریعے سے معلوم ہو سکتے ہیں۔ اس بستی میں صرف کاشانہ نبوت کا ہی دروازہ نہیں کھلا ہوا ہے جسے دیکھنے والوں کو یہ سب نظر آتا ہے بلکہ صحابہ کرامؓ کے گھروں کے دروازے بھی کھلے ہوئے ہیں۔ ان کے گھروں کی زندگی، طرز معاشرت، ان کی راتوں کا سوز و گداز، ان کے دنوں کی گرمی جہاد، ان کی بازاروں میں مصروفیت، مسجدوں میں ان کی سجدہ ریزیاں، ان کی بے نفسی و لذتیت، ان کا کمال اقیاد و اطاعت، ان کی بشری لغزشیں اور توبہ و انابت الی اللہ کے مناظر نظر آتے ہیں۔ غزوہ تبوک سے بچھڑ جانے والے کعب بن مالک کی گریہ و زاری اگر نظر آتی ہے تو عمیرؓ کا یہ قول بھی سنائی دیتا ہے کہ جھولی کی کھجوریں کھانا طویل زندگی ہے کون اس کا انتظار کرے؟ وہ ناز و نعم میں پلے ہوئے مصعب بن عمیرؓ کی درویشانہ زندگی اور غزوہ اُحد میں پرچم اسلام کی حفاظت میں یکے بعد دیگرے دونوں ہاتھوں کا کٹنا اور بالآخر شہید ہو جانا بھی نظر آتا ہے۔ وہ ایک پاؤں سے معذور (لنگڑے)، عمر بن جموح کا بڑے الحاح سے حضورؐ سے جہاد میں شرکت کی اجازت مانگنا اور اجازت مل جانے پر میدان میں اگرتے ہوئے جاتے بھی دکھائی دے رہے وہ دُعا مانگ رہا ہے: "اللھم لا تردنی الی اہلی" (یا اللہ مجھے اپنے گھر والوں کی طرف نہ لوٹاؤ) بالآخر اس لنگڑھی مانگ سے جہاد کرتے کرتے اس کا شہید ہو جانا بھی نظر آتا ہے۔ وہ حظلہؓ جس کی شادی ابھی ہوئی ہے، اہمبتری سے فارغ ہونے کے بعد ابھی غسل بھی نہیں کیا اور غزوہ اُحد میں مسلمانوں کی شکست کی خبر سن

کر اس کا بے تابانہ میدانِ جہاد کی طرف چلے جانا اور شہید ہو جانا بھی نظر آ رہا ہے۔ وہ ہر مومن کے قصہ میں عامر بن طفیل (رئیس بن عامر) کے پاس حضور کا والانا مہ پیش کرنے والے عاشقِ رسول حضرت حرامؓ کے حب عامر بن طفیل نے نیزہ مارا اور وہ پار ہو گیا، تو اُن کا یہ کہنا:

”فَزَتْ بَرَبَّ الْكَعْبَةِ“ (رَبِّ كَعْبَةِ كَيْ قَسَمِ مِيْنِ تُو كَامِيَابِ هُو كِيَا هُوِيْنِ) مجھی سُنائی دیتا ہے۔

یہاں سعد بن ابی وقاص کے وہ الفاظ جو جنگِ قادسیہ میں رستم (سپہ سالار ایرانی افواج) سے کہے گئے جاتے ہیں: ”فَانَّ مَعِيَ قَوْمًا يَحْبُوْنَ الْمَوْتَ كَمَا يَحْبِبُ الْعَاجِمُ الْحَمْرَ“

(میرے ساتھ ایک ایسی جماعت ہے جو موت کو ایسا ہی محبوب رکھتی ہے جیسا کہ تم شراب پینے کو محبوب رکھتے ہو)

کامل اطاعت اور بے مثال امثالِ حکم کے کیسے کیسے مناظر دیکھنے میں آتے ہیں۔ وہ انصاری جس نے گنبدِ دارِ کمان بنایا اور آپ نے اس پر اپنی خاموش نارضا مندی کا اظہار فرمایا، کس طرح بے تابانہ جاتا ہے اور جا کر مکانِ سمار کر کے زمین کے اس طرح برابر کر دیتا ہے کہ نام و نشان بھی باقی نہیں رہتا۔ ابو بردہؓ کے والد کا یہ قصہ بھی سامنے آجاتا ہے کہ ہم مجلس میں بیٹھے شراب پی رہے تھے، میں اُٹھا تاکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہو کر سلام عرض کروں، ادھر شراب کی حرمت نازل ہو چکی تھی۔ میں اپنے ساتھیوں کے پاس واپس آیا اور میں نے آیہ کریمہ ”فَهَلْ اَنْتُمْ مَنْتَهُوْنَ“ تک پڑھ کر سُنادی، بس پھر کیا تھا جن کے ساعز میں کچھ شراب باقی تھی، وہ فوراً گرا دی گئی اور جو شراب ہونٹوں میں پہنچ گئی تھی وہ فوراً خنوک دی گئی۔“

اللہ! اطاعت کی کیسی حیرت انگیز تصویر نظر آتی ہے جب عبد اللہ بن ابی (رضی اللہ عنہما) کا بیٹا عبد اللہؓ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کرتا ہے کہ اہلِ نیشرب کو علم ہے کہ مجھ سے بڑھ کر اپنے باپ کا کوئی فرمانبردار نہیں، لیکن اگر حضورؐ ارشاد فرمائیں، تو میں اس کا سراٹھ کر لے آؤں۔ حضورؐ نے فرمایا نہیں۔ لیکن اس نے عہد کر لیا کہ میرے باپ نے جو

یہ کہا ہے کہ اگر مدینہ واپسی ہوئی تو جو معزز ہوگا وہ ذلیل کو نکال دے گا۔ اس کا انتقام ضرور لوں گا۔ جب لوگ مدینہ واپس پہنچے تو عبد اللہ بن ابی کابیشا عبد اللہ مدینہ کے دروازے پر تلوار لیے اپنے باپ کے انتظار میں کھڑا نظر آتا ہے اور جب باپ آتا ہے تو کہتے ہیں :

”خدا کی قسم! تم مدینہ میں رسول اللہ کی اجازت کے بغیر نہیں رہ سکتے۔“

لوگ ہر جہد بھجاتے ہیں، لیکن ماں باپ، خاندان، عزیز و اقارب سب پر رسول اللہ کی محبت اور اطاعت کو ترجیح دینے والا عبد اللہ کتا ہے :

”خدا کی قسم! یہ اللہ اور اس کے رسول کی اجازت کے بغیر مدینہ میں قدم نہیں رکھ سکتا۔“

اطاعت اور فرمانبرداری کا کیسا عجیب منظر دیکھتے ہیں آتا ہے جب کہ سعد بن معاذ انصاری غزوہ بدر سے پہلے اپنی اور اپنی قوم کی وفاداری اور اطاعت شکاری کا یقین دلاتے ہوئے عرض کر رہے ہیں :

”یا رسول اللہ! ہمارے مال و دولت میں سے جو چاہیں لے لیں اور جو چاہیں دے دیں۔“

جو کچھ آپ ہم سے لے لیں گے، وہ اس سے زیادہ محبوب ہوگا جو آپ چھوڑ دیں گے اور جس بارے میں جو حکم فرمائیں گے، ہم اس کے تابع ہوں گے۔ خدا کی قسم! اگر آپ سمندر میں گھوڑا ڈال دیں گے تو ہم بھی اس میں کود پڑیں گے۔“

محبت و جاں نثاری کے ایسے واقعات نظر آتے ہیں کہ عشاق و اہل محبت کی تاریخ میں کبھی سننے میں نہیں آئے۔ یہ دیکھئے حضرت غیب کو چھانی کے تختہ پر چڑھایا گیا ہے۔ کفار کہتے ہیں کہ اب تو تم پسند کرو گے کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) تمہاری جگہ ہوں۔ وہ کہتے ہیں: خدا کی قسم! میں یہ بھی پسند نہیں کرتا کہ آپ کے پاؤں میں کانٹا چبھے اور میں چھوٹ جاؤں۔“

یہ سعد بن ربیع غزوہ اُمد میں جن کے جسم پر ستر زخم تیرا و تیرا کر کے ہیں۔ ان کی تلاش میں زبیر بن ثابت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم سے جاتے ہیں۔ جب انہیں مقتولین

اور زخمیوں کے اندر دیکھ پاتے ہیں، تو حضورؐ کا سلام پہنچاتے ہیں۔ سعد بن ربیع کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو میرا سلام عرض کرو اور میرا حال بتا دو کہ میں اس وقت جنت کی خوشبو پارہا ہوں اور میری قوم انصار سے کہہ دو:

”رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو کچھ ہو گیا، اس حال میں کہ تم میں سے ایک انھیں بھی حرکت کر سکتی ہو، تو اللہ کے ہاں تمہارا کوئی عُذر نہ ہوگا۔“

اسی اُحد کے قصہ میں انس بن نضر نظر آتے ہیں مسلمانوں کو معنوم دیکھ کر اور یہ کہتے سُن کر کہ حضورؐ کا انتقال ہو گیا ہے، پورے جوش سے کہہ رہے ہیں:

”موتوا علی ما مات علیہ رسول اللہ“

(جس دین پر آپ نے جان دی ہم بھی اسی پر اپنی زندگی نچا دو کر دیں)

اس لغوۃ فدائیت و جان نثاری کے بعد دشمنوں پر حملہ آور ہوتے ہیں اور اسی زخمِ جسم پر کھانے کے بعد جام شہادت نوش کرتے ہیں۔

وہ دیکھنے عمارہ بن زیاد اس غزوہ اُحد میں شہید ہو رہے ہیں۔ بسکیاں لے رہے ہیں اور اس حالت میں گھٹتے گھٹتے اپنا سر نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے مبارک قدموں میں رکھ رہے ہیں اور اپنے رخسارے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے تلووں سے لگا رہے ہیں۔ اور البرد جانہ کو دیکھنے کہ اُس نے اپنی پیٹھ کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے ڈھال بنا رکھا ہے۔ تیر پہ تیر لگ رہے ہیں اور وہ حرکت تک نہیں کر رہے۔ انہی کے سامنے حضرت طلحہؓ کو دیکھیے کہ اپنے ایک ہاتھ کو حضورؐ کے لیے ڈھال بنا رکھا ہے اور آپ کی طرف آنے والے تیروں کو ہاتھ پیر روک رہے ہیں۔ یہ ہاتھ ہمیشہ کے لیے شل ہو گیا۔ اور اس انصاری عورت کو دیکھیے کہ اس کا باپ، بھائی اور شوہر اُحد کے دن سب شہید ہو گئے ہیں۔ وہ اپنے گھر سے نکلی ہے اور غزوہ سے واپس آنے والوں سے پوچھتی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا کیا حال ہے؟ لوگ کہتے ہیں کہ بحمد اللہ عافیت سے

ہیں لیکن وہ کہتی ہے۔ مجھے دکھاؤ میں آپ کو دیکھنا چاہتی ہوں۔ جب آپ کو دیکھ پانی ہے تو کہتی ہے: "كَلَّ مَصِيبَةٌ بَعْدَكَ جَلَلٌ"

(آپ سلامت ہیں تو سب مصیبت، سبج ہے)

دوستو! یہ جو میں تم سے کہتا ہوں کہ زندگی زندگی سے ملتی ہے اور دُئے سے دیا جلتا ہے، دیکھتے نہیں کہ وہ فضالہ ظن عمیر جو رسول اللہ کو شہید کرنے کے لیے گھر سے نکلا ہے اور آپ کو خانہ کعبہ کا طواف کرتے دیکھا۔ جب قریب پہنچا، تو آپ نے فرمایا: "کون؟" اس "کون" کے لفظ میں کتنی مفنا طیبی طاقتیں تھیں کہ وہ فضالہ جو آپ کی جان مبارک لینے کے لیے آیا ہے کہتا ہے یہیں فضالہ ہوں۔ فرمایا: کیا سوچ کر آئے ہو۔ عرض کرتا ہے کچھ نہیں۔ آپ ہنس دیتے ہیں اور فرماتے ہیں فضالہ اللہ کے آگے توبہ کر بھرا پنا دست مبارک اُس کے سینے پر رکھ دیتے ہیں۔ فضالہ کا قلب پُر سکون ہو جاتا ہے اور مدینہ کی گلیوں میں کتنا پھرتا ہے، خدا کی قسم آج سے محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے زیادہ محبوب دُنیا میں کوئی چیز میرے لیے نہیں ہے۔ وہ عورت جو اس سے دل لگی کی باتیں کیا کرتی تھی، ملتی ہے اور کہتی ہے۔ اؤ دوست کچھ باتیں کریں۔ وہی فضالہ کہتا ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت کے بعد اب اس قسم کی باتوں کی کوئی گنجائش نہیں ہے میں اسلام قبول کر چکا ہوں، جاؤ چلی جاؤ۔

وہ کیسا اخلاقی مدرسہ اور رُردحانی تربیت گاہ تھی جو اپنے طالب علم کے اندر محاسبہ نفس کا جذبہ پیدا کرتی ہے۔ ٹھیک اس وقت جب کوئی آنکھ دیکھنے والی نہیں ہوتی اور بشرق سردری کی دجہ سے نفس امارہ کسی گناہ پر آمادہ کر دیتا ہے، تو اس کا نفس امارہ کس طرح نفسِ نو آمد بن جاتا ہے۔ دل کی پھائش چین نہیں لینے دیتی۔ ضمیرِ ملامت کرتا ہے، گناہ کا خیال کر کے بے چین ہو جاتا ہے اور قانون کے سامنے اقرارِ جرم کر کے سخت سے سخت سزا کو برضا و رغبت قبول کرتا ہے۔ وہ ما عزن مالکِ سلمی جو زنا کے جرم کا ارتکاب

کرتا ہے، کس طرح بار بار (چار دفعہ) بارگاہِ نبوت میں حاضر ہوتا ہے اور عرض کرتا ہے: یا رسول اللہ! مجھے پاک کیجیے اور خوشی خوشی سگاری کی سزا برداشت کرتا ہے۔ آپ اس کی حالت کو دیکھ کر فرماتے ہیں:

”لَقَدْ تَابَ تَوْبَةً لَوْ قَسَمْتُ بَيْنَ أُمَّةٍ لَوْ سَعْتُمْ“ (صحیح مسلم)
 (اس نے ایسی توبہ کی ہے کہ اگر ایک پوری اُمت پر تقسیم کر دی جائے؛ تو سب کو کافی ہو۔)

اس کے بعد غامدیہ آتی ہے اور وہ بھی اقرارِ جرم کرتی ہے اور کہتی ہے: ”یا رسول اللہ! مجھ سے زنا کی غلطی سرزد ہو گئی ہے، مجھے پاک کیجئے“ وہ حاملہ ہے۔ اسے حضور واپس کر دیتے ہیں۔ وضعِ حمل کے بعد پھر آتی ہے۔ پھر واپس کر دیتے ہیں جب بچے کا دودھ چھڑایا، پھر واپس آتی ہے اور عرض کرتی ہے، اب تو مجھے پاک کر دیجیے۔ اسے سگاری کا حکم دیا جاتا ہے۔ خود نمازِ جنازہ پڑھاتے ہیں۔ حضرت عمرؓ عرض کرتے ہیں کہ اس زانیہ پر آپ جنازہ پڑھتے ہیں؟“ آپ فرماتے ہیں:

”لَقَدْ تَابَتْ تَوْبَةً لَوْ قَسَمْتُ بَيْنَ سَبْعِينَ مِنْ أَهْلِ الْمَدِينَةِ لَوْ سَعْتُمْ، هَلْ وَجَدْتَ تَوْبَةً أَفْضَلَ مِنْ أَنْ جَادَتْ بِنَفْسِهَا لِلَّهِ تَعَالَى“ (صحیح مسلم)
 (اس نے ایسی مخلصانہ توبہ کی کہ اگر مدینہ کے ستر لوگوں میں تقسیم کی جائے؛ تو انہیں کفایت کر جائے اور اس سے افضل توبہ کیا ہو سکتی ہے کہ اس نے اللہ کے حکم کے آگے خود اپنے آپ کو پیش کر دیا۔)

اللہ اللہ!! دیانت و امانت اور اخلاص کے کیسے کیسے نادرہ روزگار واقعات ہیں کہ انسانی تاریخ میں ان کی مثال نہیں مل سکتی۔ مدائن فتح ہو جاتا ہے۔ تاجدارانِ آلِ ساسان کے بیش بہا خزانے صحابہؓ کے ہاتھ آتے ہیں۔ ترفیحاتِ نفس اور خواہشات پر کتنا قابو ہے اور اللہ تعالیٰ کے حاضر و ناظر ہونے پر کتنا ایمان ہے۔ قبیلہ عبد قیس کا ایک

گننام شخص مالِ غنیمت لے کر آتا ہے اور خازن کے سپرد کر دیتا ہے۔ سب لوگ اس مالِ غنیمت کو دیکھ کر حیران ہوتے ہیں اور کہتے ہیں ایسا قیمتی سامان ہمارے دیکھنے میں نہیں آیا۔ لوگ پوچھتے ہیں کہ تم نے اس مال میں سے کچھ لیا ہے؟ وہ گننام شخص کہتا ہے: خدا کی قسم! اگر اللہ کا معاملہ نہ ہوتا تو تمہیں اس کی خبر بھی نہ ہوتی۔ لوگ پوچھتے ہیں، آپ کا نام کیا ہے؟ اللہ سے اخلاص، سرتاپا اخلاص کا مجسمہ، کہتا ہے:

”میں نام نہیں بتاؤں گا، اس لیے کہ تم میری تعریف کرو گے۔ تعریف صرف اللہ کے لیے ہے۔ اسی ثواب پر میں راضی ہوں۔ جب وہ واپس جاتا ہے، توڑے گا۔ تعاقب کر کے لوگوں سے اس کا نام پوچھتے ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ اس کا نام عامر ابن عبد قیس سے اس گرامی قدر انسان کا تعلق ہے۔ فطوبیٰ لہ، ثم طوبیٰ لہ، ثم طوبیٰ لہ۔“

غرض ایک ایسا روحانی اور پاکیزہ ماحول صحابہ کرامؓ کی زندگی میں نظر آتا ہے جس میں زندگی اپنے پورے تنوعات و خلائق اور انسانی فطرت اپنے تمام خصائص کے ساتھ موجود ہے اور حدیث نے اس کا پورا فروٹ لے کر قیامت تک کے لیے اس معاشرے کے پورے حالات کو محفوظ کر دیا ہے۔

دوستو! قرآن مجید کے ساتھ آپ کے ارشادات و نصائح اور اس سارے ماحول کا محفوظ رہنا اسلام کا ایک اعجاز اور ایسا امتیاز ہے جس میں کوئی دوسرا اس کا شریک حصہ دار نہیں ہے۔ عبد نبویؐ کی یہ تصویر اور ماحول صرف حدیث کے ذریعے محفوظ ہے۔ تدوین حدیث کی تاریخ کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ کوئی بعد میں آنے والوں کی جدت طرازی نہیں، بلکہ صحابہ کرامؓ نے عبد نبویؐ ہی میں حفظِ احادیث کے لیے اپنی زندگیوں وقف کر دیں اور بعض نے کتابتِ حدیث کا بھی سلسلہ جاری رکھا، پھر انہی کے آخری دور میں تابعین کا جمعِ تدوینِ حدیث کے لیے سراپا شوق بن جانا، پھر مختلف بلادِ اسلامیہ کے تابعین علومِ نبویہ کے سمندر کا اُٹنا۔ ان کا جمع و حفظِ حدیث سے عشق و شغف، حیرت انگیز

قوتِ حافظہ، ان کا بے مثل عزم و عہد و ہمت، پھر اسماء الرجال اور فنِ حدیث کے مجتہدین کا پیدا ہونا، پھر ان کا کمال انہماک و خود فراموشی، پھر اُمت کا شوقِ حدیث اور عالمِ اسلام میں اس کی مقبولیت اور اشاعت، یہ سب واقعات اس بات کا ثبوت ہیں کہ جمعِ قرآن کی طرح اللہ تعالیٰ کو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے صحیفہٴ زندگی کو بھی محفوظ کرنا مقصدِ رحمتا۔ اس کی برکت سے حیاتِ طیبہ کا امتداد و تسلسل باقی رہا۔ یعنی اُمت کو ہر دور میں رُوحانی، علمی اور ایبانی میراثِ ملتی ربی جو صحابہ کرامؓ کو براہِ راست حاصل ہوئی تھی۔ اس طرح صرف عقائد و احکام شائع ہی میں "توارث" کا سلسلہ جاری نہیں رہا بلکہ تزکیہٴ نفس، اذوقِ ایبانی اور مزاجِ نبویؐ میں بھی توارث کا سلسلہ جاری رہا۔ اُمت کی تاریخ میں کوئی مختصر سے مختصر زمانہ ایسا نہیں آیا جب وہ عہدِ صحابہؓ کا ذوق اور مزاج مفقود اور یکسر ناپید ہو گیا ہو۔ ہر دور میں ایسے افراد رہے جو صحابہ کرامؓ کی اس رُوحانی اور ایبانی میراث کے وارث تھے یعنی وہی عبادت کا شوق، وہی زہد و تقویٰ، وہی خشیتِ اناہت الی اللہ، وہی استقامت و عربیت، وہی دُنیا سے بے رغبتی اور آخرت کا شوق، وہی جذبہٴ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر، وہی بدعات سے نفرت اور جذبہٴ اتباعِ سنت۔

اُمتِ محمدیہ کا یہ ذوق، رُوحانی اور عملی توارثِ قرنِ اَوَّل سے چودھویں صدی کے عہدِ انحطاط تک برابر قائم ہے اور اسی قرن، سعید بن المسیب، ابوسعید خدری، عبداللہ بن مبارک اور امام احمد بن حنبلؒ سے لے کر حضرت سید احمد شہیدؒ اور حضرت عبداللہ عرفیؒ تک کی زندگی میں ان کا پُر زلف نظر آتا ہے اور جب تک حدیث کا یہ ذخیرہ باقی، اور اس سے استفادہ کا سلسلہ جاری اور اس کے ذریعہ عہدِ صحابہؓ کا اسلامی معاشرہ محفوظ ہے، دین کا یہ صحیح مزاج جس میں آخرت کا خیال دُنیا پر، سنت کا اثر رسم و رواج پر رُوحانیت کا اثر مادیت پر غالب ہے، باقی رہے گا اور کبھی اُمتِ محمدیہ کو مرنا یا مادیت، انکارِ آخرت اور بدعات و تحریفات کا پورے طور پر شکار نہیں ہونے دے گا، بلکہ اس کے اثر سے ہمیشہ

اس اُمت میں اصلاحی اور تجدیدی تحریکیں اُٹھتی رہیں گی اور کوئی نہ کوئی جماعت حق کی علمبردار اور سنت کے فروغ کے لیے کفن بردوش رہے گی اور یہی معنی ہے اس حدیث نبویؐ کا:

”کایزال طائفۃ من اُمتی ظاہرین علی الحق لا یضرہم من خالغہم حتی یأتی امر اللہ“

یعنی میری اُمت میں سے ایک گروہ ہمیشہ حق پر قائم رہے گا، تا قیامِ نبیؐ کسی مخالف کی مخالفت اس گروہ کو جادہ حق سے منحرف نہیں کر سکے گی۔

یہ گروہ وہی ہو سکتا ہے جو آپ کی تشریحاتِ قرآنی، جو آپ کے صحیفہ زندگی اور جو آپ کے اسوہ حسنہ اور دارِ شانِ علومِ نبویؐ، صحابہ کرامؓ کے حالات و کیفیاتِ ایمانی اور سمیع و طاعت کے ایمان افزہ تذکرہٴ دُرِّ جمع و حفظ کرنے والے تھے یعنی محدثینِ کرام۔

حق سبحانہ و تعالیٰ نے قرآنِ کریم میں دو وعدے کیے ہیں۔ ایک وعدہ قرآنِ کریم کے لیے اور دوسرا وعدہ

ما فوق العادۃ نظام

قرآنِ کریم کی تشریح و بیان کے لیے اور ان وعدوں کی تکمیل کے لیے حیرت انگیز اور ما فوق العادۃ نظام اُس نے قائم کیا۔ یہ نظام اپنے قیام و بقا کے لیے نہ ملوک و سلاطین کا محتاج ہے اور نہ امراءِ دولت اور اعیانِ سلطنت کے جبر و تشدد سے مٹ جانے والا نظام ہے بلکہ اس کے لیے اللہ سبحانہ و تعالیٰ نے ایسی مخلوق پیدا کی جس نے امر کی دولت بخشش و نوال سے مستغنی دے بیجا نہ ہو کر بے مزد خدمت کی اور اس خدمت کو اپنا ایمانی فرض سمجھ کر اور ذریعہٴ آخرت جان کر سرانجام دیا۔ فجزاھم اللہ عنا وعن جمیع المسلمین خیر الجزاء۔ ان دونوں وعدوں کا الگ الگ ذکر کرتا ہوں۔

وبیدہ التوفیق۔

اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَاِنَّا لَهٗ لَمُحَافِظُونَ (الحجرات)

”ہم نے قرآن مجید کو نازل کیا ہے اور ہم خود اس کے محافظ ہیں“

پہلا وعدہ

قرآن مجید اللہ تعالیٰ کی آخری وحی اور قیامت تک کے لیے بنی نوع انسان کے لیے
خدا کا آخری پیغام رشد و ہدایت ہے، اس لیے اس کی حفاظت کا حق جملہ مصلحانے خود اپنے
ذمہ لیا اور اس کی حفاظت کے لیے مافوق العادۃ نظام قائم کیا۔ صحابہ کرام نے رسول کریم
صلی اللہ علیہ وسلم سے قرآن کریم سیکھا اور اپنے سینوں میں محفوظ کیا۔ صحابہ کرام کے بعد مبارک
سے آج تک کوئی لمحہ اور کوئی ساعت ایسی نہیں بتلائی جاسکتی جس میں ہزاروں لاکھوں
کی تعداد حفاظت قرآن کی موجود نہ رہی ہو۔ ذرا سوچو تو سہی کہ آٹھ دس سال کا بچہ پاکستانی،
ہندوستانی، افغانی، ترکی، چینی اور ملائی وغیرہ کسی قوم کا ہو جسے اپنی مادری زبان میں دس
بیس صفحات کا رسالہ یاد کرنا دشوار ہوتا ہے وہ ایک ایسی زبانِ عربی کی اتنی ضخیم کتاب
جو مشابہت مجلوں سے بڑھ کر ہے، اس طرح فر فر سنا دیتا ہے اور اس سے بھی بڑھ کر یہ نظارہ
بارہا دیکھتے ہیں آیا کہ کسی مجلس میں ایک بڑے عالم یا حافظ سے کوئی حرف قرآن مجید کا چھوٹ
گیا یا اعراب کی ذوقداشت ہوئی، تو چاروں طرف سے نصیح کرنے والی آوازیں بلند ہو جاتی
ہیں اور ممکن نہیں کہ پڑھنے والے کو غلطی پر قائم رہنے دیں۔ اس طرح حفاظت قرآن کے ذریعہ
اللہ سبحانہ و تعالیٰ نے قرآن مجید کی ایسی حفاظت کی کہ نزول کے وقت سے آج تک نہ بزرگ
کی تبدیلی نہ ہو سکی اور اس اہتمام اور شفقت کو دیکھیے کہ کسی نے قرآن کریم کے رکوع گن
لیے، کسی نے آیات شمار کر لیں کسی نے حروف قرآن کی تعداد بتلا دی، حتیٰ کہ بعض نے
ایک ایک اعراب اور ایک ایک نقطہ کو شمار کر ڈالا۔ فرض جس شان اور ہیبت سے قرآن مجید
اُتر اُبدوں ایک شوشہ یا زبر زبر کی تبدیلی کے محفوظ ہے۔

بعض دشمن اسلام طاقتوں نے قرآن مجید کی عالمگیر قوت کو دیکھ کر اس کی آواز کو
دبانے کی کوشش کی، لیکن وہ ناکام و نامرد رہیں۔ خداوند عالم نے اس آواز کو ہار دانگ عالم
میں پہنچایا اور دشمنوں کو بھی تسلیم کرنا پڑا کہ دُنیا میں ایک بھی ایسی آسانی کتاب نہیں، جو
تیرہ صدیوں تک ہر قسم کی تحریف سے پاک رہی ہو۔

اس کے ساتھ اس حیرت انگیز امر کو بھی دیکھئے۔ کہ قرآن مجید کے حفاظ بنانے اور مدرسہ ہائے حفظہ قرآن قائم کرنے میں ملوک و سلاطین کی قوت و دولت و سطوت کو کوئی دخل نہیں رہا۔ مسلمانوں نے از خود ہمیشہ حفظ قرآن کے لیے اپنی والہانہ عقیدت مندوں کا ثبوت پیش کیا اور ہمیشہ رضائے الہی کے حصول کے لیے اس خدمت کو اپنی زندگی کا محبوب مشغلہ بنائے رکھا۔ یہ ہے جو میں آپ سے کہ رہا ہوں کہ حفظ قرآن کے لیے اللہ تعالیٰ نے حیرت انگیز مافوق العادۃ نظام قائم کیا اور قیامت تک کے لیے اسے ہر قسم کی تحریف سے محفوظ رکھنے کا وعدہ فرمایا۔

ان علينا جمعه وقرآنہ فاذا قرأناہ فاتبع
قرآنہ ثم انّ علينا بیانہ (القیامتہ ص ۱)

دوسرا وعدہ

(قرآن کا یاد کرنا دنیا اور پڑھنا دنیا ہمارے ذمہ ہے۔ پس ہم جب (جبرئیل کے ذریعہ) قرآن پڑھ چکیں تو اس کے بعد آپ اس کو دہرائیں، اس کے بعد قرآن کی تشریح بیان کرنا بھی ہمارا ذمہ ہے)

جیسا کہ مفسرین نے لکھا ہے، شروع میں جس وقت حضرت جبرئیل اللہ کی طرف سے وحی لاتے تو ان کے پڑھنے کے ساتھ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم بھی دل میں پڑھتے جاتے تھے تاکہ بروقت اسے یاد کر لیں، مبادا جبرئیل کے چلنے جانے کے بعد وحی پوری طرح محضرت نے ہو سکے۔ مگر اس صورت میں آپ کو بڑی دقت ہوتی تھی۔ آپ کی اس حالت کو دیکھتے ہوئے اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ نزول وحی کے وقت پڑھنے اور زبان ہلانے کی حاجت نہیں، بہتر متوجہ ہو کر سننا ہی چاہیے۔ یہ نیکو نہ کیجئے کہ وحی یاد نہیں رہے گی۔ وحی الہی کا تمہارے سینے میں حرف بحرف جمع کرنا اور آپ کی زبان سے پڑھنا دنیا ہمارے ذمہ ہے۔

اس لیے معلوم ہوا کہ ایک تو قرآن ہے، دوسری چیز اس کی تشریح و توضیح۔ اس تشریح و توضیح کو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی رائے پر نہیں چھوڑا گیا، بلکہ اللہ سبحانہ و تعالیٰ

نے قرآن کی تبیین و تشریح اپنے ذمہ لی۔

پس یہ ناممکن ہے کہ قرآن کریم حسب وعدہ الہی قیامت تک محفوظ رہے، مگر اس کی شرح گم ہو جائے یا محفوظ نہ رہے۔ قرآن کریم کا دُنیا میں بطور فخر و ہدایت محفوظ رہنے کے لیے ضروری ہے کہ قرآن مجید اپنے تمام تعلقات کے ساتھ محفوظ رہے، یعنی نہ صرف پیرانہ تشریح تا ابد قرآن کریم کے ساتھ محفوظ رہے بلکہ عربی زبان اور عربی قواعد بھی محفوظ رہیں۔ اب مجھے آپ کے سامنے یہ بیان کرنا ہے کہ وہ کونسا عمیر العقول یا فوق العادۃ نظام ہے جس کے ذریعہ قرآن کریم کے بعد حدیث کی حفاظت کی گئی اور حفظ قرآن کے بعد حفظ حدیث کا بے پناہ شوق پیدا کیا گیا اور حفظ حدیث کے لیے بے مثال قوتِ حافظہ صحابہ کرامؓ، تابعین اور اُن کے شاگردوں کو بخشی گئی۔

ذرا ان اسباب و دواعی پر نظر ڈالیے جو صحابہ کرامؓ کو حفظ کتاب و سنت کے لیے

حفظ حدیث کے عوامل

میں ہوئے اور جن کی بدولت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات و نصح اور آپ کی مبارک زندگی کے احوال و وقائع محفوظ ہو گئے اور اس طرح محفوظ ہوئے کہ دُنیا کے کسی فاتح، کسی حکمران، کسی شہنشاہ، کسی فلسفی غرض کسی بڑے سے بڑے انسان کی زندگی کے احوال و وقائع اس طرح محفوظ نہیں ہوئے جس طرح رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے محفوظ ہیں۔

جس عہد میں کتاب و سنت کی حفاظت و اشاعت کی ذمہ داری

پہلا عامل

قدرت کی جانب سے ان لوگوں کے سپرد ہوئی جو صحابہ کرامؓ کے نام سے پکارے جاتے ہیں، دُنیا جانتی ہے کہ وہ اُتی تھے، وہ خط و کتابت سے کوئی زیادہ آشنا نہ تھے سوائے معدودے چند افراد کے ان کی اکثریت علمی اور کتابی مشاغل سے نا آشنا تھی اور اس وقت کی دو ممتاز قوموں مشرق میں ایرانی اور مغرب میں یومیوں

کے ساتھ اُن کا کوئی تعلق نہ تھا جس سے معلوم ہو سکے کہ عرب ان سے علمی استفادہ کرتے تھے اس لیے ان کا تمام زردار و مدار حافظہ پر تھا۔ یہاں یہ بھی واضح کر دینا چاہتا ہوں کہ عرب کے اُمی ہونے کا یہ مطلب نہیں کہ وہ علمی مشاغل سے بالکل بے بہرہ تھے۔ اُن کا سب سے بڑا دماغی مشغلہ شعر و شاعری تھا۔ وہ عرب قبائل کے انساب سے بھی دلچسپی رکھتے تھے لیکن یہ صحیح ہے کہ معمولی نوشت و خواند کا سلسلہ چند گنے چنے لوگوں تک محدود تھا۔ عام طور پر ان میں کھینے پڑھنے کا مذاق نہ تھا۔ ان کو اپنے حافظہ پر بڑا اعتماد تھا اور فرزند تھا بلکہ زبانی یاد رکھنے کی کچھ فطری سی عادت اُن کی تھی۔ حافظ ابن عبدالبر لکھتے ہیں:

”مذهب العرب انہم کانوا بطبعہم علی الحفظ مخصوصین بذلک“

(عرب کی عام حالت یہ تھی کہ وہ زبانی یاد رکھنے کی فطری عادت رکھتے (جامع)

تھے اور اس بارہ میں ان کو خاص خصوصیت حاصل تھی۔) عرب کے ایک شاعر کا کہنا ہے۔

ليس بعلم ما حوى القطر ما لعلم الاما حواه الصدر
 (علم وہ نہیں جو گناہوں میں درج ہو علم صرف وہی ہے جو سینہ میں محفوظ ہو)

دوسرا شاعر کہتا ہے:

علمی معی حیث ما یتحمّل حملہ لطنی وعاء لہ لابطن صندوق
 (میرا علم میرے ساتھ ہے، جہاں جاتا ہوں اُٹھائے لیے جاتا ہوں میرا لطن اس کا محافظ ہے نہ کہ صندوق شکم)

ان کنت فی البیت کان العلم معی اذا کنت فی السوق کان العلم فی السوق
 (اگر گھر میں رہتا ہوں تو علم میرے ساتھ ہوتا ہے، جب بازار جاتا ہوں، تو میرا علم بھی بازار میں ہوتا ہے۔)

ان اشعار سے اس قوم کے خاص رجحان کا پتہ چلتا ہے۔ اس خاص مذاق کا یہ نتیجہ تھا

کہ قدرتی طور پر ان کو اپنے حافظہ پر بھروسہ کرنا پڑتا تھا۔ عربوں کے حافظہ کی قوت کے جو واقعات کتابوں میں ملتے ہیں سچ تو یہ ہے کہ کتابوں اور نوشتوں پر مدار رکھنے والی قومیں مشکل سے ان کو باور کر سکیں گی۔

”کان احدہم یحفظ اشعار بعض فی سمعة واحدة“ (جامع)
 (ان میں بعض لوگ ایسے بھی تھے جو صرف ایک دفعہ سن کر لوگوں کے اشعار یاد کر لیا کرتے تھے)

حضرت عباسؓ کے متعلق مشور ہے کہ ان کے سامنے عمر بن ابی ربیعہ شاعر آیا اور شاعر کا ایک طویل قصیدہ پڑھا۔ شاعر کے چلے جانے کے بعد ایک شعر کے متعلق کچھ گفتگو چلی۔ ابن عباسؓ نے فرمایا کہ اُس نے فلاں مصرعوں پڑھا تھا۔ دوسرے شریک مجلس نے کہا کہ تمہیں پہلی دفعہ میں کیا پورا مصرعہ یاد رہ گیا؟ ابن عباسؓ نے فرمایا کہ تو پورے شعر شعر سنا دوں؟ اُس نے کہا۔ ہاں سنائیے۔ آپ نے اسی ترتیب کے ساتھ شعر ”...“ شعر سنا دیئے۔

علاوہ اس کے کہ عرب کا حافظہ قدرتی طور پر غیر معمولی تھا، اس کے ساتھ یہ بھی نظر آتا ہے کہ جس ذات پاک نے قرآن مجید کے متعلق ”انالہ لحفظون“ کا اعلان کیا تھا اُس نے قرآن کی عملی شکل یا قرآن کی تبیین و تشریح یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات و نصائح اور واقعات زندگی کی حفاظت کا کام جن کے سپرد کر دیا تھا، ان کے حافظوں کو یہی تائید کے ذریعہ سے بھی کچھ غیر معمولی طور پر قوی تر کر دیا تھا۔

صحیح بخاری میں حضرت ابو ہریرہؓ کا یہ قصہ تفصیل کے ساتھ مذکور ہے جب انہوں نے دربار رسالت میں نسیان کی شکایت کی تو آنحضرتؐ کی خاص توجہ اور دُعا کی برکت سے ان کا حافظہ ایسا قوی ہو گیا کہ پھر وہ کوئی چیز بھول نہیں سکتے تھے۔ اس قوت حافظہ کی برکت سے ان کے پاس اتنا ذخیرہ جمع ہو گیا کہ کسی دوسرے صحابی کے پاس نہ تھا۔ لوگوں کو ان کی کثرت

روایت پر تعجب ہوتا تو خود ہی فرماتے:

”ان الناس يقولون اكثر ابوهريرة ولولا آيات من كتاب الله ما حدثت حديثا ثم تلا وان الذين يكتمون ما انزل الله من الكتاب۔ و۔ ان الذين يكتمون ما انزلنا من البينات والهدى، وان اخواننا من المهاجرين كان يشغلهم الصفت بلاسواق واخواننا الانصار كان يشغلهم العمل في اموالهم وان ابا هريرة كان يلزم رسول الله يشبع بطنه ويحضر ما لا يحضرون“ (صحيح بحوالہ جامع)

یعنی لوگ کہتے ہیں کہ ابوہریرہؓ بہت حدیثیں بیان کرتا ہے اگر قرآن کریم کی دو آیتیں میرے پیش نظر نہ ہوتیں، تو میں کبھی کوئی حدیث بیان نہ کرتا اور دو آیتیں جن میں کتمانِ علم کے لیے وعید ہے پڑھیں اور ساتھ ہی یہ کہا کہ میرے صحابیؓ مہاجرین کا یہ حال تھا کہ وہ بازاروں میں کاروبار میں مصروف رہتے۔ اور انصار اپنے باغات اور کھیتوں میں مشغول رہتے اور ابوہریرہؓ نے رسول اکرمؐ کی مجلس اپنے لیے لازم کر رکھی تھی اور قوتِ لایوت پر گزارہ کرتا تھا۔ ابوہریرہؓ آپ کی ہر مجلس میں موجود ہتے اور دوسرے صحابی اس قدر حاضر باشی نہیں کر سکتے تھے)

ابن سعد کی روایت کے مطابق حضرت ابوہریرہؓ تیس سال کی عمر میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں خیبر کے مقام پر حاضر ہوئے۔ حضرت ابوہریرہؓ فرماتے ہیں:

”پھر میں نے نبی اکرمؐ کے پاس قیام کیا تا آنکہ آپ کی وفات ہو گئی۔ میں آنحضرتؐ کے ساتھ ساتھ ہر جگہ رہتا۔ آپ اپنی بیویوں کے مکانوں پر جاتے تو میں آپ کے ساتھ جاتا۔ ہر وقت آپ کی خدمت کرتا مچ اور سفرِ جہاد میں بھی آپ کے ساتھ رہتا۔“

اس مسلسل حاضر باشی اور خدمت کا نتیجہ خود ابوہریرہؓ فرماتے ہیں:

”میری اس وابستگی دربارِ نبویؐ کو دیکھ کر مجھ سے دوسرے صحابیؓ نبی اکرم صلی اللہ

علیہ وسلم کی احادیث دریافت کرتے تھے، ان دریافت کرنے والوں میں عمرؓ بھی ہیں
عثمانؓ بھی، علیؓ بھی اور طلحہؓ و زبیرؓ بھی ہیں۔

ایک دفعہ مروان بن الحکم نے حضرت ابوہریرہؓ کا اس خیال سے امتحان لینا چاہا کہ
یہ احادیث بہت بیان کرتے ہیں۔ دیکھا جائے کہ ان کی یادداشت تمام ہے یا مجھولی
عجلانی حدیثیں بیان کرتے رہتے ہیں۔ امام بخاریؒ نے کتاب الکئی میں اس امتحان کا
ذکر کیا ہے جس کا خلاصہ یہ ہے :

” مروان بن الحکم کے سیکرٹری ابو الزعزعة کا بیان ہے کہ ایک دن مروان نے حضرت
ابوہریرہؓ کو طلب کیا۔ آپ تشریف لائے۔ مروان نے ان کے آنے سے پہلے ہی اپنے
سیکرٹری ابو الزعزعة کو حکم دے رکھا تھا کہ پردہ کے پیچھے دوات قلم اور کاغذ لے کر بیٹھ جاؤ۔
میں ابوہریرہؓ سے احادیث دریافت کروں گا۔ جو حدیثیں وہ بیان کریں، ان کو تم نکھتے
چلے جانا۔ یہی کیا گیا۔ مروان حضرت ابوہریرہؓ سے احادیث دریافت کرتا۔ حضرت ابوہریرہؓ
بیان کرتے چلے جاتے اور پس پردہ ابو الزعزعة لکھتا جاتا تھا۔ ان احادیث کی تعداد کیا تھی؟
خود ابو الزعزعة کا بیان ہے :

فجعل يسأل وانا اكتب حديثاً كثيراً — مروان نے ابوہریرہؓ
سے پوچھنا شروع کیا۔ وہ پوچھتا جاتا اور میں احادیث لکھتا جاتا؛ چنانچہ بہت سی احادیث
میں نے لکھی ہیں۔

حضرت ابوہریرہؓ کو قطعاً مروان کی اس پوشیدہ کارروائی کا علم نہ تھا۔ محبس برسات
ہو گئی اور حضرت ابوہریرہؓ واپس تشریف لے گئے۔ مروان نے ان احادیث کے مجموعہ
کو بحفاظت تمام رکھوا دیا۔ ابو الزعزعة کہتے ہیں کہ سال بھر کے بعد مروان بن الحکم نے
حضرت ابوہریرہؓ کو دوبارہ طلب فرمایا اور مجھے حکم دیا کہ میں مکتوبہ احادیث کے مجموعہ کو
لے کر پس پردہ بیٹھ جاؤں۔ میں ان سے ان ہی احادیث کو چھپو چھپوں گا۔ دیکھتا ہوں

کہ اب وہ کیا بیان کرتے ہیں؟

یہ حضرت ابو ہریرہؓ کا گویا مروانی حکومت کی طرف سے امتحان تھا۔ امتحان لیا گیا۔ اس کا نتیجہ کیا ہوا؟ خود ابو الزعزاعہ کی زبانی سُنئے۔ ان ہی کے الفاظ عربی میں ذکر کرنا مناسب سمجھتا ہوں۔ وہ یہ ہیں :

”فترکہ سنۃ ثم ارسله واجلسنی وراء ستر فجعل يسالہ وانا انظر فی الكتاب فما زاد ولا نقص“ (کتاب الکنی - امام بخاری ص ۳۳)

یعنی مروان نے احادیث کے مجموعہ کو سال بھرتک رکھ چھوڑا۔ سال بھر کے بعد مجھے پھر پس پر وہ ٹھکا کہ حضرت ابو ہریرہؓ سے سوالات کرنا شروع کر دیے۔ ادھر میں کتاب دیکھتا جاتا تھا۔ پس ابو ہریرہؓ نے نہ کسی لفظ کا اضافہ کیا اور نہ کم کیا۔

یہ ہے جو میں آپ سے کہتا ہوں کہ قرآن کریم کی تشریح و تفسیر یعنی حدیث نبویؐ کے حفظ و بقا کا کام جن لوگوں کے سپرد کیا، ان کے حافظوں کو غیبی تائید سے غیر معمولی طور پر قوی کر دیتا تھا۔

صاحبِ کرامت کو النبی الصادق المصدق صلی اللہ علیہ وسلم سے جو الامان محبت و عقیدت تھی، اس کی مثال تاریخ عالم میں نہیں مل سکتی۔

دوسرا عامل

بقول گاڈ فرے گنس (عیسائی) :

”حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے پیغام نے وہ نشہ اپنے پیروؤں میں پیدا کر دیا تھا جس کو حضرت عیسیٰ کے ابتدائی پیروؤں میں تلاش کرنا بے سود ہے اور میں تو کہتا ہوں کہ عیسیٰ ہی نہیں بلکہ دُنیا کو چاہیے کہ یہ یاد رکھے کہ اس نشہ کی مثال نہ اس سے پہلے دیکھی گئی اور نہ اس کے بعد دیکھی جاسکتی ہے۔“

عروہ بن مسعود ثقفی جو اس وقت تک مشرف بہ اسلام نہ ہوئے تھے، صلح حدیبیہ کے

موقع پر قریش کے سامنے صحابہ کرامؓ کی داناہٹ محبت و عقیدت کا نقشہ ان الفاظ میں پیش کرتے ہیں:

ای قوم والله لقد وفدت علی الملوك، وفدت علی قیصر وکسریٰ والنجاشی
والله ما رأیتُ ملکاً قط یعظمه اصحابه ما یعظم اصحاب محمداً، واللہ
ان تمنح نجاته الا وقعت فی کف رجلٍ منهم فذلک بما وجهه وجلده، واذا
امرهم ابتدروا امره، واذا تواضوا کادوا یقتلون علی وضوئه، واذا
تکلم خفضوا اصواتهم عنده وصا یحدثون الیه النظر تعظیماً له۔ (صحیح بخاری)

(اے میری قوم! خدا کی قسم مجھے بادشاہوں کے دربار میں حاضری کا موقع ملا ہے۔
قیصر روم، کسریٰ ایران، نجاشی (شاہ حبش) کے ہاں باریابی حاصل ہوئی ہے۔ بخدا میں نے
کسی بادشاہ کے لوگوں کو اتنی عظمت کرتے ہوئے نہیں دیکھا جتنی محمدؐ کے سامنے محمدؐ کی کرتے
ہیں۔ بخدا جب وہ ٹھوکتا ہے تو وہ ضرور کسی نہ کسی کے ہاتھ پر گرتا ہے، پھر وہ اسے اپنے
چہرے اور بدن پر مل لیتا ہے۔ محمدؐ جب کسی بات کا انہیں حکم دیتے ہیں، اس کی تعمیل کی
طرف جھپٹ پڑتے ہیں۔ جب محمدؐ وضو کرتے ہیں، تو وہ آپؐ کے وضو کے پانی پر آپس میں
الچھ پڑتے ہیں۔ جب وہ بات کرتے ہیں تو سب کی آوازیں پست ہو جاتی ہیں۔ حدیث ہے
کہ وہ کمالِ عظمت کی وجہ سے محمدؐ کی طرف نگاہ بھر کر بھی نہیں دیکھ سکتے۔)

آپؐ اندازہ کیجئے کہ یہ ایک دوست کی نہیں، ایک دشمن کی شہادت ہے۔ پس جس
جماعت کی گہری محبت، دلی اُلفت اور رُوحوانی عقیدت کا یہ عالم ہو کہ ٹھوک اور وضو کے
پانی پر ایک دوسرے سے سبقت لے جانے میں گویا آپس میں اُلچھ رہے ہیں اور آپؐ کے
ایک موٹے مبارک کو گویا دنیا و مافیہا سے زیادہ محبوب سمجھتے ہوں۔ جیسا کہ صحیح بخاری
میں ہے کہ حضرت عبیدہؓ جنہیں حضرت انسؓ خادم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعے
ایک موٹے مبارک ہاتھ آ گیا ہے، فرماتے ہیں:

”لان تكون عندي شعرة منها احب الي من الدنيا وما فيها“

(میرے پاس آپ کا ایک بال ہونا اس درجہ محبوب ہے کہ دُنیا اور دُنیا میں جو کچھ ہے، وہ سب کچھ اس کے مقابلہ میں ہیچ ہے)

خُدا ربنا ہے کہ جن لوگوں کا قلبی اور رُوحانی تعلق نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ اس قسم کا ہو کہ ایک مُوسے مُبارک بھی ان کے نزدیک دُنیا و ما فیہا سے زیادہ محبوب ہو، تو ان کے نزدیک آپ کے ارشادات و فرمودات اور آپ کے نصائح و دقائق زندگی کس درجہ محبوب ہوں گے اور کیا یہ علم النفس کا مسئلہ مسئلہ نہیں کہ جب کسی سے محبت سچی ہوتی ہے اور دل کی گہرائیوں میں اس کی محبت اتر چکی ہو تو محبت صادق اپنے محبوب کی باتوں کے ذکر کرنے میں لذت حاصل کرتا ہے۔

سہا احادیث من ذکر ان تستغلمها عن الشراب وتلہیما عن الزاد

بلکہ حالت یہ بہ جاتی ہے کہ اس کی باتوں کو یاد کر کے وہ کھانے پینے سے بھی بے نیاز ہو جاتا ہے اور — اس کی ایک ایک ادا کو یاد رکھتا ہے۔ اس کے نقش و نگار کے لیے بہت سے بہتر تشبیہات تلاش کرتا ہے اور اس کی سبب عادت اپنے اندر پیدا کرنے کو موجب فخر سمجھتا ہے۔ صحابہ کرام جنہوں نے اپنا مال دجان سب کچھ آپ پر قربان کر رکھا تھا اور وہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنے نفس، اپنے ماں باپ، اپنے خاندان بلکہ سارے عالم سے زیادہ محبوب سمجھتے تھے، وہ کیڑو دُنیا کے عاشقوں سے کم تر ہو سکتے ہیں۔ یقیناً ہم دیکھتے ہیں کہ وہ حضور کے اقوال و افعال و احوال کے حفظ میں اور پھر اس کا ایک دوسرے سے مذاکرہ کرنے میں اس درجہ شوق اور اہتمام رکھتے تھے کہ پوری انسانیت کی تاریخ میں اس کی مثال نہیں مل سکتی۔ کسی ماہر فن مصور اور قادر الفن نقاش کی مصوری و نقاشی کی مثال پیش کر سکتی ہے اس تصویر کی جو حضرت علی بن ابی طالب اور سید بن ابی ہالد نے حضور کا حسیہ مبارک بیان کرنے میں پیش کی ہے۔ اگر طولِ کلام کا خوف نہ ہوتا، تو میں اسے ضرور ذکر

(المحدث) (جامع بیان العلم ۹۳)

(نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے اصحاب میں سے ایک صحابی کے بارے میں مجھے معلوم ہوا کہ ان کے پاس نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک حدیث منطام سے متعلق ہے اس حدیث کا علم اس صحابی سے براہ راست حاصل کرنے کے لیے) میں نے ایک اڈنٹ فریدا اور پلان ڈالا اور شام کی طرف روانہ ہوا۔ ایک ماہ تک برابر چلتا رہا حتیٰ کہ میں شام پہنچ گیا اور عبد اللہ بن انیس النضاری دجن کے نام سے انہیں حدیث پہنچی تھی) کے گھر پہنچا۔ اُن کے مکان کے اندر کسی قاصد کو بھیجا اور کہا اطلاع کرو تمہارے دروازے پر جا رکھو ہے قاصد نے واپس آکر پوچھا کہ کیا جاؤ ہیں عبد اللہ ہیں؟ میں نے کہا۔ ہاں۔ یہ سن کر عبد اللہ بن انیس باہر نکل آئے۔ دونوں ایک دوسرے سے بغلیگر ہوئے۔ ہلکے سلیک کے بعد جا رہے کہتے ہیں کہ میں نے پوچھا مجھے آپ کے نام سے ایک حدیث رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پہنچی ہے جو آپ نے ایک دوسرے پر ظلم کرنے اور اس کی سزا سے متعلق فرمائی ہے۔ میں نے یہ حدیث خود آنحضرت سے نہیں سنی ہے) آپ نے یہ حدیث سنی ہے؟ عبد اللہ بن انیس نے جواب میں کہا، ہاں۔ میں نے خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ حدیث سنی ہے۔ (اس کے بعد عبد اللہ بن انیس نے پوری حدیث سنائی۔)

صحیح بخاری کی روایت میں یہ الفاظ زائد ہیں:

”مجھے معلوم ہوا ہے کہ آپ کے پاس ایک حدیث رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ہے۔ مجھے یہ خوف دامن گیر ہوا کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ آپ سے اس حدیث کے سننے سے پہلے میں فوت ہو جاؤں“ (مخشیت ان اموات قبل ان اسمعه)

ذرا اندازہ کیجئے اس عشق و شیفتگی کا کہ ایک حدیث جو صحابی کے ذریعے معلوم ہو چکی ہے لیکن اب براہ راست اس صحابی سے حدیث سننے کے لیے شام کے سفر کا قصد کرتے ہیں۔ خاص اس مقصد کے لیے ایک اڈنٹ فریدتے ہیں، ایک ماہ کا برابر سفر کرتے ہیں

اور اس صحابی سے ملاقات کا مقصد وجد بیان کرتے ہیں اور سفر کی ساری کوئی دور ہو جاتی ہے جب ان کی زبان سے رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث سن لیتے ہیں۔

اس سے بھی زیادہ ایمان افروز واقعہ مشہور صحابی حضرت ابوالیوب انصاریؓ کا ہے۔ ایک حدیث جو انہوں نے

ابوالیوب انصاریؓ

خود رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے سنی تھی، لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس حدیث کے متعلق انہیں مزید توثیق کی ضرورت محسوس ہوئی۔ جس وقت حضرت ابوالیوب انصاریؓ نے یہ حدیث آنحضرتؐ سے سنی تھی اُس وقت دربار رسالت میں عقبہ بن عامر بھی موجود تھے لیکن وہ اس وقت مصر میں قیام پذیر تھے۔ آپ کو سن کر حیرت ہوگی کہ صرف ایک حدیث سننے کے لیے اور اس کی توثیق کے لیے حضرت ابوالیوب انصاریؓ مدینہ منورہ سے مصر کا سفر اختیار کرتے ہیں اور عقبہ بن عامر کے پاس پہنچ کر فرماتے ہیں۔

”حدثنا ما سمعته من رسول الله صلى الله عليه وسلم في ستر المسلم

ببق احد سمعه غيبري وغيره“

(مجھ سے وہ حدیث بیان کیجئے جسے آپ نے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے

مسلمانوں کی حیب پوشی کے متعلق سنا ہے۔ اب اس حدیث کے سننے والوں

میں سے میرے اور آپ کے سوا کوئی باقی نہیں رہا ہے۔)

حضرت عقبہ بن عامر اُن کے سامنے وہ حدیث بیان کرتے ہیں۔ حدیث کے الفاظ

یہ ہیں: ”من ستر مسلما على خزيه ستر الله عليه يوم القيامة“

(جس نے کسی مسلمان کے حیب پر پردہ ڈالا، اللہ اُس کے عیبوں پر قیامت

کے دن پردہ ڈالے گا۔)

اس کے بعد ٹیپے۔ حضرت ابوالیوب انصاریؓ اس حدیث کے سننے کے بعد محبتِ حدیث

اور اس بارے میں اپنے اخلاص کا کیا مظاہرہ کرتے ہیں۔ روایت میں ہے:

”فاتیٰ ابویوب را حلتہ فرکیجا والنصرف الی المدینۃ وصاحل رحلہ“
 حضرت ابویوبؓ حدیث سنتے ہی اپنی سواری کی طرف پلٹے، سوار ہوئے
 اور مدینہ کی طرف واپس لوٹ گئے۔ آپ نے مصر میں اپنی سواری کی کاغھی
 بھی نہ اتاری (جامع بیان العلم ص ۱۹۴)

سنن دارمی میں ایک اور صحابی کے متعلق یہ
 روایت ہے:

ایک عاشقِ حدیث صحابیؓ

”ان رجلا من اصحاب النبی صلی اللہ علیہ وسلم ورحل الی فضالہ بن عبد اللہ
 وهو بمصر فقدم علیہ وهو میدنا قنہ له فقال مرحبا قال اما فی لم ائت
 زائراً ولكن سمعت انا وانت حدیثنا من رسول اللہ رجوت ان یکون عندک
 منه علم“
 (دارمی ص ۱۳۴ طبع مصر)

آنحضرتؐ کے صحابیوں میں سے ایک صحابی فضالہ بن عبد اللہ کے پاس مصر پہنچے۔
 حضرت فضالہؓ اس وقت اپنی اٹنی کا چارہ تیار کر رہے تھے (فضالہؓ نے مسافر
 صحابیؓ نے کہا میں آپ کی زیارت کے لیے نہیں آیا ہوں بلکہ میں نے اور آپ
 نے ایک حدیث رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنی تھی۔ میں یہ امید لے کر
 آیا ہوں کہ وہ حدیث آپ کو یاد ہوگی)

حضرت عمر بن الخطابؓ نے وحی الہی اور احوالِ نبویؐ سے
 واقفیت حاصل کرنے کے لیے کیا پروگرام بنا رکھا تھا۔

عمر بن الخطابؓ

صحیح بخاری میں اس کا ذکر ہے۔ فرماتے ہیں:

”كنت انا وجارئي من الانصار في بني امية بن زيد وهي من عوالي المدينة
 وكنا نأوب النزول على رسول الله صلى الله عليه وسلم ينزل يومئذ وانزل يوما
 فاذا نزلت جئته بخبر ذلك اليرم من الوحى وغيره واذا نزل فعل مثل ذلك“

دہیں اور میرا ایک انصاری پڑوسی ہم دونوں بنی امیہ بن زید والوں کی ہستی میں سہتے تھے جو مدینہ کی بالائی بستیوں میں سے ہے۔ ہم دونوں آنحضرتؐ کی خدمت میں باری باری حاضر ہوتے تھے۔ ایک دن وہ حاضر ہوتے اور ایک دن میں حاضری دیتا۔ میں جرن حاضر ہوتا اُس دن کے حالات اور وحی وغیرہ کی خبر ان کو سنا تا اور جب وہ حاضر ہوتے تو وہ بھی اسی طرح کرتے

حدیث کی کتابوں میں اس کا کافی ذخیرہ موجود ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ خلفاء راشدین اور دوسرے جلیل القدر صحابہ ایک دوسرے سے آنحضرتؐ کی حدیث معلوم کیا کرتے تھے۔ مردوں سے اگر پتہ نہ چلتا تو امہات المؤمنین کے پاس کسی کو بھیج دیا جاتا۔ اگر ان کے پاس کوئی حدیث ہوتی تو وہ بیان کر دیتیں۔ حضرت ابو ہریرہؓ کے ذکر میں پہلے بیان کر چکا ہوں کہ ان کی مسلسل حاضر باشی کی وجہ سے حضرت عمرؓ، حضرت عثمانؓ، حضرت علیؓ اور حضرت زبیرؓ جیسے اکابر صحابہؓ ان سے احادیثِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم معلوم کیا کرتے تھے۔

حضرت انسؓ جن کو نو برس تک صحبتِ نبویؐ میں حاضر رہنے کا شرف حاصل ہے۔ ایک دفعہ وہ حدیث سنا رہے تھے کہ حلقہ کے لوگوں میں سے کسی نے پوچھا:

”انت سمعته من رسولِ اللہ صلی اللہ علیہ وسلم؟“

”کیا آپ نے خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا ہے؟“

حضرت انسؓ جو اب میں ارشاد فرماتے ہیں:

”واللہ ما کل ما نخذکم عن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سمعناہ و

لکن لم یکن یکذب بعضنا بعضا“ (طبرانی کبیر۔ متدرک حاکم)

(قسم بخدا! تمام وہ احادیث جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ہم روایت کرتے

ہیں، ضروری نہیں کہ آپ سے ہم نے خود سنی ہوں، بلکہ ایک دوسرے سے

سن کر بھی روایت کرتے ہیں کیونکہ ہم میں سے کوئی بھی ایک دوسرے کو ٹھوٹ

نہیں بیان کرتا،

حضرت براء بن مازب سے بھی اسی قسم کے الفاظ مندرام احمد میں منقول ہیں۔ فرماتے ہیں: ”ما كل الحديث سمعناه عن رسول الله صلى الله عليه وسلم يحدثنا اصحابنا عنه كانت تشغلنا عنه رعية الابل“۔

تمام احادیث ہم نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے بلا واسطہ نہیں سنی ہیں۔

ہمارے ساتھی آپ سے احادیث سنتے اور ہمیں وہ احادیث بیان کر دیتے

اس لیے کہ ہم اونٹوں کو چرانے میں مشغول رہتے تھے

غرض محدود معاشی ذرائع کی وجہ سے مہاجرین کو اپنے اہل و عیال کی پرورش کے لیے

عموماً بیوپاری یا صنعتی کاروبار میں مشغول ہونا پڑتا تھا۔ جس گاؤں کا حضرت عمرؓ نے ذکر کیا ہے

یہاں آپ کی نگرانی میں کپڑا بننے کے کرگھے تھے اور سخ نامی گاؤں میں حضرت ابو بکرؓ کا

کارخانہ تھا۔ انصار عموماً اپنے باغات اور کھیتوں میں مصروف رہتے تھے۔

لیکن بایں مہر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے احوال و وقائع اور ارشادات و نصائح کے

سننے اور یاد کرنے کا خاص شغف ان میں موجود تھا جس کی برکت سے احادیث کا وہ ذخیرہ

تابعین نے ان سے حاصل کیا اور تابعین سے امت نے۔

حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں :-

و بعد از قرآن اصل دین و سرمایہ یقین علم حدیث است و آنچه امروز از علم حدیث بدست

مردمان است ساخته و پرداختہ شیخین است ہاں سبب کہ جملہ صالحان از حدیث شیخین خود

روایت کردہ اند، نہ پنداری کہ شیخین ہیں قدر روایت کردہ اند کہ در کتب اسانید با شیال نسبت

کردہ مے شود، بلکہ بسیار سے از احادیث مرفوعہ کہ در مسانید کثرین از صحابہ مذکور است -

بحقیقت روایت شیخین است کہ عبد اللہ بن عمروؓ عبد اللہ بن عباسؓ و ابو ہریرہؓ آں را ارسال

نمودہ اند و با حضرت صلی اللہ علیہ وسلم رفع کردہ و اہل مسانید ظاہر آں را اعتبار کردہ و مسانید

ایشانوں درنوردہ اند۔“ (قرۃ العینین ص ۵۵)

”یعنی قرآن کریم کے بعد اصل دین اور سرمایہ یقین علم حدیث ہے اور یہ جو آج علم حدیث کا ذخیرہ لوگوں کے پاس موجود ہے یہ حضرت ابو بکر صدیقؓ اور حضرت عمرؓ کا ہی تو ساختہ پرداختہ ہے۔ بات یہ ہے کہ اکثر صحیح احادیث ان ہر دو حضرات ہی کی مروی ہیں اور یہ خیال نہ کرنا کہ حضرات شیخین سے صرف وہی احادیث مروی ہیں جو کتب حدیث میں ان کی طرف منسوب ہیں بلکہ بہت سی مرفوع احادیث جو کتب حدیث میں بہت سے صحابہؓ سے مروی ہیں تحقیقت میں حضرات شیخین ہی کی روایات ہیں۔ عبداللہ بن عمرؓ، عبداللہ بن عباسؓ اور ابو ہریرہؓ ان روایات کو مسلاً روایت کر کے مرفوع حدیث ذکر کر دیتے ہیں۔ اور کتب حدیث کے مصنفین ان روایات کی ظاہری صورت کا اعتبار کر کے اپنی اپنی کتابوں میں انہی صحابہؓ کی روایات میں درج کرتے ہیں“

آپ نے دیکھا کہ اس خطبہ کو پڑھتے ہوئے جذبات کی تلخیر بھی ہوتی ہے اور کتاب و سنت کا علم بھی حاصل ہوتا ہے۔ اور یہ اسوۂ رسول میں ڈوب جانے کی دلیل ہے کہ خطابت میں کبھی وعلیٰکم الكتاب والحکمہ کی سراپا تلخیر نہ جائے۔

نظریات و رجحانات

توحید
صفاتِ الہی
بزرگوں سے مرادیں مانگنا
صاحبِ قبر سے دُعا کروانا
قبروں کے پاس عبادت کرتا
سجدہٴ تعظیمی
مقامِ رسالت
خلافتِ کب تک رہی؟
حُجَّۃِ اہل بیت
امام حسین علیہ السلام سے عقیدت
بزرگوں کا ادب

توحید

حضرت شاہ ولی اللہؒ کی تالیف ”حجۃ اللہ البالغۃ“ کے باب التوحید کا حضرت والد علیہ الرحمہ نے اردو ترجمہ کیا اور اس پر نہایت مفید تعلیقات کا اضافہ کیا۔ ترجمہ اور تعلیقات کا اصل مسودہ اس وقت پیش نظر ہے۔ عقیدہ توحید کو تمام نیکیوں کا سرچشمہ سمجھتے تھے۔ اس رسالے کے ابتدائی صفحات میں حضرت والد علیہ الرحمہ نے توحید کے معنی کی وضاحت فرمائی ہے جس کی تلخیص پیش کی جاتی ہے۔ فرماتے ہیں کہ توحید کے چار درجے ہیں۔ ایک یہ کہ واجب الوجود صرف اللہ تعالیٰ ہی ہیں۔ یعنی صرف وہی ہیں جو اپنے وجود میں کسی دوسرے کے محتاج نہیں۔ اس کے سوا کوئی واجب الوجود نہیں۔ دوسرے یہ کہ صرف اللہ ہی عرش، آسمانوں، زمینوں اور تمام موجودات کا خالق ہے۔ توحید کے یہ دروزں درجے ایسے ہیں جن پر آسمانی کتابوں میں بحث کرنے کی ضرورت ہی پیش نہیں آتی، اس لیے کہ یہود و نصاریٰ تو درگنا مشرکین عرب کو بھی ان سے اختلاف نہ تھا۔ قرآن عظیم میں نہایت تصریح کے ساتھ یہ بیان فرمایا ہے کہ یہ دونوں مدارج توحید ان کے نزدیک بھی مسلم تھے۔ توحید کے ان دو پہلوؤں کے مشرکین عرب بھی قائل تھے، اس بات کی وضاحت حضرت والد علیہ الرحمہ نے تعلیقات میں ان تین آیتوں سے کی ہے :

—”وَلِلّٰهِ سُلْطٰنٌ مِّنَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ لَيَقُوْلُنَّ حَسْبُنَا اللّٰهُ الْعَزِيزُ الْعَلِیْمُ“

(الزخرف : ۹)

اگر آپ ان سے پوچھیں کہ کون ہے جس نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا تو وہ ضرور کہیں گے کہ غالب علم دلے نے انہیں پیدا کیا

۲ — وَلَئِن سَأَلْتَهُمْ مَنْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَسَخَّرَ الشَّمْسَ وَالْقَمَرَ لَيَقُوْلَنَّ اللّٰهُ فَاَنۢىۤ يُوْفِكُوْنَ (العنكبوت: ۶۱)

اگر آپ ان سے پوچھیں کہ کس نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا اور سورج اور چاند کو مسخر کیا تو وہ ضرور کہیں گے کہ اللہ نے

۳ — وَلَئِن سَأَلْتَهُمْ مَنْ نَزَّلَ مِنَ السَّمَاءِ مَاءً فَاحْيَا بِهِ الْاَرْضَ مِنْۢ بَعْدِ مَوْتِهَا لَيَقُوْلَنَّ اللّٰهُ

(العنكبوت: ۶۳)

اگر آپ ان سے پوچھیں کہ کس نے آسمان کی طرف سے بارش کا پانی اتارا اور اس کے ذریعے سے زمین کو مر جانے کے بعد پھر زندگی بخشی تو وہ ضرور کہیں گے کہ وہ اللہ ہے

فرماتے ہیں کہ توحید کا تیسرا درجہ یہ ہے کہ زمین و آسمان اور مجلہ کائنات کی تدبیر و انتظام کو صرف اللہ تعالیٰ سے ہی متعلق سمجھا جائے اور کسی کو تعمرات کائنات و تدبیر عالم میں اس کا شریک نہ جانے اور چوتھا درجہ توحید یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے سوا کسی کو عبادت کا مستحق نہ ٹھہرایا جائے۔ توحید کے یہ دونوں درجے آپس میں لازم و ملزوم ہیں اور ان کے درمیان ایسا طبعی رابطہ ہے کہ جو شخص تیسرے درجہ توحید کو مانے گا وہی چوتھے درجے میں بھی ثابت قدم رہے گا۔ انہوں نے اس بات پر زور دیا ہے کہ مشرکین کا مسلمانوں سے اختلاف جو کچھ ہوا ہے وہ انہی آخری دو مدارج توحید میں ہوا ہے۔ مشرکین عرب میں سے ایک گروہ کا یہ عقیدہ تھا کہ حق تعالیٰ کی ذات اقدس اس قدر بلند و برتر ہے کہ ہم اس کی براہ راست عبادت سے اس کا قرب حاصل نہیں کر سکتے۔ اس تک پہنچنے کے لیے ضروری ہے کہ جو اس کا تقرب حاصل کر چکے ہیں ان کی جناب میں رسائی پیدا کر لی جائے۔ ان کے توسل کے بغیر اللہ

تعالیٰ کا قرب حاصل کرنا ممکن نہیں۔ اُن کا یہ گماں تھا کہ اُن سے جو پہلے نیک لوگ گزرے ہیں انہوں نے اللہ تعالیٰ کی عبادت اور اطاعت کر کے اس کے ہاں ایسا بلند مقام حاصل کر لیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انہیں خلعت الوہیت سے سرفراز فرمایا ہے اور ان کو اس عالم کے بعض امور میں تصرف کا اختیار دے دیا ہے۔ اُن کا یہ بھی عقیدہ تھا کہ یہ بزرگ مُنتہی ہیں دیکھتے ہیں، اپنے پرستاروں کی سفارشیں کرتے ہیں۔ ان کی حاجت روائی اور مشکل کشائی میں مدد کرتے ہیں اور معاملات کی تدبیر انہی سے متعلق ہے۔ اسی خیال سے انہوں نے پتھروں کے بُت اُن بزرگوں کے نام پر بنائے اور ان بزرگوں کی ارواح کی طرف متوجہ ہونے کے لیے ان مادی صورتوں کو وسیلہ اور ذریعہ بنایا اور بالآخر نبت یہاں تک پہنچی کہ پچھلے لوگوں نے اپنے اسلاف سے ایک قدم اور آگے بڑھایا اور ان بُتوں کو ہی اصل سمجھنے لگ گئے اور خود انہی کو معبود اور حاجت روا قرار دے دیا۔ یہی وجہ ہے کہ حق سبحانہ و تعالیٰ نے قرآن کریم میں ان مُشرکین کے باطل عقائد کی تردید میں کبھی تو اس پر تنبیہ کی ہے کہ تمام کام اللہ ہی کے حکم سے سرانجام پاتے ہیں اور وہی سب کا مالک اور اسی کے قبضہ قدرت اور تصرف میں سب کچھ ہے اور کوئی دوسرا اس کا شریک نہیں اور کبھی اس بناء پر ملامت کی ہے کہ وہ محض پتھر کی صورتوں کی پوجا کرتے ہیں۔“

حضرت والد علیہ الرحمہ نے تعلیقات میں استواء علی

صفات الہی

العرش پر یہ نوٹ دیا ہے :

”استواء علی العرش“ اللہ تعالیٰ کی صفاتِ کاملہ میں سے ایک صفت ہے۔ صفاتِ الہی کے متعلق یہ بات ہمیشہ یاد رکھنی چاہیے کہ نصوص قرآن و حدیث میں کئی ایسے الفاظ حق سبحانہ تعالیٰ کی صفات کے لیے استعمال کیے گئے ہیں جو مخلوق کے لیے بھی استعمال کیے جاتے ہیں۔

۱۰ باب التوحید صفحہ ۳۲۸

جیسا کہ سمیع، البصیر، علیم اور منکلم۔ خالق و مخلوق میں جس طرح مشابہت اور مماثلت نہیں، لیس کمثلہ شئی،“ اسی طرح ان کی صفات میں بھی مشابہت اور مماثلت نہیں، جس طرح ہم یہ ایمان رکھتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ سُنا ہے، دیکھتا ہے، کلام فرماتا ہے جیسا کہ اس کی شانِ اقدس کے لائق ہے، اسی طرح ”استواء علی العرش“ کے متعلق بھی یہی ایمان ہونا چاہیے کہ ”استواء حکما یدلیق بشانہ“ جیسا اس کی شانِ ارفع کے لائق ہے اسی طرح اسے استواء علی العرش سے مقصوف مانتے ہیں۔“

حضرت والد علیہ الرحمہ کے ہاں تشدد اور غلو نہ تھا۔ مسلک میں اعتدال تھا۔ بزرگانِ کرم کے لیے لفظ ”سیدنا“ کے استعمال میں کوئی مضائقہ نہ سمجھتے تھے۔ ایک موقع پر حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے ارشاد فرمایا تھا: ”السید هو اللہ“ یعنی حقیقی معنوں میں سیادت اللہ تعالیٰ ہی کے لیے ہے اور اسی حدیث کی بنا پر بعض علماء نے مخلوق کے لیے اس لفظ کے استعمال کو ناجائز قرار دیا۔ اس حدیث کی تشریح تعلیقات میں یوں کرتے ہیں:

”منذ امام احمد اور سنن ابی داؤد میں پوری روایت یوں ہے کہ مطرف بن عبد اللہ بن الشیخ کہتے ہیں کہ میں بنی عامر کے ایک دند کے رکن کی چہنیت سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا، تو ہم نے آپ سے عرض کیا: انت سیدنا؟ آپ ہمارے سید ہیں تو آپ نے فرمایا: ”السید هو اللہ“ ”سید“ کا اطلاق اللہ کے لیے ہے۔ اس کے بعد ہم نے کہا کہ آپ ہم سب میں عظیم المرتبت اور افضل ہیں، آپ نے فرمایا: ہاں! یوں کہو یا اس کے کوئی ہم معنی لفظ کہہ سکتے ہو۔“ و فرد میں جو لوگ حاضر خدمت اقدس ہوتے تھے ان میں سے اکثر نئے نئے حلقہ اسلام میں داخل ہوئے تھے ایسے لوگوں کے لیے احتیاط کے طور پر نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ایسے الفاظ و آداب سے بھی منع فرماتے تھے جن سے

کسی قبم کا ادنیٰ میلان بھی شرک کی طرف ہو جائے۔ جیسا کہ صحیح احادیث سے ثابت ہے کہ شروع شروع میں آپ نے مردوں اور عورتوں سب کو زیارتِ قبور سے منع فرمادیا تھا، لیکن جب اسلام راسخ ہو گیا اور عقیدہ توحید پختہ ہو گیا اور عبادتِ قبور کا شائبہ نکل نہ رہا تب آپ نے زیارتِ قبور کی اجازت دے دی۔ یہ تفصیل اس لیے کی گئی ہے کہ صحیح احادیث سے ثابت ہے کہ آپ نے انصار سے سعد بن معاذ کے ہاں سے فرمایا: ”قوموا الی سیدکم“ یعنی اپنے سید کی طرف کھڑے ہو جاؤ اور آپ نے حضرت ابو بکر صدیقؓ اور عمر فاروقؓ کے لیے فرمایا: ”سید اکھول اهل الجنة“ یہ دونوں جنت کے بزرگ عمر کے لوگوں کے سید ہیں (ترمذی، اور حضرت حسنؓ کے لیے فرمایا: ”ابنی هذا سید“ میرا یہ بیٹا سید ہے۔ بخاری، اور حضرت حسنؓ اور حضرت حسینؓ دونوں کے لیے فرمایا: ”سید اشباب اهل الجنة“ یہ دونوں جنت کے نوجوانوں کے سید ہیں (ترمذی، اور فاطمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے لیے فرمایا: ”سیدۃ نساء اهل الجنة“ جنت کی تمام عورتوں کی سیدہ (سرور) ہیں (صحیحین، اور غلام کے لیے فرمایا: ”ان العبد اذا النصح سیدہ الخ“ غلام جب اپنے آقا کی خیر خواہی کرے اور اللہ کی عبادت اچھی طرح سے کرے اسے دو گنا ثواب ہوگا (صحیحین، معلوم ہوا کہ سید کا لفظ سرور قوم بزرگ محترم اور آقا کے معنوں میں استعمال ہو سکتا ہے۔

بعض لوگ توحید بیان کرتے ہوئے انبیاء اور اولیاء کا ذکر ناشائستہ انداز میں کرتے ہیں۔ حضرت کو یہ بات بہت ناگوار ہوتی تھی؛ چنانچہ تعلیقات میں لکھتے ہیں:

”یہ بہت اچھی طرح ذہن نشین کر لینا چاہیے کہ فرق مراتب بیان کرتے ہوئے نبی الہم صلی اللہ علیہ وسلم کا ذکر اس طرح نہ کریں کہ اس سے ادب کے خلاف کوئی لفظ زبان پر آجائے مثلاً علم غیب کے مسئلہ کا ذکر کرتے ہوئے اس طرح اگر کوئی کہہ دے کہ آپ غیب دیب

صا باب التوحید (تعلیقات) ص ۱۳

کچھ نہیں جانتے تھے (معاذ اللہ) تو یہ سوہ ادب ہوگا اور آپ کی شان میں سوہ ادب کفر کی حد تک پہنچا دیتا ہے کیونکہ قرآن کریم میں حق تعالیٰ نے آپ کے متعلق یہ آداب بیان فرمائے ہیں ”اور اپنی آوازیں پیغمبر (صلی اللہ علیہ وسلم) کی آواز سے اونچی نہ کرو اور جس طرح آپس میں ایک دوسرے سے زور سے بولتے ہو، اس طرح ان کے دوبرو زور سے نہ بولا کرو۔ ایسا نہ ہو کہ تمہارے اعمال ضائع ہو جائیں اور تم کو خبر بھی نہ ہو“ (مجلات ۲)۔

”پیغمبر کے بلانے کو ایسا خیال نہ کرنا جیسا کہ تم آپس میں ایک دوسرے کو بلاتے ہو“ (نور ۶۳) یعنی رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو ادب اور تعظیم سے بلانا چاہیے۔ پس یوں کہنا چاہیے کہ مغیبات کا علم حق سبحانہ و تعالیٰ ہی کو ہے لیکن اُس نے بعض غیب کی باتوں کا علم اپنے رسول پاک کو عطا فرمایا ہے۔ یہ تو ہے تمخوئیات کے متعلق۔ رہا شریحات کا علم جو انبیاء اکرام کے منصب سے متعلق ہے، اس بارہ میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا علم اولین و آخرین سے بڑھ کر ہے اور وہ علوم و معارف حق تعالیٰ نے آپ کو مرحمت فرمائے ہیں کہ کسی انسان کی طاقت میں نہیں کہ ان سب پر حاوی ہو سکے۔

يارب صلِّ وسلِّم دائماً ابداً
على حبيد خير المخلوق كلِّهم ﷺ

بزرگوں سے مرادیں مانگنا

حضرت والد علیہ الرحمۃ ہر اہم بات سے جس میں شرکِ حلی یا شرکِ غنی کا ہلکا سا بھی شائبہ ہوتا یا جس بات کے سبب آئی اللہ کے ہونے کا احتمال ہوتا، شدت سے منع فرماتے تھے۔ فرماتے تھے کہ بزرگوں کی قبروں پر جا کر ان سے مرادیں مانگنا شرکِ حلی ہے۔ عربوں کے جس فعل کی بنا پر قرآن مجید انہیں مُشْرکِ مُعْتَمَرِ تَا ہے، وہ یہی تھا کہ وہ اپنی مصیبتوں اور حاجتوں میں اللہ کے سوا اپنے بزرگوں کو پکارتے اور ان سے مدد چاہتے تھے اور ان کو انسانی شفیق

۱۰ باب الترجید (تعبیحات) ۱۸-۱۹

کرتے ہیں۔ فرماتے تھے "توحید" کی منزلِ سحت کٹھن ہے اور تمام انبیاء کی بعثت کا ایک عظیم مقصد انسانوں کو توحید کی معرفت بخشنا اور عملی زندگی میں توحید پر قائم رہنے کی ان میں صلاحیت پیدا کرنا تھا۔ فرماتے تھے جب تک توحید کے مندرجہ ذیل مقامات کی معرفت محفل نہ ہو اور عملی زندگی میں ان مقامات پر ثابت قدمی حاصل نہ ہو اس وقت تک توحید کچی اور دھوکھی ہے۔

۱۔ "لَا مَحْبُوبَ إِلَّا اللَّهُ" یعنی محبوبِ حقیقی اللہ ہی ہے اور اس کی محبت تمام محبتوں پر غالب ہونی چاہیے۔ اس کی ذات تمام چاہتوں اور محبتوں کا مرکز و محور ہونی چاہیے۔ ہم سب کو اسی کی خاطر چاہیں، سب کو اسی کی خاطر پیار کریں اور جب اس کی محبت اور عزیزوں کی محبت کے تقاضوں میں تصادم ہو تو سب کو اس کی خاطر خیر باد کہہ دیں۔

۲۔ لَا مُتَصَرِّفَ فِي الْعَالَمِ إِلَّا اللَّهُ۔ اس جہاں میں تصرف و اختیار اللہ ہی کا ہے۔ نفع و ضرر کا مالک وہی ہے۔ اگر تمام انسان مل کر چاہیں کہ تمہیں کوئی فائدہ پہنچا سکیں اگر اللہ کی مشیت نہ ہو، تو تمہارا بال بھی بیکانہ نہ کر سکیں گے۔

۳۔ لَا مَخَوْفَ إِلَّا لِلَّهِ۔ جب نفع و ضرر کا اللہ ہی مالک ہے تو خوف بھی صرف اللہ ہی کا دل میں ہونا چاہیے۔ اللہ کے سوا کسی کا خوف دل میں باقی نہ رہے۔

۴۔ لَا مَرْجُوَ إِلَّا لِلَّهِ۔ جب نفع و ضرر کا وہی مالک ہے تو ہماری تمام امیدیں بھی اسی سے وابستہ ہونی چاہئیں۔

فرماتے تھے: "بعض لوگ قبروں سے تو مرادیں نہیں مانگتے ہیں لیکن امراء، روساء اور حکام کے دروازوں کی دھول چاٹتے ہیں۔ محض قبروں پر چادر نہ چڑھا کر اور چراغ نہ جلا کر یہ سمجھنا کہ توحید کے سب تقاضے پورے ہو گئے ہیں، بہت بڑی غور فریبی ہے۔ قرآن نے جہاں بھی توحید بیان کی۔ "من دون الله" کے لفظ استعمال کیے۔

(۱) وَمِنَ النَّاسِ مَن يَتَّخِذُ مِن دُونِ اللَّهِ إِندَادًا۔ اور لوگوں میں سے کچھ ایسے ہیں جو اللہ سے سٹ کر اوروں کو اس کا ہم پیمانہ بنا لیتے ہیں۔

(ب) اِنَّ الَّذِيْنَ تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ عِبَادًاۙ اَمْثَلُكُمْ - اللہ کے علاوہ جن کو تم پکارتے ہو وہ بھی تمہاری طرح بندگانِ الہی ہیں۔

(ج) وَ الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ لَا يَخْلُقُوْنَ شَيْۤءًا وَّهُمْ يُخْلَقُوْنَ - اور جو لوگ اللہ کے سوا اوروں کو پکارتے ہیں وہ خود کسی چیز کے خالق نہیں بلکہ انہیں پیدا کیا گیا ہے۔

”مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ“ کے لفظ اتنے جامع ہیں کہ ان میں تمام غیر اللہ شامل ہیں۔ اس میں تمام مُردوں اور زندوں کی یکساں نفی کی گئی ہے اور زندہ مخلوقوں کی نفی کرنا زیادہ کٹھن ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن میں زندہ خداؤں کی نفی کا ذکر بہت شرح و بسط کے ساتھ کیا گیا ہے۔ حضرت ابراہیمؑ نے مزدکی نفی کیسے کی؟ حضرت موسیٰؑ نے فرعون کے سامنے ”نفرہ لا“ کیسے لگایا؟ کتنے لوگ ہیں جنہیں موحّد ہونے کا دعویٰ ہے اور وہ توحید کی اجد ہونے سے بھی نا آشنا ہیں۔ ظالم اور جاہر حکمرانوں کے خوف کے مارے ان کی زبانیں گنگ ہیں اور کلام حق کتے ہوئے بھلاتی ہیں۔ کتنے ظالم ہیں جو اپنے آپ کو توحید کے بلند ترین مقام پر فائز سمجھتے ہیں اور پوری تہمتِ اسلامیہ کو حقیر مانتے ہیں اور ان کی توحید کا یہ حال ہے کہ حقیر ترین دنیوی اغراض کے لیے دنیا دار سرمایہ داروں کے گھروں کا طراف کرتے ہیں اور ان کی منصبیں اور شاہیں ان کی چا پلوسی میں بسر ہوتی ہیں۔ کیا ”مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ“ میں صرف حضرت عبدالقادر جیلانیؒ اور حضرت علی ہجویریؒ ہی شامل ہیں؟ کیا فاسق و فاجر حکام اور دنیا دار سرمایہ دار ”مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ“ میں شامل نہیں ہیں؟ یہ کیا منطقی ثبوتی...؟ توحید کا یہ تصور ان لوگوں نے اپنے جی سے گھڑ لیا ہے۔ کتاب اللہ اور حدیث رسول اللہ کی توحید تو بڑی انقلاب آفرین ہے۔“

حضور اقدس علیہ الصلوٰۃ والسلام کے ساتھ دارالامانِ محبت
مخفی اور ان کا ذکر نہایت ادب و تعظیم سے کرتے تھے۔

مقامِ رسالت

مقام رسالت بیان کرتے ہوئے حافظ ابن قیمؒ کا یہ قول مزے لے لے کر نیا کرتے تھے۔ کسی شخص نے حافظ ابن قیمؒ سے پوچھا کہ روضۃ الطہر افضل ہے یا کعبہ؟ تو حافظ ابن قیمؒ نے فرمایا:

”ان اردت مجرد الحجرة فالکعبة افضل وان اردت وهو فيها فلا والله ولا العرش وحملته ولا جنت عدن ولا الافلاک الدائرة لان بالحجرة جسدًا لو وزن بالکونین لرجح“

(اگر تمہاری مراد محض حجرتہ نبویؐ سے ہے تو کعبہ افضل ہے اور اگر تمہاری مراد جسدِ الطہر سمیت روضۃ النور سے ہے تو خدا کی قسم وہ عرش سے افضل ہے۔ عاقلین عرش سے افضل ہے، جنتِ عدن سے افضل ہے گردش کرنے والے افلاک سے افضل ہے! اس لیے کہ روضہ میں ایک ایسا جسدِ طہر ہے کہ اگر دو وزن جہانوں کے ساتھ بھی اُسے تولابائے، تو وہ بھاری رہے۔)

اپنی ایک یادداشت میں ”ازالة الخفاء“ کے حوالے سے یہ حدیث نقل کی ہے۔

خلافت کب تک رہی؟

قال صلى الله عليه وسلم ”الخلافة بعدى ثلاثون سنة ثم يكون بعد ذلك الملك“ (حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا میرے بعد خلافت تیس برس رہے گی پھر اس کے بعد مہرکیت ہوگی)

اس کے بعد ایک دوسری روایت بھی نقل کی ہے جس کے الفاظ یوں ہیں:

”ثم يكون ملكاً عضوياً“ پھر اس کے بعد ظالم بادشاہ ہوگا۔

یہ جو حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا خلافت تیس برس تک رہے گی، تو حضرت

والد علیہ الرحمۃ نے ان تیس برسوں کا حساب باضابطہ اپنی یادداشت میں یوں قلمبند کیا ہے :

سال	دن	آیات
۲-۳-۸	۸-۳-۳	تین و ثلاثہ اشہر و ثمانیۃ ایام
۱۰-۶-۳	۳-۶-۱۰	ایام عمر ——— عشر سنین و ستۃ اشہر و اربع لیل
۱۱-۱۱-۱۳	۱۱-۱۱-۱۱	ایام خٹان ——— احد عشرۃ سنۃ و احد عشر شہراً و ثلاثۃ عشر یوماً
۳-۷-۱	۱-۷-۳	ایام صلح ——— اربع سنین و سبعة اشہر و یوماً
— ۸-۱۰	۱۰-۸-—	ایام الحسن ——— ثمانیۃ اشہر و عشرۃ ایام
۳-۰-۶	۶-۰-۳	

اس کے بعد شاہ ولی اللہ کا ”ازالۃ الخفاء“ سے یہ قول نقل کیا ہے :

”حضرت معاویہؓ و نبرامیہؓ و جو عباسی ازالہ خارج باشند“

حُبِ اہل بیت

اہل بیت سے انہیں بے پناہ محبت اور عقیدت تھی۔ اپنے مقالے ”اُسوہ حسین“ میں خانوادہ نبوت کی مدح و توصیف میں یوں رقمطراز ہیں :

”اس میں کوئی شک نہیں کہ اہل بیت کی محبت کے پاکیزہ جذبات اور مخلصانہ دلچسپی ایک مومن قانت اور مسلم صادق کی زندگی کی ایک قیمتی متاع ہے اور یہ صحیح ہے کہ اس محبت اور شینگی کا سرچشمہ فی الحقیقت وہ محبت و عقیدت ہے جو اس مقدس و مطہر وجود سے متعلق ہے جس کو خدا نے تمام کائناتِ انسانی میں ہر طرح کی محبوبیت کے لیے چُن لیا پھر سب سے بڑھ کر یہ کہ جس خاندانِ نبوت کو خدا نے قرآنِ کریم میں مخاطب کر کے ان کی طہارت اور پاکیزگی کا اعلان کیا ہے :

” اِنَّمَا يُرِيدُ اللّٰهُ لِيُذْهِبَ عَنْكُمُ الرِّجْسَ اٰهْلِ الْبَيْتِ وَيُطَهِّرَكُمْ

تَطْمِئِرًا - (سورۃ اعراب)

(اے اہل بیت! خدا کو تو بس یہی منظور ہے کہ تم سے ہر قسم کی میل کچیل دور کر دے اور تم کو ایسا پاک و صاف کر دے جیسا پاک و صاف ہونے کا حق ہے)

اور جن کی عزت و عظمت کا یہ عالم ہو کہ قرآن کریم میں مسلمانوں کو ان پر صلوة و سلام بھیجے کا حکم دیا گیا ہو:

”إِنَّ اللَّهَ وَمَلَائِكَتَهُ يُصَلُّونَ عَلَى النَّبِيِّ يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا صَلُّوا عَلَيْهِ وَسَلِّمُوا تَسْلِيمًا“

(اللہ اور اس کے فرشتے پیغمبر پر درود بھیجتے رہتے ہیں۔ مسلمانو! تم بھی اس پر درود و سلام بھیجتے رہو)

جس کی تشریح کے لیے ایک صحابی نے آپ سے دریافت کیا:

أَمَرَ نَا اللَّهُ أَنْ نُصَلِّيَ عَلَيْكَ يَا رَسُولَ اللَّهِ فَكَيْفَ نُصَلِّيَ عَلَيْكَ؟

(ہمیں اللہ نے آپ پر درود بھیجنے کا حکم دیا ہے، ہمیں بتائیے کہ کس طرح آپ پر درود بھیجا کریں۔)

آپ نے جواب میں ارشاد فرمایا، یوں کہو:

”اللَّهُمَّ صَلِّ عَلَى مُحَمَّدٍ وَعَلَى آلِ مُحَمَّدٍ كَمَا صَلَّيْتَ عَلَى آلِ إِبْرَاهِيمَ وَ بَارِكْ عَلَى مُحَمَّدٍ وَعَلَى آلِ مُحَمَّدٍ كَمَا بَارَكْتَ عَلَى آلِ إِبْرَاهِيمَ إِنَّكَ حَمِيدٌ مُجِيدٌ“

(صحیح مسلم - ج - ۱ - ۱۴۱)

اور جن کی محبت و مودت اس درجہ مطلوب و منظور ہو کہ قرآن کریم میں اس کے لیے یوں ارشاد ہو:

”قُلْ لَا أَسْأَلُكُمْ عَلَيْهِ أَجْرًا إِلَّا السُّؤْدَةَ فِي الْقُرْبَى“ — آپ اس کا اعلان کر دیجئے کہ میں تم لوگوں سے تبلیغ رسالت پر کوئی مزدوری نہیں مانگتا، مگر اقرباء

کی محبت۔“

اور جن کے عز و شرف کا یہ مقام ہو کہ حجۃ الوداع کے خطبہ میں کتاب اللہ کے ساتھ ساتھ آپ نے ان کا ذکر کیا ہو:

”وَ اَنَا تَارِدٌ فَبِكْرُ التَّمْلِیْنِ - كِتَابُ اللّٰهِ وَ اَهْلُ بَيْتِیْ -“ (صحیح مسلم)
 (میں تم میں دو بزرگ ترین چیزیں چھوڑ کر جا رہا ہوں۔ ایک اللہ کی کتاب،
 دوسرے اہل بیت۔)

اور جن کی محبوبیت کا یہ حال ہو کہ آپ ان کے متعلق فرمائیں:

”هَذَا ابْنِ ابْنَائِیْ وَ ابْنَاتِیْ اللّٰهُمَّ اِنِّیْ اُحِبُّهُمَا فَاحْبِبْهُمَا وَ اَحِبِّ
 مَنْ یُّحِبُّهُمَا -“ (ترمذی)

(یہ حسن اور حسین میرے بیٹے اور میری بیٹی کے بیٹے ہیں۔ یا اللہ! میں ان
 سے محبت رکھتا ہوں تو تم بھی ان کو اپنا محبوب بنا اور جو ان سے محبت کرے
 اس سے بھی تو محبت کر۔)

اور جن کے فضل و شرف کے لیے باب کعبہ کو تمام کرا آپ نے یہ مثال دی ہو:

”اَلَا اِنَّ مَثَلِ اَهْلِ بَيْتِیْ فَبِکُمْ مَثَلُ مَفِیْنَتِیْ نُوحِیْ مِنْ رُكْبَمَا نَجَاد
 مِنْ تَخَلَّفَ عَنْهَا هَلْدٌ -“ (منا امام احمد من ابی ذرؓ)

دیکھو! میرے اہل بیت کی مثال تم میں کشتی نوح کی طرح ہے جو اس میں سوار
 براہ کھچ گیا، جو اس سے دور رہا ہلاک ہو گیا۔)

اور جن کے احترام کو قائم رکھنے کے لیے یہ وصیت فرمائی ہو:

”وَ لَنْ یَّتَفَرَّقَا حَتّٰی یُرِدَّ اَعْلٰی الْمَوْضِعِ فَاَنْظُرُوْا کَیْفَ تَخْلَعُوْا فِیْهِمَا -“ (ترمذی)
 (دیکھو! کتاب اللہ اور میری اولاد (اہل بیت) دونوں ایک دوسرے سے
 جدا نہیں ہوں گے تا آنکہ حوض کوثر پر میرے پاس پہنچ جائیں۔ پس خیال رکھنا کہ

اس کے صبر و استقامت کو نہ سمجھا اور ان تمام جاہلانہ رسوں کی تقلید کی جن سے خود سید الشہداء اور ان کے بھائی عظیم الصلوٰۃ والسلام نے منع فرمایا تھا۔

پس آئیے کہ دنیا کی مجالس ماتم میں ایک نئے حلقہ ماتم کا اضافہ کریں اور زخم رسیدہ دلوں کو خون آلودہ آنسوؤں کا چشمہ بنانے کی بجائے خود واقعہ شہادت کو اسرار شریعت کا سرچشمہ بنائیں اور حضرت امام کی شہادت کے تذکار میں ایسی مجلس منعقد کریں جو عبرت و بصیرت کا پورا سامان اپنے ساتھ رکھتی ہو۔ جو واقعہ شہادت کی حقیقی عظمت کو پورے طور پر بے نقاب کر دے۔ جو سینہ کو بی اور تہی بین کی بیخ بیکار کی بجائے صبر و برداشت، عزیمت و استقامت، ایثار و قربانی، ثناء و قدائیت اور شہادت و فانی سبیل الحریٰ کا درس دے۔

بزرگوں کا ادب

بزرگوں کا نایت درجہ ادب فرماتے تھے اور ان کا نام نہایت احترام سے لیتے تھے۔ اگر کوئی بزرگوں کی شان میں گستاخی کرتا یا کسی امام کا نام لیتے ہوئے ادب کو ملحوظ نہ رکھتا تو سخت برہم ہوتے اور بعض حالتوں میں طبیعت اس قدر مگدڑ ہوتی کہ اُس آدمی سے گفتگو ہی موقوف فرما دیتے۔ ائمہ کرام اور اولیاء اللہ کے ادب پر ہر سال دو چار خطبے ضرور دیتے تھے۔ اُنکی آواز میرے کانوں میں اب بھی گونج رہی ہے۔ وہ مولانا روم کا یہ شعر پڑھتے:

از خدا خواہیم توفیق ادب بے ادب محروم ماند از فضل رب
(ہم خدا سے ادب کی توفیق چاہتے ہیں۔ بے ادب اللہ کے فضل و کرم سے محروم ہے)
یہ بھی فرماتے کہ حضرت خواجہ محمد پارسی رحمۃ اللہ علیہ نے وصیت کی تھی:

اندر روحی جملہ ادب باید بود تا جاں باقی است در طلب باید بود

۱۔ اسوۂ حیین، ص ۶۱۵۔ مبلورہ جمعیت المدینہ قصور ضلع لاہور

دو ہر دم گہرا رویا بخشی کم باید بود خشک لب باید بود
 اللہ کی راہ میں سراپا ادب رہنا چاہیے جب تک جسم میں جاں باقی ہے تلاش
 جاری رہنی چاہیے۔ اگر سانس میں فیضان کے ہزار دریا بھی تو پی جائے تو
 پھر بھی کم ہے اور ہونٹ خشک رہنے چاہئیں۔

حضرت مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ اپنے شیخ حضرت خواجہ باقی باللہ رحمۃ اللہ علیہ کا جو
 ادب اور احترام کرتے تھے، بڑے ذوق و شوق سے بیان فرماتے۔ اپنے شیخ حضرت خواجہ
 باقی باللہ رحمۃ اللہ علیہ کے صاحب زادوں کے نام حضرت مجدد الف ثانی کے ایک خط کی یہ
 عبارت سناتے:

”ایں فقیر از سر تا قدم عرق احساناے والد بزرگوار نشاست۔ دریں طریق سبق الف
 ب را از ایشان گرفته است و تنجی حروف ایں راہ را از ایشان آموختہ۔“
 (یہ فقیر سر سے پاؤں تک آپ کے والد ماجد کے احسانات میں ڈوبا ہوا
 ہے اور اس راستے میں ابجد ہو رہی انہی سے حاصل کی تھی)

”اگر در مدت عمر سر خود را پانمال اقدام خدمتِ عقبہ علیہ تھا کہ وہ باشند سچ نہ کہ وہ باشند۔
 اگر زندگی بجز آپ کے آستانہ عالیہ کے غلاموں کے پاؤں تلے اپنے سر کو
 پامال کر دوں تو بھی نیاز مندی گاتق ادا نہیں ہوتا)

فرماتے کہ شیخ علاؤ الدین سنائی رحمۃ اللہ علیہ اگرچہ اپنے مشائخ سے ایک اعتبار سے
 آگے نکل گئے تھے مگر فرماتے یہی تھے:

”اگر سر میں باسماں ساید، ہنوز خاکِ آستانہ مشائخ من بلا باشد۔“
 (اگر میرا سر آسمان سے بھی جا لگے، تو میرے مشائخ کے آستانے کی خاک
 بھی مجھ سے برتر ہے)

۱۷۰۰۔ مکتوبات حضرت مجدد الف ثانی، ص ۲۶۶ دفتر اول

فرماتے تھے کہ بزرگوں سے اختلاف بھی کیا جانے تو نہایت ادب اور تواضع سے اختلاف کرنا چاہیے۔ حضرت مجدد علیہ الرحمہ کس قدر ادب اور سلیقے سے اختلاف رائے کا اظہار فرماتے تھے۔ حضرت شیخ محی الدین ابن عربی رحمۃ اللہ علیہ کے بارے میں فرماتے ہیں:

”من مکینہ خوشہ چین فرمنائے دول ایشانم و رذیلے زلہ بروار خوانمانے
 نعم اینما اما چه توان کرد کہ حقوق خداوندی جل سلطانہ فوق حقوق
 ایشانت یلے

(یہ بندہ مکینہ انہی کے روحانی خرمیوں کا خوشہ چین ہے اور انہی کی فوازشوں کے دسترخوان کا آلش کھانے والا ہے.... مگر کیا کیا جائے کہ اللہ تعالیٰ کے حقوق اُن کے حقوق سے بڑھ کر ہیں)

پھر حضرت مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ کا یہ فقرہ بھی اکثر نقل فرماتے تھے:

”بعضی از بزرگاں می گویند کہ این بدعتِ حسنه است و این بدعتِ سیئه است
 اما فقیر با ایشاں موافقت نہ دارو۔“

(بعض بزرگ کہتے ہیں کہ ایک بدعتِ حسنه ہے اور ایک بدعتِ سیئه ہے، لیکن
 فقیران بزرگوں سے اتفاق نہیں کرتا)

لے مکتوبات حضرت مجدد الف ثانی حصہ ششم دفتر دوم عد ۱۰۵

مسائل تصوف

تصوّف کیا ہے ؟
حضرت مجددؑ سے طبعی مناسبت
طریقیت شریعت کا جز ہے
مسائل متفرقہ تصوّف
اشغال صوفیہ کی شرعی حیثیت
لطائف کی حقیقت اور تعداد
لطائف بستہ
الادوی القلب کی تشریح
ذکر سانی افضل ہے یا ذکر قلبی
بیعت طریقت
کشف و کرامات
توجہ اور تصرف

یوں تو شبِ یغزی، تہجد گزاری اور کثرتِ ذکر زندگی بھر آپ کا معمول رہا، مگر آخری عمر میں وہ ہمہ تن اور ہمہ دل اللہ کی طرف متوجہ تھے اور تصوف کی طرف اُن کا میلان بہت بڑھ گیا تھا۔ آخری علالت سے قبل تصوف کے بعض عنوانات پر چند مقالے تحریر فرمائے۔ ان میں سے بعض مقالے عربی میں ہیں اور بعض اُردو میں۔

ان مکالمات کی روشنی میں جو اس موضوع پر ان کے ساتھ وقتاً فوقتاً ہوئے اور ان مقالوں کی روشنی میں مختلف مسائلِ تصوف پر ان کے رجحانات کی وضاحت کی جاتی ہے۔

”مسائل متفرقہ تصوف“ میں لکھتے ہیں:

”تصوف ٹوٹنے پوٹنے کا نام نہیں ہے بلکہ مقامات

تصوف کیا ہے؟

کا نام تصوف ہے اور مقامات یہی ملکات ہیں۔ اخلاص، رضاء، تواضع وغیرہ۔ ان کو حاصل کرو اور ان کے اصداو، ریا و کبر، حسد و بغض، حرص، طول اہل سے باز رہو، بس صوفی ہو گئے۔“ صفحہ ۱۱

”مسائل متفرقہ تصوف“ میں لکھتے ہیں:

”یاد رکھو اصل مقصد تصوف سے یہ ہے۔ اعمالِ شرعیہ یعنی طاعتِ واجبہ و مستحبہ کا بجالانا اور معاصی سے اجتناب کرنا۔ یہ بندہ کی طبیعتِ ثانیہ بن جائے۔ بس یہ وہ چیز ہے جس سے قُرب و رضائے حق حاصل ہوتی ہے۔ کیفیات و کشفیات کا اس سے

کچھ تعلق نہیں۔ اگر ایک شخص ادائے طاعت و اجتناب عن المعاصی میں پختہ ہو، وہ کامل صوفی ہے۔ گو کیفیات کچھ بھی اس پر وارد نہ ہوتی ہوں اور جس پر کیفیات بکثرت وارد ہوتی ہوں، کشف و نصوّف میں ملکہ رکھتا ہو، مگر اوامر و نواہی میں پختگی حاصل نہ ہو، وہ صوفی نہیں۔“

(۲-ص)

حضرت مجدد سے طبعی مناسبت

حضرت مجدد الف ثانی کے ساتھ انہیں طبعی مناسبت بہت تھی۔

اور ان کے مکتوبات کا مطالعہ بڑے التزام سے کرتے تھے۔ مکتوبات کا وہ نسخہ جو ان کے زیر مطالعہ رہا رقم الحروف کے پیش نظر ہے۔ سُرُخ پنسل سے جگہ جگہ عبارتیں نشان زد ہیں بالخصوص وہ عبارتیں جن میں اتباعِ سُنّت پر حضرت مجدد صاحب نے زور دیا ہے۔ حضرت والد علیہ الرحمہ نے ان عبارتوں کو مکتوبات کی دونوں جلدوں کے شروع میں خالی صفحات پر قلمبند بھی کیا ہے۔ ان میں سے اکثر عبارتیں انہیں زبانی یاد تھیں اور خطبوں کے دوران بڑی محبت اور عقیدت کے ساتھ ان عبارتوں کو حرفاً حرفاً نقل کیا کرتے تھے۔ ان میں سے بعض عبارتیں یہاں نقل کی جاتی ہیں۔ ان عبارتوں سے نصوّف کے بارے میں ان کے رجحانات کے تعین میں مدد ملے گی۔

”طریقت و حقیقت کہ صوفیہ ہاں مُتاز گشتہ اندہر دو خادمِ شریعت اند۔

کو تہ اندیشاں احوال و مواجید را از مقاصد مے شمرند و مشاہدات و تجلیات را

از مطالب مے انگارند۔ لاجرم گرفتارانِ زندانِ وہم و خیال می مانند

از کمالاتِ شریعت محروم میگردند۔“

دطریقت و حقیقت کہ صوفیہ را اس سے مُتاز ہیں، دونوں خادمِ شریعت ہیں۔

کو تہ نظر کیفیات اور وجہ کو منزلِ مقصود سمجھتے ہیں اور مشاہدات و تجلیات کو مطالبِ شمار

سے مکتوبات ج ۱۔ ص ۹۸ مکتوب ۳۶

کرتے ہیں۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اپنے ہی توہمات میں گرفتار اور شریعت کے کمالات سے محروم رہ جاتے ہیں)

”بعد از طہی منازل سلوک و قطع مقامات جذبہ معلوم شد کہ مقصود از یہ سیر و سلوک تحصیل مقام اخلاص است ... و این اخلاص جزو است از اجزائے شریعت چہ شریعت را سہ جزو است علم و عمل و اخلاص ... اما ہم ہر کس این جانہ رسد۔ اکثر عالم نجواب و خیال آر مبدہ اند و بجز دو چیز اکتفا نموده اند از کمالات شریعت چہ دانند و بہ حقیقت طریقت و حقیقت چہ در اسند۔ شریعت را پوست خیال می کنند و حقیقت را مغزی دانشدہ نمی دانند کہ حقیقت معاملہ چسبیت بہ ترہات صوفیہ مفور اند و بہ احوال و مقامات مفسرین۔ ہدایہم اللہ سبحانہ سوا الطریق یلے

(سلوک کے منازل اور جذب کے مقامات طے کرنے کے بعد معلوم ہوا کہ سیر و سلوک سے مقصد مقام اخلاص کا حصول ہے ... اور یہ اخلاص شریعت کے اجزاء میں سے ایک جز ہے۔ شریعت کے تین جز ہیں۔ علم، عمل اور اخلاص ... ہاں البتہ شخص کے فہم کی رسائی اس بات تک نہیں، اکثر غراب و خیال کی دنیا میں مگن ہیں اور ذرا سے روحانی فائدے پر انہوں نے قناعت کر لی ہے۔ شریعت کے کمالات ہی کو نہیں جانتے طریقت و حقیقت کی حقیقت کیا سمجھیں گے۔ شریعت کو چھپکا سمجھتے ہیں اور حقیقت کو مغز جانتے ہیں۔ حقیقت حال سے نا آشنا ہیں۔ صوفیاء کی شطیبات نے انہیں خود فریبی میں مبتلا کر رکھا ہے اور احوال و مقامات کے فریبہ میں۔ اللہ تعالیٰ انہیں سیدھی راہ کی ہدایت کے سلسلہ نقشبندیہ کی طرف ان کا طبعی رجحان بہت تھا۔ طریقہ نقشبندیہ کی تعریف میں

مکتوبات کی اس عبارت کو سُرخ پینسل سے نشان لگایا ہے :

”اكا بر طريقيه عليه نقشبنديه قدس الله تعالى اسرارهم التزام متابعت سنت سنبيه
نموده اند و اختيار عمل بعزميت فرموده اگر باين التزام و اختيار ايشان را
باحوال و مواجيد مشرف سازند نعمت عظيم مي دانند و اگر احوال و مواجيد
بايشان بدبند و درين التزام و اختيار فتور سے يا بند آا احوال رانے پندند
و آا مواجيد رانمي خواهند و در اا فتور جز خرابي خود پيچ نمي دانند زيرا که
بر بنهان و جوگيان هند و فلاسفه يونان از قسم تجليات صوري و مکاشفات
مثالي و علوم توحيدى بسيار دارند اما غير از خرابي و رسوائى نتيجه آن ندارند و
جز بعد و حرام تقد و قوت شان نسيست۔“

د اكا بر طريقيه نقشبنديه اتباع سنت کا التزام کرتے ہیں اور رخصت کی بجائے عزميت
پر عمل کرتے ہیں۔ اگر اتباع سنت کا التزام کرتے ہوئے انہیں کیفيات و احوال سے
مشرف فرمائیں تو اسے نعمت عظمیٰ جانتے ہیں اور اگر کیفيات و احوال کے وارد ہونے
سے اتباع سنت میں کوتاہی ہونے لگے، تو ان کیفيات و احوال کو پسند نہیں کرتے
اور ان احوال کے خواہاں نہیں ہوتے اور اتباع سنت میں سستی کو اپنے لیے خرابي
کام باعث جانتے ہیں۔ اس لیے کہ ہندوستان کے برہمن اور جوگی اور يونان کے حکماء
کو بھی تجليات صوري، مکاشفات مثالي اور علوم توحيدى سے حقيہ وافر حاصل ہے، لیکن
خرابي و رسوائى اور بعد و حرام کے سوا انہیں کچھ حاصل نہیں ہوا)

ایک دن مجھ سے فرمایا :

”شرعیت کا وہ حصہ جو تزکیہ باطن سے متعلق ہے۔ اصطلاحاً تصوف کہلاتا ہے۔“

فرماتے تھے :

لہ مکتوبات دفتر اول حصہ چہارم مکتوب ۲۳۷

”حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے بعثت کے بعد جو کام سرانجام دیا، قرآن مجید سے متعدد جگہوں پر یوں بیان کرتا ہے: **يَتْلُو عَلَيْهِمْ آيَاتِهِ وَيُزَكِّيهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ** — یہ جو بار بار خدا کرتا ہے: ”یُزَكِّيهِمْ“ یعنی وہ اُن کا تزکیہ کرتے ہیں۔ اسی تزکیہ کے اصول و آداب کو ہم طریقت یا تصوف سے تعبیر کرتے ہیں۔ افسوس ہے کہ ہماری درسگاہوں میں تعلیم کتاب و حکمت کا تو اتہام کیا جاتا ہے، لیکن تزکیہ نفس جس کا ذکر قرآن مجید تعلیم کتاب و حکمت کے علاوہ الگ مستقل بالذات بار بار کرتا ہے، اس کا قطعی طور پر کوئی اتہام نہیں۔“

یہی نے اُن سے پوچھا: کیا تصوف کی مروجہ اصطلاحات کا استعمال آپ کے نزدیک درست ہے؟ تو حضرت نے فرمایا:

”جیسے محدثین کی اصطلاحات ہیں، فقہاء کی اصطلاحات ہیں، صوفیوں اور نحوویں کی اصطلاحات ہیں، اسی طرح تزکیہ نفس کا علم جب باضابطہ طور پر مرتب اور مدون ہوا تو اصطلاحات ناگزیر تھیں۔“

ایک دن فقہ اور تصوف میں فرق بیان کرتے ہوئے فرمایا:

”بات بڑی سیدھی ہے۔ وضو کن باتوں سے ٹوٹتا ہے؟ نماز کن باتوں سے باطل ہوتی ہے؟ یہ فقہ ہے اور نماز میں حضور کیسے حاصل ہو؟ رقت اور خشیت کیسے حاصل ہو اور سینے سے چکنی کے چلنے کی آواز کیسے آئے؟ یہ تصوف ہے اور دونوں کا ماخذ کتاب و سنت ہے۔“

میں نے ایک روز اُن کی خدمت میں عرض کیا کہ یہ جو صوفیاء کے ہاں

اشغالِ صوفیہ کی شرعی حیثیت

لطائف کی مشق ہے، نفی اثبات کا محض طریقہ ہے یا جس دم کا شغل ہے کیا یہ بدعات ہیں؟ تو حضرت نے فرمایا:

”یہ بزرگانِ کرام کا اجتہاد ہے۔“

میں نے عرض کیا: اس اجتہاد کی علت کیا ہے؟

فرمانے لگے: نزولِ انوارِ دافعِ وساوس ہوتا ہے، پھر انوارِ رسالت بالخصوص انوارِ رسالتِ محمدیہ بدرجہ اتم دافعِ وساوس تھے۔ جب انوارِ رسالت منقطع ہو گئے، تو وساوس ابھرنے لگیں اور عبادت میں جمعیتِ خاطر اور یکسوئی باقی نہ رہی۔ قرآن کے اس حکم پر عمل مشکل ہوا کہ اٹھتے بیٹھتے پہلو بدلتے ہوئے اللہ کا ذکر کرو۔ حدیث میں ہے کہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام ہر وقت اللہ کا ذکر کرتے تھے۔ انوارِ رسالت کے منقطع ہوجانے کی وجہ سے دوامِ ذکر ممکن العمل نہ رہا۔ پس دوامِ ذکر حاصل کرنے کے لیے اور عبادت میں جمعیتِ خاطر اور یکسوئی پیدا کرنے کے لیے بزرگانِ کرام نے اجتہاد کیا۔ فرمایا: اگر معاملات میں اجتہاد ہو سکتا ہے تو عبادت میں جمعیتِ خاطر پیدا کرنے کے لیے اجتہاد کیوں نہیں ہو سکتا۔ پھر ایک اور شام بندہ عاجزان کی خدمت میں حاضر ہوا اور انہیں بتایا کہ بعض علماء سے اشغالِ صوفیہ پر مجھے گفتگو کا اتفاق ہوا ہے اور وہ انہیں بدعات اور محدثات قرار دیتے ہیں۔

حضرت والد علیہ الرحمہ کی پیشانی پر نشکن پڑ گئی اور فرمانے لگے:

”ان علماء کا ذہن صاف ہونا چاہیے۔ جب وہ ان اشغال کو بدعات قرار دیتے ہیں تو دوسرے نغظوں میں وہ معاذ اللہ ——— خالم بدہن یہ کہتے ہیں کہ حضرت شاہ ولی اللہ بدعتی تھے، حضرت مجدد الف ثانی بدعتی تھے، حضرت شاہ عبدالعزیز، حضرت مرزا مظہر جان جانا اور حضرت قاضی شاہ اللہ پانی پتی سب بدعتی تھے۔ ایک طرف تو یہی علماء ہندوستان میں اپنی تاریخ کا آغاز ان ہی بزرگوں سے کرتے ہیں اور ان کے ساتھ نسبت ملاتے ہیں، دوسری طرف ان بزرگوں کے اجتہادات کو بدعت قرار دیتے ہیں۔ اس منطقی تضاد سے انہیں نجات پانی چاہیے۔“

معارف اللطائف میں یوں رقمطراز ہیں :

” صرفیائے کرام کے اشغال کو بعض حضرات اس لیے پسند نہیں کرتے کہ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین سے یہ منقول نہیں، لیکن اگر ذرا دقت نظر سے یہ حضرات دیکھتے تو ان پر یہ واضح ہو جاتا کہ صحابہ کرام کو ان اشغال و مراقبات کی ضرورت ہی نہ تھی کیونکہ ان کو سید الانبیاء والمرسلین کی صحبت کے فیوض سے بہرہ ور اور آپ کے انفاسِ طیبہ کی برکات سے مستفیض ہونے کی سعادت حاصل تھی اور اس فیضان کی وجہ سے صحابہ کرام کے قلوب و اذہان ایسی قوی اور کامل استعداد کے مالک تھے کہ ان کو ان اشغال و مراقبات کو واسطہ مقصود بنانے کی ضرورت نہ تھی۔ فرائض و سنن کی بجا آوری، محرمات و منہیات سے اجتناب ہی ان اشغال وغیرہ کے ثمرات کے حصول کیلئے کافی تھے اس کی مثال یوں سمجھیے کہ علوم مروجہ صرف و نحو اور مرتب فقہ و اصول فقہ، صحابہ کرام کے عہد مبارک میں مدون نہیں ہوئے تھے کیونکہ عرب ہونے کی وجہ سے وہ قواعد صرف و نحو کے محتاج نہ تھے اور عام مسائل دریافت کرنے میں آپ کی ذات بابرکات ہی کافی تھی لیکن بعد میں جب اسلام جزیرۃ العرب سے نکل کر عجم میں پہنچا اور خاص آپ کی ذات اقدس سے بعد ہونا چلا گیا، ہر قسم کی ظاہری اور باطنی ضروریات اور حل مشکلات کے لیے تدوینِ علوم کی ضرورتوں کا احساس ہوتا گیا۔ علماء کرام اور ائمہ ہدیٰ نے بہت جلد باحسن و وجہ ان ضرورتوں کو پورا کیا۔ محدثین جمع و تدوین حدیث اور فقہ الحدیث کے مرتب کرنے، فقہاء قانون اسلام کے مدون کرنے اور اصول احکام کے مرتب کرنے کی طرف متوجہ ہو گئے اور بعض اہل علم نے امانتِ باطنی کی حفاظت اور اس کی اصلاح کی طرف اپنی توجہات کو منعطف کیا، جن کی برکت سے اصلاحِ نفس، تزکیہ نفس اور مجاہدہ نفس کے قواعد مرتب ہوئے اور دُنیا ان کے فیوض و برکات کو معانی سے مستفیض ہوئی۔ جزاہم اللہ عنا وعن سائر المسلمین احسن الجزاء۔ ۱۹۱۵ء

اس مقالے کے آخری لفظ سُنئے اگر گوشِ نصیحت نیوش ہے۔
 ”بہر حال ہم لوگ بعدِ زمانہ نبوت کی وجہ سے ضعیف الاستعداد اور دُنیا کے ظاہری
 حسن و جمال سے بہت متاثر اور ضعیف الایمان ہیں۔ اس لیے ہم جیسے لوگوں کو نزدیک
 نفس اور وصول الی اللہ (جو تعلیم کی پیدائش کی حکمتِ اصلیہ ہے) کے لیے ان سائل و
 تدابیر کی شدید ترین حاجت ہے اور تجربہ اس کا شاہد ہے۔“ (صفحہ ۱۹)

”معارف اللطائف“ میں لکھتے ہیں:

لطائف کی حقیقت اور تعداد

”حکماء اور صوفیہ دونوں اس امر پر

متفق ہیں کہ انسان مرکب تو ضرور ہے۔ لیکن اس کے تمام اجزاء، مادی نہیں بلکہ بعض اجزاء
 مادی ہیں اور بعض غیر مادی۔ اس کے بعد ان میں یہ اختلاف نظر آتا ہے کہ حکماء صرف نفس
 ناطقہ کے غیر مادی ہونے کے تامل ہیں۔ صوفیاء کے نزدیک اجزاء غیر مادی متعدد ہیں اور
 صرف نفس ناطقہ ہی نہیں بلکہ پانچ جزو غیر مادی ہیں۔ صوفیاء کے نزدیک انسان دس اجزاء
 سے مرکب ہے۔ پانچ مادی اور پانچ غیر مادی ہیں۔ مادی اجزاء انسانی یہ ہیں:

عناصر اربعہ: ”آب، خاک، ہوا اور آگ“ اور نفس کے غیر مادی اجزاء یہ ہیں:
 قلب، روح، سر، زخی اور زخی، انہی اجزاء خمسہ مجرّدہ یعنی غیر مادیہ کا نام لطائف
 خمسہ ہے۔

بعض صوفیاء اپنی اصطلاح میں ان میں نفس کو بھی شامل
 کر لیتے ہیں اور مجرّمہ کو لطائف ستہ سے تعبیر کرتے

لطائف ستہ

ہیں۔ آج کل یہی نام مشہور ہیں۔ حضرت مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ کے کلام میں اکثر
 لطائف خمسہ کا عنوان نظر آتا ہے۔ صحیح یہی ہے کہ لطائف خمسہ ہی ہیں جن بزرگوں
 نے نفس کو بھی ان لطائف کے ساتھ شمار کیا ہے انہوں نے تغلیباً ذکر کیا ہے جیسا کہ
 قرین اور عمر بن وغیرہ (شمس و قمر اور ابوبکر و عمر کے لیے) میں تغلیباً کہا جاتا ہے۔ چونکہ

صوفیا لطائفِ غمہ کے ساتھ نفس کے آثار و احوال سے بھی بحث کرتے ہیں، اس لیے بعض بزرگوں نے مقاصدِ تصوف کے لحاظ سے نفس کو تغیباً لطائف میں شمار کر کے لطائفِ سنہ قرار دیئے ہیں۔ صفحہ ۲۰۱

مشائخِ نقشبند کے ہاں لطائفِ خمسہ میں سے ہر لطیفہ کو علیحدہ علیحدہ ذکر بنانے کی مشق کرائی جاتی ہے۔ حضرت حاجی امداد اللہ صاحب مہاجر کئی رحمۃ اللہ علیہ اور مولانا اشرف علی تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کی رائے یہ ہے کہ صرف قلب سے ذکر کی مشق کی جائے اور محض لطیفہ قلب کے مسلسل اور پیہم ذکر سے وہ تمام ثمرات اور نتائج حاصل ہو جاتے ہیں جو لطائف کی مشق سے حاصل کیے جاتے ہیں۔ یہ حضرات لطائف کی طرف تفصیلی توجہ کو حجاب سمجھتے ہیں۔ مشائخ کا اختلاف تفصیل کے ساتھ بیان کرنے کے بعد حضرت والد علیہ الرحمۃ حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر کئی کے طریقے کو ترجیح دیتے ہیں حضرت لکھتے ہیں۔

”احادیث میں ایسے امور کے سلسلہ میں صرف قلب ہی کا ذکر آتا ہے اور چونکہ لطائف کا شغل رکھنے والے حضرات کے نزدیک لطائفِ خمسہ میں باہم اتصال ہے، اس لیے صرف ذکر قلب سے ہی بقیہ لطائف میں آثار و افعال مذکورہ سرایت کر جاتے ہیں کیونکہ یہ مریا متناکسہ کی طرح ہیں۔“ صفحہ ۵

اس کے بعد ”معارف اللطائف“ میں یہ بحث کی گئی ہے کہ لطیفہ قلب اور قلبِ صنوبری (مضغہ لحم) کا آپس میں کیا تعلق ہے اور اس مشہور حدیث شریف کی تشریح کی گئی ہے کہ جسم میں ایک بوتھرا ہے جب سنور جاتا ہے تو سارا جسم سنور جاتا ہے اور جب وہ بگڑ جاتا ہے تو پورا جسم بگڑ جاتا ہے اور دیکھو وہ دل ہے۔

فرماتے ہیں:

”اس سلسلہ میں یہ بات یاد رکھنے کے قابل ہے کہ حضراتِ صوفیا کے نزدیک

قلب صنوبری (مضغہ لحم) اور شے ہے اور وہ قلب جو لطیفہ ہے، دوسری چیز ہے۔ قلب صنوبری جلد ظاہری کا جزو ہے اور وہ قلب جو لطیفہ ہے اس کا تعلق قلب صنوبری سے اناضہ آثار و ازار کا ہے۔ جیسے حکما بیان کرتے ہیں کہ نفس ناطقہ مجرد ہے اور جزو بدن نہیں مگر اس کا تعلق بدن سے تصرف و تدبیر کا ہے۔ ایسے میں بقیہ لطائف اربعہ کا بھی خاص خاص مقامات جسم سے ایسا ہی تعلق ہے۔ اسی تعلق کی وجہ سے جب ذکر لطائف سے ذکر کرنا چاہتا ہے تو ان لطائف کے خاص خاص مقامات کی جانب جن کو ان لطائف سے تعلق ہے توجہ کرتا ہے۔ اسی لیے جب لطیفہ قلب کو ذکر بنایا جاتا ہے تو قلب صنوبری کی جانب توجہ کی جاتی ہے۔ علیٰ ہذا القیاس دوسرے لطائف بھی۔ صفحہ ۵)

”حدیث شریف میں ہے: ”ان فی الجسد

لمضغۃ اذا صلحت صلح الجسد کلہ

الاوہی القلب کی تشریح

واذا فسدت فسد الجسد کلہ الاوہی القلب؛ اس کی بنا پر یہ شبہ وارد ہو سکتا ہے کہ جس قلب کی اصلاح سے سارے جسم کی اصلاح ہو جاتی ہے اسے مضغہ فرمایا تو یہ تو قلب صنوبری ہوا، نہ کہ لطیفہ قلب۔ اس کے متعلق حضرات مشائخ نے یہ فرمایا ہے کہ اس میں شک نہیں کہ حدیث میں ”قلب“ سے مراد گو لطیفہ قلب نہیں بلکہ مضغہ ہی مذکور ہے مگر یہ حکم ”اذا صلحت صلح الجسد کلہ“ دراصل اسی لطیفہ قلب کا ہے۔ جس کو مضغہ یا قلب صنوبری سے غایت انصال اور تعلق کی وجہ سے ذکر فرمایا جیسے حالت اور اکیہ کو صورت طلیہ سے تعبیر کرتے ہیں۔“ صفحہ ۶

حضرت نے ”معارف اللطائف“ میں اس بات کی بھی وضاحت کی ہے کہ لطائف کی مشق کسی کی ولایت کی دلیل نہیں اور اصل مقصود دوام ذکر کا حصول اور ملکۃ بآداب کا سامنہ ہے۔ اسی مقالے میں یوں رقمطراز ہیں:

”یہ بات اچھی طرح سمجھ لینی چاہیے کہ لطائف کے آثار کا ظہور و تحقق ولایت

کی دلیل نہیں اور نہ ان آثار و کوائف کے وجود سے مقبولیت پر استدلال کیا جاسکتا ہے۔ صفحہ ۱۳۰... "الفرض ذکر لطائف و سلطان الذاکر وغیرہ سے مقصود اصلی یہ ہے کہ ذاکر کے دل و دماغ میں ایک مستحکم و راسخ ملکہ یا دوادانت پیدا ہو جائے جس کی وجہ سے اکثر اوقات مقصود سے ذہول و غفلت نہ ہو بلکہ ذکر میں مشغول رہے، اسی کثرت کو صوفیہ کے کلام میں دوام ذکر سے تعبیر کیا جاتا ہے، جسے ہم عدم ذہول سے بھی تعبیر کر لیتے ہیں کیونکہ ہر شے کا دوام اس کی مناسبت سے ہوا کرتا ہے۔ مثلاً زید کتا ہے کہ نہیں ہمیشہ پانچوں نمازیں پڑھتا ہوں، تو اس فقرہ میں ہمیشہ سے مراد وفانہ ہوگی اور عمر کتا ہے کہ میں ہمیشہ جمعہ کی نماز ادا کرتا ہوں، تو یہاں ہمیشہ سے مراد ہر ہفتہ ہوگا اور بکر کتا ہے کہ میں ہمیشہ عید الفطر کی نماز پڑھتا ہوں، تو یہاں ہمیشہ سے مراد سالانہ ہوگی۔ اسی قاعدہ کے مطابق ذکر کے دوام سے مراد ذکر کے مناسب ہی ہوگا اور وہ ہے اکثر اوقات میں عدم ذہول۔ کیونکہ اوقات کے ایک ایک لمحہ کا مصروف ذکر ہونا عادت محال اور ناممکن ہے۔ ہند وغیرہ امور جو انسانی زندگی کے لیے عادتاً لازمی اور لابدی ہیں، ان میں ذہول لازمی ہے، اسی لیے بعض حضرات صوفیہ نے لفظ دوام کا استعمال ترک کر دیا ہے اور فرمایا ہے کہ طریقت میں مقصود کثرت ذکر اور دوام طاعت ہے جیسا کہ حافظ شیرازی نے کہا ہے :

در بزم عیش یک دو قدح نوش کن برو

یعنی طمع مدار وصال دوام را " (صفحہ ۱۵)

اس بارے میں ان کی رائے وہی تھی
جس کا اظہار حافظ ابن قیم رحمۃ اللہ علیہ

ذکرِ سانی افضل ہے یا ذکرِ قلبی

نے ”الوابل الصیب“ میں کیا ہے۔ اپنے مقالے ”ذکر اللہ عزوجل“ میں حافظ ابن قیم رحمۃ اللہ علیہ کے حوالے سے لکھتے ہیں:

”الذکر تارة تكون بالقلب واللسان، وذلك افضل الذكر، وبالقلب وحده تارة وهي الدرجة الثالثة، افضل الذكر ما تواطأ عليه القلب واللسان، وانما كان ذكر القلب وحده افضل من ذكر اللسان وحده لان ذكر القلب يثمر المعرفة ويمسح المحبة ويثير الحياء، ويبعث على المخافة ويدعو الى المراقبة ويروع عن التقصير في الطاعات والنهون في المعاصي والسيئات۔ وذكر اللسان وحده لا يوجب شيئاً من هذه الآثار، وان اثمر شيئاً منها فثمره ضعيفة۔“ (صفحہ ۳)

ذکر کبھی بیک وقت دل اور زبان سے ہوتا ہے اور یہ ذکر کی سب سے افضل صورت ہے اور کبھی صرف دل سے ہوتا ہے اور فضیلت کے لحاظ سے یہ دوسرے درجے کا ذکر ہے اور کبھی صرف زبان سے ہوتا ہے اور یہ ذکر کا تیسرا درجہ ہے۔ سب سے افضل ذکر وہ ہے جس میں دل اور زبان میں ہم آہنگی ہو اور صرف قلبی ذکر، صرف ذکر لسانی سے افضل ہے اس لیے کہ ذکر قلبی سے معرفت پیدا ہوتی ہے، محبت اور حیا ابھرتی ہے ذکر قلبی خشیت کا باعث ہے اور مراقبہ کی استعداد پیدا کرتا ہے اور طاعات میں کوتاہی سے روکتا ہے اور نافرمانیوں اور بد عملیوں کو خیر سمجھنے سے باز رکھتا ہے اور ذکر لسانی تنہا ایسے کوئی نتائج پیدا نہیں کرتا اور اگر کوئی اثر پیدا کرے بھی تو بہت ہلکا ہوتا ہے۔

بیعت طریقت کے بارے میں حضرت والد علیہ الرحمہ کی رائے وہی تھی جس کا اظہار حضرت شاہ ولی اللہ

بیعت طریقت

نے ”القول الجلیل“ میں کیا۔ بیعت طریقت کو مسنون اور موجب برکات سمجھتے تھے۔ فرماتے تھے کہ یہ کنا درست نہیں کہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے عہد میں صرف بیعت اسلام اور بیعت جہاد ہی تھی۔ مسلم شریف، ابوداؤد اور نسائی کی اس حدیث سے استدلال فرماتے تھے:

عن عوف بن مالک الأشجعی قال کنا عند النبی صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم ثمانية اوسبعة فقال الاتباعون رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فسبنا ایدینا وقلنا علی ما نابعثنا یارسول اللہ قال علی ان تعبدوا اللہ ولا تشركوا بہ شیئاً وتصلوا الصلوات الحنس وتسمعوا و تطیعوا واسرکلمة خفیة قال ولا تسئلوا الناس شیئاً فلقد رأیت بعض اولئک الفر یسقط سوط احدہم فما یسأل احداً بناولہ ایاہ“

(حضرت عوف بن مالک اشجعی کہتے ہیں کہ ہم لوگ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی مجلس میں حاضر تھے ہم سات آدمی تھے یا آٹھ تو ہوں گے حضور نے فرمایا کہ تم اللہ کے رسول سے بیعت نہیں کرتے؟ ہم نے اپنے ہاتھ پھیلا دیے اور عرض کیا یا رسول اللہ! کس امر پر آپ کی بیعت کریں؟ آپ نے فرمایا کہ ان باتوں پر بیعت کرو کہ تم اللہ کی عبادت کرو گے اور کسی کو اس کے ساتھ شریک نہ ٹھہراؤ گے اور پانچ وقت نماز پڑھو گے اور احکام تو جو سے سنو گے اور اطاعت کرو گے اور ایک بات آہستہ کی اور وہ یہ تھی کہ لوگوں سے کوئی چیز مت مانگو۔ عوف بن مالک کہتے ہیں کہ میں نے ان میں سے جن افراد کو دیکھا کہ ان پر کسی کا کرڑا کر جانا تو وہ بھی کسی سے نہ مانگا کہ اُسے اٹھا کر دے دے) فرماتے تھے: یہ بات بالکل واضح ہے کہ اس حدیث میں حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے مخاطب صحابہ کرام ہیں، اس لیے یہ بیعت اسلام نہ تھی اور بیعت کے مضمون سے ظاہر

ہے کہ جمعیتِ جہاد بھی نہ تھی بلکہ اعمالِ صالحہ کے التزام و اہتمام پر جمعیت لی گئی اور صوفیائے کرام کے ہاں جو جمعیت معمول ہے، اس کی حقیقت بھی اعمالِ صالحہ کے التزام و اہتمام کا معاہدہ ہے۔

کشف و کرامات

وہ اس بات کے قائل تھے کہ اولیاء اللہ کو کشف ہوتا ہے اور خرقِ عادت بات کا ظہور بھی ان سے ہو سکتا

ہے لیکن کشف و کرامت کو ولایت کی کسوٹی پر نہیں مانتے تھے۔ فرماتے تھے کہ کشف، کافر، ملحد اور دہریے کو بھی ہو سکتا ہے۔ مجاہد سے اور ریاضت سے انسان میں بعض باطنی قوتیں پیدا ہو جاتی ہیں جن کی وجہ سے ریاضت کرنے والے کو کشف ہونے لگتا ہے اور شریعت میں کشفی علوم کو محبت نہ مانتے تھے۔ اسی طرح خرقِ عادت کا ظہور فرماتے تھے کہ جو گیوں سے بھی ہوتا ہے اور یہ ریاضت کا اثر ہے کسی کی ولایت کی دلیل نہیں۔ بعض صحابہؓ سے عمر بھر کسی بھی خرقِ عادت بات کا ظہور نہیں ہوا، اس کے باوجود وہ تمام اُمت سے افضل ہیں۔

توجہ اور تصرف کے بارے میں بھی ان کی رائے یہ تھی کہ اسے کمال اور قُربِ الہی میں کوئی دخل

توجہ اور تصرف

نہیں اور نہ ولایت و مقبولیت کی علامت ہے کیونکہ توجہ میں یکسوئی کی مشق سے ایک فاسق و فاجر آدمی بھی اپنی ہمت باطنی کو مضبوط اور قوی بنا سکتا ہے۔ مسموم اور عملِ تنویم کا دار و مدار بھی ہمتِ باطنی کی مشق پر ہے۔ مشائخ میں بھی یہ قوت کثرتِ مجاہدہ سے پیدا ہوتی ہے۔ اس قوت کا استعمال اگر کسی نیک مقصد کے لیے ہو، تو اس تصرف کو بھی محمود سمجھا جائے گا اور اگر مقصود مذموم ہے تو یہ تصرف بھی مذموم ہوگا۔

فقہی موقف

تقلیدِ ائمہ
مضمون "استدراک" سے چند اقتباسات

تقلیدِ ائمہ

فرماتے تھے :

” اگر کوئی یہ سمجھتا ہے کہ ہم تقلید سے مطلقاً انکار کرتے ہیں اور عوام کو یہ تعلیم دیتے ہیں کہ وہ تفسیر، حدیث اور فقہ سے بے بہرہ ہونے کے باوجود، ائمہ کرام کے اقوال کو ٹھکرا دیا کریں اور بے زمام اور بے مہار ہو کر جو چاہیں کریں، تو وہ صریحاً غلط فہمی میں مبتلا ہے۔“

ان کے فقہی موقف پر ان سے بار بار گفتگو ہوئی۔ وہ فقہائے کرام بالخصوص ائمہ اربعہ کی مساعی جمیدہ کو ضبطِ استحسان دیکھتے تھے۔ ایک مضمون میں اپنے فقہی موقف کی وضاحت کرتے ہوئے لکھتے ہیں :

” ائمہ دین نے جو دین کی خدمت کی ہے، اُمت قیامت تک ان کے احسان سے عمدہ برائیں ہو سکتی۔ ہمارے نزدیک ائمہ دین کے لیے جو شخص دل میں سُورِ ظن رکھتا ہے یا زبان سے ان کی شان میں بے ادبی اور گستاخی کے الفاظ استعمال کرتا ہے، یہ اس کی شہادتِ قلبی کی علامت ہے اور میرے نزدیک اس کے سو، خاتمہ کا خوف ہے۔ ہمارے نزدیک ائمہ دین کی ہدایت و درایت پر اُمت کا اجماع ہے۔“

” اس عاجز نے اپنے والدِ بزرگوار مولانا عبدالجبار غزنوی رحمہ اللہ رحمۃ واسعہ کے

درس میں امام ابن تیمیہؒ کی یہ عبارت اس کثرت سے سنی ہے کہ طالب علمی کے زمانہ سے مجھے یاد ہے فرمایا کرتے تھے :

قَوْلُنَا فِي مَسْئَلَةِ الصِّفَاتِ مَا قَالَ اللَّهُ وَقَالَ رَسُولُهُ وَالسَّابِقُونَ
الْأُولَوْنَ مِنَ الْمُهَاجِرِينَ وَالْأَنْصَارِ الَّذِينَ اتَّبَعُوهُمْ بِإِحْسَانٍ رَضِيَ اللَّهُ
عَنْهُمْ وَرَضُوا عَنْهُ وَأُمَّةٌ يَهْدِي الذِّينَ اجْتَمَعَ الْمُسْلِمُونَ عَلَى هُدَىٰ إِيْتَانِهِمْ
وَدِرَائَتِهِمْ - هَذَا هُوَ قَوْلُنَا فِي هَذَا الْبَابِ وَفِي غَيْرِهِ -

یعنی صفات کے مسئلہ میں ہمارا فتویٰ وہی ہے جو اللہ عزوجل نے اور رسول اکرم
صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اور جو عقیدہ صحابہ کرام، مہاجرین و انصار کا اور ان کے تابعین
کا تھا رضی اللہ عنہم ورضوا عنہ اور جو فتویٰ ائمہ دین کا ہے جن کی ہدایت و درایت
پر اُمت کا اجماع ہے اور یہی ہمارے فتویٰ کا انداز ہے مسئلہ صفات کے بارے میں
اور دوسرے مسائل کے بارے میں۔

حضرت والد بزرگوارؒ جس وقت اجمع المسلمون علیٰ ہدایٰ تہم ودرایتہم
پر پہنچتے تو اس فقرہ کو کئی بار ارشاد فرماتے۔ اس وقت آپ کی آواز بلند ہو جاتی اور
آپ کا چہرہ مبارک جلال ایمان سے سُرخ ہو جاتا اور ہمیشہ اپنے درس میں امام احمدؒ
کی یہ نصیحت ہمیں ارشاد فرماتے

“أَيُّكُمْ أَنْ تَسْأَلَكُمْ فِي مَسْئَلَةٍ لَيْسَ لَكُمْ فِيهَا إِمَامٌ”

یہ ہے موقوف اور مسک حضرت والد علیہ الرحمہ کا جو انہیں ان کے اساتذہ اور اسلاف
کرام سے ملاتھا۔

لے دیجیو کسی ایسے مسئلے پر گفتگو نہ کرنا جس میں کسی امام کا فتویٰ تمہیں حاصل نہ ہو۔ دیکھیے
ان کا مضمون اسدراک الاعتصام شماره ۱۵ اگست ۱۹۵۸ء

وہ تقلید کو بعض حالتوں میں واجب قرار دیتے تھے اور بعض حالتوں میں اسے جائز سمجھتے تھے۔

۱۔ ائمہ اہل سنت میں سے کسی ایک امام کی تقلید کو جو بغیر کسی تعین کے ہو واجب قرار دیتے تھے۔

۲۔ اور ایک امام معین کی تقلید بشرطیکہ اس تعین کو امر شرعی نہ سمجھا جائے مباح قرار دیتے تھے۔

۳۔ اور کسی ایک امام معین کی تقلید کو امر شرعی سمجھا اور اس کی تقلید ترک کرنے کو شریعت سے خارج ہونے کے مترادف سمجھنا ناجائز قرار دیتے تھے۔

اس بات پر حضرت بہت زور دیتے تھے کہ جب تفسیر، حدیث اور فقہ پر دسترس رکھنے والے کسی عالم کو حدیث صحیح غیر منسوخ اپنے امام کے مذہب کے خلاف مل جائے تو اسے اپنے امام کا قول اس حدیث رسول اللہ علیہ وسلم کے لیے ترک کر دینا چاہیے۔ فرماتے تھے: "کوئی فقیہ صحیح معنوں میں حنفی، شافعی، مالکی یا حنبلی نہیں ہو سکتا، جب تک کہ وہ حدیث صحیح غیر منسوخ کو امام کے قول پر ترجیح نہ دے۔ امام ابوحنیفہؒ سے پوچھا گیا کہ اگر آپ کوئی ایسا مسئلہ بیان کریں کہ قرآن مجید میں اس کے خلاف آیت مل جائے تو کیا کریں۔ فرمایا:

اُتْرِكُوا قَوْلِي بِكِتَابِ اللَّهِ (میری بات کتاب اللہ کی خاطر چھوڑ دو) پھر پوچھا گیا کہ آپ کے قول کے خلاف اگر حدیث مل جائے تو فرمایا:

اُتْرِكُوا قَوْلِي بِخَبَرِ رَسُولِ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ (حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی حدیث کے لیے بھی میرا قول چھوڑ دو) پھر پوچھا کہ اگر صحابہ کا

۱۔ دیکھیے ان کا مضمون 'استدراک' الاعتماد۔ شمارہ ۱۵ اگست ۱۹۵۸ء

قول آپ کے فقہی کے خلاف مل جائے تو کیا کریں۔ جواب دیا کہ آثار صحابہؓ کے مقابلے میں بھی میرا قول چھوڑ دو۔“

فرماتے تھے کہ امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے بیار شادات ’روضۃ العلماء‘ میں صاحبِ ہدایہ سے منقول ہیں۔

یہ مسئلہ بیان کرتے ہوئے ائمہ کرام کے اقوال کے انبار لگا دیتے تھے۔ امام ہانک رحمۃ اللہ علیہ کا یہ قول بھی شیخ عبدالوہاب شترانیؒ کی کتاب ’البراقیت والجموہر‘ کے حوالے سے نقل کرتے۔ ”ہر شخص کے کلام میں سے اخذ بھی کیا جاسکتا ہے اور اسے رد بھی کیا جاسکتا ہے۔ صرف حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام ہی کا ارشاد ہے جسے ہر حالت میں قبول کرنا چاہیے اور جسے رد نہیں کیا جاسکتا۔“

اسی طرح فرماتے تھے کہ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کا بھی ارشاد ہے :

اذ بَلَّغْتُمْ خَبْرًا صَحِيحًا يُخَالِفُ مَذْهَبِي وَاعْلَمُوا أَنَّهُ مَذْهَبِي

(جب تمہیں میرے مذہب کے خلاف حدیث صحیح مل جائے تو اسی کی پیروی کرو سمجھ لو کہ وہی میرا مذہب ہے)

اور فرماتے اسی طرح امام احمد بن حنبلؒ تکید کرتے تھے کہ حدیث کے مقابل کسی اور کا قول پیش نہ کرنا چاہیے۔ جیسا کہ امام شترانیؒ نے ’البراقیت والجموہر‘ میں لکھا ہے۔ پس صحیح معنوں میں حنفی، مالکی، شافعی یا حنبلی بننے کے لیے بھی ضروری ہے کہ حدیث صحیح پر عمل کیا جائے، ورنہ اپنے امام کی بھی مخالفت کرے گا اور اس کی اطاعت سے بھی باہر ہوگا۔ فرماتے تھے :

میرا فقہی موقف وہی ہے جو حضرت شاہ ولی اللہؒ کا موقف تھا اور انہوں نے ’عقد الجدید انصاف‘ حجۃ اللہ البالغہ اور تفہیمات میں شرح و بسط کے ساتھ بیان کیا ہے۔ اور یہی مذہب تھا قاضی شمس الدین پانی پتیؒ کا اور یہی مذہب تھا میاں نذیر حسینؒ کے

لے دیکھیے تفسیر مظہری۔ لے ملاحظہ فرمائیے انہی کتاب ’معیار الحق‘

کا اور یہی مذہب تھا مولانا حبیب اللہ قندھاریؒ لکھا۔
 اہلحدیث اور احناف کے درمیان فاصلوں کو کم کرنے کی کوشش کرتے رہے اور
 فرقدارانہ عصبیت کی آگ بجھانے کی مسلسل ننگ و دو کرتے رہے۔ اہل حدیث کو حضرت
 امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے ادب و احترام کی تلقین کرتے رہے اور احناف کو حضرت
 امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ اور حضرت امام ابن تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ کی تکریم و تعظیم ملحوظ رکھنے کی
 نصیحت کرتے رہے۔ اس سلسلے میں ان کے ارشادات ملاحظہ فرمائیے۔

حضرت مولانا سید محمد داؤد غزنوی رحمۃ اللہ علیہ نور اللہ مقدرہ کے مضمون "استدراک" سے چند اقتباسات

الاعتصام ۱۵ اگست ۱۹۵۸ء

"بعض دیوبندی احباب کہا کرتے ہیں کہ غزنوی خاندان کے علماء کا مسک اس بابے
 میں قابلِ ستائش ہے لیکن دوسرے علماء اہل حدیث کا یہ مسک نہیں، اس لیے بعض مشدّد
 علماء اہل حدیث کے اقتباسات ذکر کرتا ہوں شاید کہ دلوں سے کدورت دور ہو اور سولہا
 کی جو عام بیماری ہے وہ دور ہو سکے۔"

مولانا محمد ابراہیم میاں کوٹلیؒ ہماری جماعت کے مشہور مقتدر علماء میں سے تھے۔ انہوں
 نے اپنی کتاب "تاریخ اہل حدیث" میں امام ابوحنیفہؒ کی مدح و توصیف اور ان کے
 خلاف ارجاء وغیرہ الزامات کے دفعیہ میں ۲۳ × ۲۹ سائز کے ۸ صفحات
 وقف کیے۔ اور مقتدر مشاہیر علماء سلف مثلاً امام ابن تیمیہؒ، امام ذہبیؒ، حافظ

ابن حجرؒ اور علامہ شہرستانیؒ کے اقوال نقل کر کے یہ بتلایا ہے۔ الناس فی ابی حنیفۃ حاسدٌ او جاہلٌ۔ یعنی حضرت امام ابو حنیفہؒ کے حق میں بُری رائے رکھنے والے کچھ لوگ تو حاسد ہیں اور کچھ ان کے مقام سے بے خبر ہیں۔

پھر کسی جگہ ان کا ذکر امام اعظمؒ کے نام سے کرتے ہیں۔ کسی جگہ سیدنا امام ابو حنیفہؒ کہہ کر ادب و احترام سے ذکر کرتے ہیں اور حضرت الامام الاعظمؒ کے خلاف جو سب سے زیادہ سنگین حملہ امام سفیانؒ کے حوالے سے بروایت نعیم بن حماد کیا جاتا ہے اس پر معقول اور مدلل جرح کر کے ثابت کیا ہے کہ نعیم بن حماد سنت کی تعویت میں اور امام ابو حنیفہؒ کی گہرائی میں مجبوری حدیثیں اور من گھڑت حکایات وضع کر لیا کرتا تھا۔ اور اس ساری سبوت کو آخر میں مولانا محمد ابراہیمؒ اس فقرہ کے ساتھ ختم کرتے ہیں۔

(خلاصۃ الکلام یہ کہ نعیم کی شخصیت ایسی نہیں ہے کہ اس کی روایت کی بنا پر حضرت امام ابو حنیفہؒ جیسے بزرگ امام کے حق میں بدگونی کریں۔ جن کو حافظ ذہبیؒ جیسے ناقد الرجال امام اعظمؒ کے معزز لقب سے یاد کرتے ہیں اور حافظ ابن کثیرؒ البدایہ والنہایہ میں آپ کی نہایت تعریف کرتے ہیں اور آپ کے حق میں فرماتے ہیں۔ احد ائمة الاسلام وسادة الاسلام واحد اركان العلماء و احد الائمة الاربعة اصحاب المذاهب المتبوعه)

نیز حافظ ابن کثیرؒ عبداللہ بن داؤد حرّبی سے نقل کرتے ہیں کہ انہوں نے کہا لوگوں کو مناسب ہے کہ اپنی نماز میں امام ابو حنیفہؒ کے لیے دُعا کیا کریں کیونکہ انہوں نے ان پر فقہ اور سنن (نبوی) کو محفوظ رکھا۔

(البدایہ والنہایہ جلد دہم صفحہ ۱۰۷)

نواب صدیق حسن خانؒ جن کا ذکر بعض حلقوں میں اہانت اور تحقیر کے ساتھ کیا

جاتا ہے اپنی مشہور تصنیف 'الحطہ فی ذکر الصحاح السنہ' میں تبع تابعین کے ذکر میں فرماتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی نسبت سے یہ تیسرا طبقہ ہیں اور اس طبقے کے اکابر کا ذکر کرتے ہوئے فرماتے ہیں :

منہم الامام جعفر الصادق والبرحیفہ النعمان بن ثابت الامام الاعظم
وما لک والاوزاعی والثوری وابن جریرؒ ومحمد بن ادریس الشافعیؒ
وغیرہم وهذه الطبقات الثلاثة ہی المشہود لہا بالخیر علی لسان
نبی صلی اللہ علیہ وسلم وهم الصدر الاول والسلف الصالح

۴۲ -

والمحتج بہم فی کل باب

کہ ان تبع تابعین میں سے امام جعفر صادقؒ، امام اعظم ابوحنیفہؒ، امام مالکؒ، امام شافعیؒ، امام اوزاعیؒ وغیر ہم ہیں اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد کے مطابق یہ تین زمانے صحابہؓ، تابعین، تبع تابعین، خیر و برکت کے ہیں اور یہی اسلام کے صدرا اول اور ہمارے سلف صالح ہیں جن سے ہر باب میں سند پیش کی جاسکتی ہے۔

مولانا سید زبیر حسین محدث دہلویؒ جو امام عربا و عجما اور استاذ العلماء ہیں جن کا ذکر کئی ایک اکابر علماء دیوبند نے حقارت سے کیا ہے، اپنی کتاب 'معیار الحق' میں امام ابوحنیفہؒ کے تابعی ہونے کی بحث کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

(ہر چند کہ فضائل سے امام صاحب کے ہم کو عین عزت اور فخر ہے اس لیے کہ وہ ہمارے پیشوا ہیں اور ہم انکے امر حق میں پیرو ہیں ان فضائل سے جو فی الواقع بھی ہوں اور ساتھ اسناد صحیح کے ثابت ہوں اور اس میں امام صاحب کی کسر شان اور مذمت نہیں ہے اس لیے کہ انہی فضیلت تابعی ہونے پر موقوف نہیں۔ ان کا مجتہد ہونا اور متبع سنت اور متقی پر ہیز گار ہونا کافی ہے۔ ان کے فضائل میں اور آیتہ کریمہ اِنَّ

اگر مکر عند اللہ انقاکم زینت بخش مراتب) صفحہ ۵
 مولانا اشرف علی صاحب تھانوی علماء دیوبند میں ممتاز مقام رکھتے ہیں۔ ان سے
 دو واقعات ان کے خلیفہ مجاز خواجہ عزیز الحسن صاحب اشرف السوانح میں نقل کئے
 ہوئے فرماتے ہیں۔

کہ حضرت والا جناب مولانا سید نذیر حسین صاحب دہلوی رحمۃ اللہ علیہ سے جو اہل حدیث
 کے بہت سربراہ اور وہ علماء میں سے تھے دو بار ملے۔ ایک بار دہلی میں طالب علمی کے
 زمانہ میں اور ایک بار آرہ (بہار) میں۔ دہلی کی ملاقات کا ذکر کرتے ہوئے ایک
 واقعہ بیان کرتے ہیں۔

اس زمانے میں ایک غیر مقلد طالب علم مدرسہ دیوبند میں پڑھتا تھا۔ اس نے حضرت امام
 محمدؐ کی شان میں کچھ گستاخانہ کلمات استعمال کیے۔ اس پر اور طالب علموں نے اسے پٹ
 دیا تھا۔ اس واقعہ کی دمولانا نذیر حسین صاحب سے شکایت بھی کی۔ حضرت والا نے
 فرمایا کہ اس نے امام محمدؐ کی شان میں گستاخانہ کلمات استعمال کیے تھے اس پر طلباء کو غصہ
 آگیا۔ یہ سن کر مولوی صاحب نے فرمایا کہ واقعی یہ اس کی بڑی بے جا حرکت تھی۔
 دوسرا واقعہ آرہ کا ذکر کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

اس وقت ایک غالی غیر مقلد مولوی صاحب نے جو ان کے پاس بیٹھے تھے،
 دوران گفتگو حضرت ابن ہمامؒ کی کچھ تنقیص کی۔ مولوی صاحب یعنی مولانا نذیر حسینؒ نے
 ان کو ڈانسا کہ یہ بڑے لوگ تھے ہمارا منہ نہیں کہ ہم ان کی شان میں کچھ کہہ سکیں۔

(اشرف السوانح حصہ اول صفحہ ۱۲۳-۱۲۴)

یہ دونوں واقعات اہل حدیث علماء کی روایت سے نہیں بلکہ اکابر علماء دیوبند
 کے واسطے سے ہیں۔ ان سے کس قدر وضاحت سے ثابت ہوتا ہے کہ اکابر علماء
 اہل حدیث امام البوصیقہ، امام محمدؐ اور ان کے بہت بعد کے علماء جیسا کہ علامہ ابن ہمامؒ

کے لیے کس درجہ ادب و احترام رکھتے تھے۔

اگر ہم ان تمام عبارات کو نقل کریں جو علماء اہلحدیث اور اکابر اہلحدیث نے اپنی تصنیفات میں تحریر فرمائی ہیں تو ایک ضخیم کتاب مرتب ہو جائے۔ یہ سب کی سب اس پر شاہد عدل ہیں کہ انہوں نے ائمہ دین کے ادب و احترام کے اظہار میں کبھی کوتاہی نہیں کی اور اپنے تلامذہ اور وابستگان دامن کے دلوں میں ائمہ کرام کی تعظیم و تحجیم کے نیک جذبات پیدا کرنے میں ہمیشہ کوشش کی۔

لیکن اگر کوئی شخص اہلحدیث کہلا کر کسی امام کے حق میں سوہن رکھتا ہے یا ادب و احترام سے ذکر نہیں کرتا ہے تو اس کا طرز عمل جماعت اہلحدیث کا مسلک نہیں بن جائے گا۔ اس کی مثال ایسی ہی ہے جیسا کہ کوئی حنفی کہلا کر امام شافعی کی شان میں گستاخی کے کلمات کہے۔ اس کی ایک مثال عرض کرتا ہوں۔

ملاں جیون نے اپنی مشہور درسی کتاب 'نور الانوار' میں جہالت کے تین اقسام بیان کیے ہیں۔ قسم اول لکھتے ہیں "جہل باطل" ہے اور اس کا حکم یہ ہے 'لا یصلح عذراً فی الآخرة' یہ جہالت قابلِ عفو نہیں۔ آخرت میں یہ عذر نہیں سنا جائے گا کہ جہالت اور بے خبری سے یہ گناہ سرزد ہوا ہے۔ اس کی مثال میں فرماتے ہیں 'کجمل الکافر' جیسا کہ کافر۔ دلائل توحید و رسالت کے واضح ہونے کے باوجود اگر اس سے جاہل رہے تو آخرت میں یہ جہالت قابلِ عفو نہیں۔

اس کی دوسری مثال انہوں نے یہ دی ہے۔ کجمل صاحب المہوی فی صفات اللہ و احکام الآخرة کجمل المعتزلة۔ یعنی صفات البلیہ اور احکام آخرت میں معتزلہ کا جہل بھی جہل باطل ہے اور آخرت میں یہ عذر نہیں بن سکے گا یعنی اس پر مواخذہ ہوگا اور یہ جہل قابلِ سزا ہے۔

اس کی تیسری مثال ملاں جیون نے یہ بیان کی ہے وجہل الباعی باطاعتہ

الامام الحق۔ یعنی امام برحق سے بغاوت کرنے والے کی جہالت بھی جہل باطل ہے۔
 اس کی چوتھی مثال میں امام شافعیؒ کو پیش کیا گیا ہے۔ فرماتے ہیں۔
 وجہل من خالف فی اجنبادہ الكتاب کجہل الشافعیؒ فی حل منزوک
 التسمیة عامداً قیاساً علی منزوک التسمیة ناسیا۔ والسنة المشورة کجہل
 الشافعیؒ فی جواز القضاء بشاهد ویمین۔۔۔ بحث الاحکام۔ نور الانوار
 مطبع مصطفائی ص ۲۵۴

یعنی جس مجتہد کا اجتہاد کتاب اللہ کے مخالف ہو وہ جہل باطل ہے جیسا کہ امام شافعیؒ
 کا جہل کہ انہوں نے اس ذبیحہ کو بھی حلال کہہ دیا ہے جسے مسلمان ذبح کرے اور عبد اللہ
 اللہ اکبر نہ کہے اور اسے قیاس کیا ہے انہوں نے اس پر کہ اگر کوئی مسلمان ذبح کے
 وقت بھول کر تسمیہ نہ کہے تو وہ حلال ہوتا ہے۔ اس کے بعد فرماتے ہیں کہ یہ بھی جہل باطل
 میں داخل ہے کہ مجتہد کسی مشہور حدیث کے خلاف فتویٰ دے جیسا کہ امام شافعیؒ کی جہالت
 ہے کہ وہ فرماتے ہیں کہ ایک گواہ اور قسم کے ساتھ مدعی کے حق میں فیصلہ ہو سکتا ہے۔
 اس تحریر کے بعد مجھے کچھ کہنے کی ضرورت نہیں محسوس ہوتی۔ ہر شخص دیکھ سکتا ہے
 کہ ملا جیون جیسے مقدمہ عالم نے امام شافعیؒ کے ایک مسئلہ اجتہادی اور ایک مسئلہ منصوصہ
 کو جہل باطل قرار دے کر جہل کافر، جہل معزول اور جہل باغی کے ساتھ ملا دیا ہے۔
 خود ملا جیون کو بھی اس سوء ادب کا احساس ہوا۔ افسوس کہ اس احساس کے بعد انہوں نے
 دوسرا ظلم یہ کیا کہ کہا۔ ”میں تنہا اس سوء ادب کا ذمہ دار نہیں ہوں۔ ہمارے اسلاف بھی
 اس سوء ادب میں میرے ساتھ شریک ہیں۔“ ان کے الفاظ یہ ہیں۔

وقد نقننا کل هذا علی نحو ما قال اسلافنا وان کننا لم نجنزه علیہ
 ہم نے امام شافعیؒ کے متعلق جو کچھ نقل کیا ہے یہ ہمارے اسلاف کے کہنے کی بنا پر
 ہے ورنہ ہم اس قدر جرات نہ کر سکتے تھے۔ مولانا عبد الحلیم لکھنویؒ حاشیے پر لکھتے ہیں؛

لان فی هذا البیان سوء الادب

اس لیے جرات نہ کرتے کہ اس بیان میں امام شافعیؒ کی بے ادبی ہے۔
نورالانوار درسی کتاب ہے اور تمام مدارس میں پڑھائی جاتی ہے۔ کیا اس کا یہ معنی
سمجھا جائے کہ تمام حنفی مدارس میں امام شافعیؒ کے لیے سوء ادب کی سبقاً و درسا تعلیم دی
جاتی ہے؟

ایک واقعہ یاد آگیا۔ مجھ سے یہ واقعہ مولانا مفتی محمد حسن صاحب خلیفہ اعظم حضرت مولانا
اشرف علی تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے بیان فرمایا۔ حضرت مفتی صاحب اپنے علم و فضل کے لحاظ
سے ہمارے زمانہ کے ممتاز علماء میں سے ہیں۔ تصوف میں ان کا قدم راسخ ہے تصوف
میں عالمانہ بصیرت جیسے انہیں حاصل ہے بہت کم صوفیاء کو حاصل ہوگی۔ بہت بڑے
عالم اور خلقِ عظیم کے مطاع اور مخدوم ہیں لیکن ساتھ ہی بڑے متواضع اور منکسر المزاج ہیں۔
فرماتے ہیں :

کہ شیخ النذیر حضرت مولانا محمود الحسن رحمۃ اللہ علیہ نے ایک دفعہ خواب میں دیکھا کہ
”امام شافعیؒ برہنہ تلوار لیے مدرسہ دیوبند میں بڑے غصہ کی حالت میں گھوم رہے ہیں۔“
حضرت شیخ النذیر اس خواب سے بہت پریشان ہوئے اور صبح ہوتے ہی حضرت مولانا انور شاہؒ
سے ذکر کیا اور فرمایا کہ کسی نے حضرت امام شافعیؒ کی شان میں گستاخی کی ہے۔ شاہ صاحب
نے تحقیقات کے بعد عرض کیا کہ حضرت سوائے اس کے اور کچھ معلوم نہیں ہو سکا کہ ایک
شافعی طالب علم نے حنفی مسک احتیاط کر لیا ہے۔

اس عاجز کی رائے میں اتنی سی بات کے لیے امام شافعیؒ کا شمشیر بکف ہو کر مدرسہ
دیوبند میں غصہ کی حالت میں پھرنے کچھ صحیح نہیں معلوم ہوتا۔ اصل حقیقت یہ ہے کہ حنفی
اور شافعی سے اختلافی مسائل کے بیان کرنے میں بالعموم ادب کا دامن چھوٹ جاتا ہے
اور طلباء اس بارے میں زیادہ بے احتیاط ہوتے ہیں اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ دیوبند

اس بارے میں زیادہ بدنام ہے۔ اس لیے مثالی طور پر حضرت شیخ المنذوقہ کو خواب میں سمجھایا گیا۔ اور ہمارے مدرسہ کا حال سنیں۔ ایک روز حضرت والد بزرگوار (مولانا عبد الجبار غزنوی) کے درس بخاری میں ایک طالب علم نے کہہ دیا کہ امام ابو حنیفہؒ کو پندرہ حدیثیں یاد تھیں۔ مجھے ان سے زیادہ حدیثیں یاد ہیں۔ والد صاحب کا چہرہ مبارک غصہ سے سُرخ ہو گیا۔ اس کو حلقہ درس سے نکال دیا اور مدرسہ سے بھی خارج کر دیا اور فرجوائے ”انقوائے فرستہ المرمن فانہ ینظر بنور اللہ“ فرمایا کہ اس شخص کا خاتمہ دین حق پر نہیں ہوگا۔ ایک ہفتہ نہیں گزرے تھا کہ معلوم ہوا کہ وہ طالب علم مُرتد ہو گیا ہے۔ اعاذنا اللہ من سوء الخاتمة۔

یہ ہے جو آپ سے کہہ رہا ہوں کہ جس طرح ایک حنفی عالم یا حنفی درس گاہ اگر امام شافعیؒ کی شان میں بے ادبی اور گستاخی کرے تو اس کو اصناف کا من حیث الجماعت مسک نہیں قرار دیا جاسکتا۔ اسی طرح اگر کوئی اہل حدیث امام ابو حنیفہؒ کے حق میں کوئی ناشائستہ لفظ استعمال کرتا ہے یا دل میں سو وطن رکھتا ہے تو یہ اہل حدیث کا مسک نہیں کہلائے گا۔“

مرزائیت کی تردید

اسلام اور تقادیا نیت
 نبی اُمت کی تشریح
 دعوائے نبوت بدرجہ کمال
 نبوت کی تشریح
 صاحب شریعت ہونے کا دعویٰ
 فتوئے کفر کی ندرت بھی رفقا
 تقادیانی "کلام اللہ"
 نبی اُمت کا اعلان
 تقادیانی دین
 مسلمانوں سے قطع تعلق
 اسلامی اداروں سے بے تعلق
 نماز عید علیحدہ پڑھو
 حکیم نورالدین کا فتویٰ
 مسلمانوں کا جنازہ نہ پڑھو
 مسلمانوں سے نکاح حرام
 حکیم نورالدین کا مسلم مقاطعہ
 اقتصادی مقاطعہ
 مرزا بیوں کا اقتصادی اقرارنامہ
 مرزا بیوں کے مسلم بھدر
 اسلامی سلطنت کی تباہی پر خوشی

حضرت والد علیہ الرحمہ اتحاد بین المسلمین کے زبردست حامی اور داعی تھے، لیکن قادیانیت کے ساتھ کسی قسم کے سمجھوتے کی کوئی گنجائش اُن کے ہاں نہ تھی۔ وہ مرزاؤں کو مسلمانوں سے خارج سمجھتے تھے اور انہیں الگ فرقہ قرار دیتے تھے۔ قادیانیت کے بارے میں اُن کے موقف کی وضاحت کے لیے اُن کا ایک محلّ مضمون نقل کیا جاتا ہے۔ یہ مضمون اُنہوں نے ۱۹۳۶ء میں لکھا تھا، لیکن مضمون کی افادیت اب بھی برقرار ہے۔ اس مضمون میں اُنہوں نے مرزا غلام احمد اور مرزا محمود کی تحریروں سے ثابت کیا ہے کہ مرزائی مسلمانوں سے الگ ایک فرقہ ہے اور خود مرزا غلام احمد اور اُن کے خلفاء کی تعلیمات اور اُن کے طرز عمل کی بنا پر مرزائی اس بات کے سزاوار ہیں کہ انہیں مسلمانوں سے الگ ایک اقلیت قرار دیا جائے۔

”اسلام اور قادیانیت“

مرزائی مسلمانوں سے الگ ایک فرقہ ہے

مرزا غلام احمد اور مرزا محمود کی تحریروں کی روشنی میں

قادیانیت ایک فتنہ ہے، لیکن یہ فتنہ ہر اعتبار سے پہلے فتنوں سے زیادہ اہم، زیادہ وسیع، زیادہ منظم اور حکومتِ وقت کی پشت پناہی کے ساتھ خود کاشتہ پودے کی طرح پرورش پا رہا ہے۔ یہ ایک ناقابل انکار حقیقت ہے کہ اسلام کی سیدہ صدیہ زندگی میں اس سے قبل کبھی اُمتِ مسلمہ کو اس قسم کے فتنے سے سابقہ نہیں پڑا۔

اخبار زمیندار کا مرزائی نمبر ۱۹۳۶ء، والاعتماد، شمارہ ۶، مارچ ۱۹۵۳ء

مرزا غلام احمد قادیانی نے اپنے نئے مذہب کی بنیاد اس غلام آباد میں اس وقت رکھی جب کہ ہندوستان کے مسلمان اپنی محکومی اور غلامی کی وجہ سے مذہبی اور سیاسی پستی کی انتہا کو پہنچ چکے تھے اور بظاہر اس رقیبت اور تعہد سے نکلنے اور حریت و آزادی کے لیے سر اٹھانے کی کوئی اُمید نہ رہی تھی۔ اس وقت بانی فرقہ نے مسلمانوں کی دراندگی اور ذلت کا یقین رکھتے ہوئے اور مسلمانوں کی پستی کو بادی زوال خیال کرتے ہوئے مجہدیت، مسودیت، مسیحیت اور نبوت کے دعویٰ کو تدریج پیش کیا۔ جوں جوں حکومتِ وقت کی آئینی گرفت اس بد قسمت ملک کے رہنے والوں پر قومی ترہ ہوتی گئی بانی فرقہ اپنے دعویٰ کو پہلے سے بلند و ارفع کرتا چلا گیا، حتیٰ کہ وہ وقت آ گیا جب کہ بانی فرقہ کو یقین آ گیا کہ حکومت کا دیا ہوا امن و امان جہاں اس کے دعویٰ کی بلا خطر اشاعت اور آزادانہ تبلیغ کا ضامن ہے وہاں حکومت کی قوت و سطوت ملک پر وہ سکتہ بٹھا چکی ہے کہ دعویٰ کو اگر انتہائی منزل تک پہنچا کر بالکل نئے مذہب اور نئی اُمت کی بنیاد رکھ دی جائے، تو مسلمانوں کی قوت مزاحم نہ ہو سکے گی، بلکہ بہت ممکن اور قرین قیاس ہے کہ یہ نئی اُمت کی تجویز حکومتِ وقت کے منشاء کے مطابق ہو اور اس کے حاکمانہ اغراض کو زیادہ مستحکم کرنے والی ثابت ہو۔

وہ مسلمان جو اس خطرناک غلطی میں مبتلا ہیں

کہ قادیانی گروہ اسلام کا ایک فرقہ ہے اور

نئی اُمت کی تشریح

اُسے اسلام اور اُمتِ مسلمہ سے الگ ایک نیا فرقہ یا نئی اُمت کہنے کو اور اس کے خلاف کُفر کے فتوے صادر کرنے کو تنگ خیالی اور اشحادِ اسلام کے منافی سمجھتے ہیں، اُن کے لیے اس سلسلہ میں ضروری سمجھتا ہوں کہ بانی فرقہ اور اس کے خلفاء اور جانشینوں کے اقوال کا یہاں مختصر ذکر کروں تاکہ یہ واضح ہو سکے کہ مرزا غلام احمد قادیانی نے جب تبلیغِ اسلام کی آڑ میں اپنی پیری مریدی کا حلقہ کافی وسیع کر لیا اور مختلف پیش گوئیوں اور

اُن کی عجیب و غریب تشریحات کو شائع کر کے مریدوں کی عقیدہ مندی کو وقتاً فوقتاً امتحان کی کسوٹی پر پرکھ کر مجددیت، ہمدویت، مسیحیت اور نبوت کی منزلیں جب بتدریج چلے کر لیں تو کس طرح اُس نے ایک نئے مذہب اور نئی اُمت کے قیام کا اعلان کیا اور اپنے ماننے والوں کے سوا تمام مسلمانوں کے خلاف کُفر کا فتویٰ صادر کیا اور اس کے سوا اُس کے لیے کوئی چارہ کار نہ تھا کہ اپنی جماعت کو ایک علیحدہ قوم اور الگ اُمت بنانے کے لیے ہر اس فرد و بشر کو جو اس کی نبوت کا قائل نہ ہو، کافر قرار دے اور اُن سے ہر طرح قطع تعلق کا اعلان کرے۔

مختلف دعاوی بتدریج اپنے مریدوں سے منوانے کے بعد مرزا غلام احمد دہلوی

دعوئے نبوت بدرجہ کمال

اپنے دعوئے نبوت کو باریہ تکمیل تک پہنچانے اور ایک نبی اور ایک اُمت اور اس کی شریعت اور اس کی کتاب اور اس کی ارضِ حرم غرض پوری نقالی کے واسطے یہ اعلانات وقتاً فوقتاً کرتا رہا:

”اور میں اس خدا کی قسم کھا کر کہتا ہوں جس کے ہاتھ میں میری جان ہے کہ اُس نے مجھے بھیجا ہے اور اُس نے میرا نام نبی لکھا ہے اور اُس نے مجھے مسیح موعود کے نام سے پکارا ہے اور اُس نے میری تصدیق کے لیے بڑے بڑے نشان ظاہر کیے جو نہیں لاکھ تک پہنچتے ہیں۔“ (تمتہ حقیقت الوحی ص ۶۷)

”خدا نے میرے ہزار ہا نشانوں سے میری وہ تائید کی کہ سب ہی کم نبی گزرے ہیں جن کی یہ تائید کی گئی، لیکن پھر بھی جن کے دلوں پر مہر ہے، وہ خدا کے نشانوں سے کچھ بھی فائدہ نہیں اٹھائے۔“ (تمتہ حقیقت الوحی ص ۱۲۸)

مرزا غلام احمد کی نبوت کے متعلق تاکہ کسی قسم کا شک و شبہ باقی نہ رہے، اس کے خلیفہ دوم اور اس کے بیٹے

نبوت کی تشریح

میاں محمود کی بعض عبارات نقل کرتا ہوں جس سے معلوم ہو جائے گا کہ یہ لوگ مرزا کو دوسرے انبیاء کی طرح حقیقی نبی مانتے ہیں:

”میں حضرت مرزا صاحب کی نبوت کے متعلق لکھ آیا ہوں کہ نبوت کے

حقوق کے لحاظ سے وہ ایسی ہی نبوت ہے جیسے اور نبیوں کی۔ صرف

نبوت کے حاصل کرنے کے طریقوں میں فرق ہے (القول الفیصل ص ۲۳)

پس شریعتِ اسلامی نبی کے جو معنی کرتی ہے، اس معنی سے مرزا صاحب ہرگز

مجازی نبی نہیں ہیں بلکہ حقیقی نبی ہونے کے دعویدار ہیں۔

صرف دعوئے نبوت پر اکتفا نہیں کیا
کیا بلکہ صاحبِ شریعت نبی ہونے

صاحبِ شریعت ہونے کا دعویٰ

کا دعویٰ کیا۔ دیکھئے:

”یہ بھی تو سمجھو کہ شریعت کیا چیز ہے؟ جس نے اپنی وحی کے ذریعہ سے چند امور ونہی بیان کیے اور اپنی امت کے لیے ایک قانون مقرر کیا، وہی صاحبِ شریعت ہو گیا۔ میری وحی میں امر بھی ہے نہی بھی اور اگر کوئی شریعت سے وہ شریعت مراد ہے جس میں نئے احکام ہوں تو یہ باطل ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

ان هذا لفي الصحف الاولى صحف ابراهيم وموسى - یعنی قرآن کی تعلیم

نوریت میں بھی موجود ہے۔ (الرابعین نمبر ص ۷۰)

صاحبِ امر ونہی اور صاحبِ شریعت کے ادعا کے ساتھ یہ بھی دعویٰ کر دیا کہ حضرت

محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے وقت میں جو احکام تھے ان میں سے بعض کی تیسخ مسیح موعود کے وقت میں کر دی گئی۔

”جہاد یعنی دینی لڑائیوں کی شدت کو خدا تعالیٰ آہستہ آہستہ کم کرنا گیا ہے۔

حضرت موسیٰ کے وقت میں اس قدر شدت تھی کہ شیر خوار بچے بھی قتل کیے

جاتے تھے۔ پھر ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے وقت میں بچوں اور بوڑھوں اور عورتوں کا قتل ممنوع ہو گیا۔۔۔۔ اور پھر مسیح موعود کے وقت قطعاً جہاد کا حکم موقوف کر دیا گیا۔“ (الرعبین نمبر ۱۵ ص ۱۵)

دعویٰ نبوت سے پہلے جب کہ صرف محدث اور ملعم ہونے کا دعویٰ تھا، اس وقت مرزائے یہ نکتہ اپنے مریدوں کو بتایا:

”یہ نکتہ یاد رکھنے کے لائق ہے کہ اپنے دعویٰ کے انکار کرنے والے کو کافر کہنا یہ صرف ان نبیوں کی شان ہے جو خدا تعالیٰ کی طرف سے شریعت اور احکام جدیدہ لاتے ہیں، لیکن صاحب شریعت کے سوا اور جس قدر محدث ہیں گو وہ کیسے ہی جناب الہی میں اعلیٰ شان رکھتے ہوں اور خلعت مکالمہ البیہ سے سرفراز ہوں، ان کے انکار سے کوئی کافر نہیں بن جاتا۔“ (تربیاق القلوب ص ۱۳۰)

مرزا غلام احمد کا یہ اعلان لاہوری جماعت کی ان تمام تادیبات کی جڑ کاٹ دینا ہے جس سے وہ عوام مسلمانوں کو دھوکا دیتے ہیں اور فریب کارانہ طریق پر مرزا کے دعاوی کو پیش کرتے ہیں۔ کیونکہ یہ تو اہل نشر ہے کہ مرزا نے اپنے مشرکین کو جنہی اور کافر بارگاہ سے ”جس کو میری تبلیغ پہنچ گئی ہے گو وہ مسلمان ہے مگر مجھے اپنا حکم نہیں عطا کرنا اور نہ مجھے مسیح موعود ماننا ہے اور نہ میری وحی کو خدا کی طرف سے جانتا ہے وہ آسمان پر قابلِ مواخذہ ہے۔“ (تحفۃ الندوہ ص ۴)

یہاں تو صرف اتنا ہی کہا کہ وہ آسمان پر قابلِ مواخذہ ہے۔ اس کے بعد فترے فسق ملتا ہے:

”جس طرح اللہ تعالیٰ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعے سے قرآن

شریف میں اور احکام دیے ہیں، اسی طرح آخری زمانہ میں ایک آخری خلیفہ کے آنے کی پیش گوئی بھی بڑے زور سے بیان فرمائی ہے اور اس کے نہ ماننے والوں کا نام فاسق رکھا ہے۔ (حجۃ اللہ، تقریر لاہور)

فتویٰ فسق کے بعد ترقی کرتے ہوئے اسلام سے محرومی کا فتویٰ دیا جاتا ہے :
 ”خدا تعالیٰ نے میرے پر ظاہر کیا ہے کہ ہر ایک وہ شخص جس کو میری دعوت پہنچی ہے اور اُس نے مجھے قبول نہیں کیا ہے وہ مسلمان نہیں ہے۔“

اخبار الفضل، قادیان ۱۵/۱۱/۱۵

اس طرح میدان تیار کر لینے کے بعد صاف و صریح طور پر کفر کا فتویٰ صادر کیا ہے:
 ”کفر دو قسم پر ہے۔ ایک کفر یہ کہ ایک شخص اسلام سے انکار کرتا ہے۔ دوسرے یہ کفر کہ مثلاً وہ مسیح موعود کو نہیں مانتا اور اس کو باوجود اتمامِ حجّت کے جھوٹا جانتا ہے۔۔۔ اگر غور سے دیکھا جائے تو یہ دونوں قسم کے کفر ایک ہی قسم میں داخل ہیں۔“ (حقیقت الوحی ص ۱۶۹)

فتویٰ صادر کر دینے کے بعد جہنم کے ٹھیکیدار بن کر تمام مسلمانوں کو جہنمی قرار دیتے ہوئے ایک اشتهار بعنوان ”معیارِ الٰہی“ میں اعلان کرتا ہے:

”مجھے الہام ہوا جو شخص تیری پیروی نہیں کرے گا اور تیری بعیت میں داخل نہیں ہوگا، وہ خدا اور اس کے رسول کی نافرمانی کرنے والا جہنمی ہے۔“ (تبلیغ رسالت جلد نہم ص ۲۷)

قادیانیوں کا شوق بکھیر جس کے لیے وہ علماء اسلام کو مطعون کرتے ہیں یہیں پر ختم نہیں ہوتا بلکہ ترقی کرتے ہوئے اس درجہ پر پہنچ جاتا ہے:

”خطبہ الہامیہ میں حضرت مسیح موعود نے آنحضرت کی بعثت اول و ثانی کی باہمی نسبت کو لہلہ اور بدر کی نسبت سے تعبیر فرمایا ہے جس سے لازم آتا

ہے کہ لعنتِ ثانی کے کافر کفر میں لعنتِ اول کے کافروں سے بہت بڑھ کر ہیں۔“
(الفضل ۱۵ جولائی ۱۹۱۵ء)

اب اس امر میں کیا مشبہ باقی رہ گیا ہے کہ مرزا غلام احمد کو نبی اللہ نہ مانتے دلے تمام دنیا کے مسلمان مرزائیوں کے نزدیک اوجہل، ابولہب اور دوسرے معاندینِ اسلام سے کفر میں کہیں بڑھ کر ہیں اور اس ملک میں بسنے والی غیر مسلم اقوام جو محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کی منکر ہیں، ان کے کفر کے مقابلہ میں مرزا غلام احمد کی نبوت کے منکر یعنی مسلمان مرزائیوں کے نزدیک بہت بڑے کافر ہیں۔ معاذ اللہ

پس ایسی حالت میں اگر مسلمان حکومت سے یہ مطالبہ کریں کہ مرزائیوں کو مسلمانوں سے الگ ایک اقلیت قرار دیا جائے تو یہ کوئی غلط بات ہے، بلکہ یہ تو مرزا غلام احمد کی تعلیمات کے مطابق ان کی عین منشا کے موافق ہے اور اسی مقصد کی تکمیل کے لیے تو اُس نے اپنی ”وحی“ کو قرآن کریم کی طرح قطعی، یقینی اور لاریب بیان کیا اور صاحبِ کتاب، صاحبِ شریعت اور صاحبِ اُمت ہونے کا دعویٰ کر کے عام مسلمانوں سے قطعِ تعلق کا حکم دیا۔

مرزا غلام احمد نے نبوت کا جال بچھانے کے بعد یہ ضروری سمجھا کہ نئی اُمت کی بنیاد ڈالنے کے لیے صاحبِ کتاب ہونے کا بھی دعویٰ کر دیا جائے، اس لیے اُس نے صاحبِ وحی ہونے کا دعویٰ کیا اور کہا کہ جو کلام مجھ پر نازل ہوتا ہے وہ بغیر ایک ذرہ کے فرق کے قرآن کَرَم کی طرح اللہ کا کلام ہے جیسا کہ ذیل کی عبارات سے ظاہر ہوتا ہے:

”اور میں جیسا کہ قرآن شریف کی آیات پر ایمان رکھتا ہوں، ایسا ہی بغیر فرق ایک ذرہ کے خدا کی اس کھلی وحی پر ایمان لاتا ہوں جو مجھے ہوئی...
... اور میں بیت اللہ میں کھڑے ہو کر یہ قسم کھا سکتا ہوں کہ وہ پاک وحی

جو میرے پر نازل ہوتی ہے وہ اس خدا کا کلام ہے جس نے حضرت موسیٰ اور
حضرت عیسیٰ اور حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر اپنا کلام نازل کیا تھا۔

(ایک غلطی کا ازالہ مصنفہ مرزا غلام احمد)

اور اس تمام خرافات کو جسے مرزا غلام احمد الہامات اور وحی الہی سے تعبیر کرتا ہے،
اس کے مجبور کو میں پاروں کے برابر سمجھ قرار دیتے ہوئے لکھتا ہے:

”اور خدا کا کلام اس قدر مجھ پر نازل ہوا ہے کہ اگر وہ تمام لکھا جائے تو

بیس جزو سے کم نہ ہوگا۔“ (حقیقت الہی ص ۳۹۱)

اس لحاظ سے عام مسلمانوں کا قرآن تو قیس پاروں کا ہے لیکن مرزائیوں کا قرآن

قدیم اور جدید کلام الہی کا مجبورہ گویا پچاس پاروں کا ہوگا۔ (معاذ اللہ من ذالک)

نبوت اور کتاب اللہ کا یقین دلانے کے بعد
مرزا غلام احمد نے ان الفاظ سے ایک نئی

نئی اُمت کا اعلان

اُمت کی بنیاد ڈالی:

”جو شخص نبوت کا دعویٰ کرے گا اس دعویٰ میں ضرور ہے کہ وہ خدا
تعالیٰ کی ہستی کا اقرار کرے اور نیز یہ بھی کہ خدا تعالیٰ کی طرف سے میرے
پر وحی نازل ہوتی ہے اور نیز خلق اللہ کو وہ کلام سنا دے جو اس پر خدا تعالیٰ
کی طرف سے نازل ہوا ہے اور ایک اُمت بنا دے جو اس کو نبی سمجھتی ہو
اور اس کی کتاب کو کتاب اللہ جانتی ہو۔“

(ارشاد مرزا غلام احمد - الحکم قادیان نمبر ۲۱ جلد ۷)

اب اس نئے سلسلہ کے تمام لوازم اور مناسبات دیکھتے جائیے۔ اس کے مطالعہ
سے اس امر کے فیصلہ کرنے میں کوئی دقت نہیں ہوگی۔ خود مرزا غلام احمد اور اس کے
خلفاء کے اعلانات اور ہدایات وغیرہ میرزائیوں کو تمام مسلمانوں سے الگ ایک اُمت اور علیحدہ

جماعت قرار دینے میں کس قدر مؤید ہیں۔

”اللہ تعالیٰ نے اس آخری صداقت کو قادیانیت کے دیرانے

میں نمودار کیا اور حضرت مسیح موعود کو اس اہم کام کے لیے منتخب

قادیانی دین

فرمایا اور فرمایا میں تیرے نام کو دنیا کے کناروں تک پہنچا دوں گا۔ زور آور حملوں سے تیری

تائید کروں گا اور جو دین تو لے آیا ہے اسے تمام دیگر ادیان پر بندرعبیدہ دلائل و براہین غالب

(الفضل قادیان - ۳ فروری ۱۹۳۵ء)

کروں گا۔“

نئی اُمت، نئی کتاب اور نئی شریعت مریدوں

سے منوانے کے بعد مرزا غلام احمد نے اس سلسلہ کو

مسلمانوں سے قطع تعلق

مضبوط کرنے کے لیے تمام مسلمانوں سے میرزاٹیوں کو قطع تعلق کا حکم دیا۔ اس حکم کو ان الفاظ

کے ساتھ اپنے مریدوں کے ذہن نشین کرنا ہے :

”یہ جو ہم نے دوسرے مدعیان اسلام سے قطع تعلق کیا ہے۔ ازل تو یہ خدا تعالیٰ

کے حکم سے تھا، نہ اپنی طرف سے اور دوسرے وہ لوگ ریا پرستی اور طرح طرح

کی فراہمیوں میں حد سے بڑھ گئے ہیں اور ان لوگوں کو ان کی ایسی حالت

کے ساتھ اپنی جماعت کے ساتھ ملانا یا ان سے قطع تعلق رکھنا ایسا ہی ہے

جیسا کہ عُدہ اور تازہ دودھ میں بگڑا ہوا دودھ ڈال دین جو بگڑ گیا ہے اور

اس میں کپڑے پڑ گئے ہیں“ (تشحیذ اللاذہان قادیان جلد ۶ نمبر ۸)

تمام اسلامی فرقوں کے کلی متارکہ کے لیے تاکید ہی حکم مرزا غلام احمد نے یوں دیا:

”تمہیں دوسرے فرقوں کو جو دعویٰ اسلام کرتے ہیں بجلی ترک کرنا پڑے گا۔“

(حاشیہ تحفہ گوٹریہ ص ۲۷)

مرزا غلام احمد قادیانی کا عام اسلامی

اداروں کے متعلق جو روئے تھا وہ بھی

اسلامی اداروں سے بے تعلق

کسی سے پوشیدہ نہیں۔ شخص ساری عمر نہ کسی اسلامی انجمن کا رکن بنا اور نہ کسی انجمن کو چندہ دیا۔ اللہ خود مسلمانوں سے چندہ مانگتا اور خوب وصول کرتا رہا۔ سر در شاہ قادیانی اس مضمون پر اپنی کتاب میں لکھتا ہے :

”حتیٰ کہ ایک دفعہ علی گڑھ میں قرآن مجید کی اشاعت کی غرض سے ایک انجمن بنائی گئی اور وہاں کے سیکرٹری نے ایک خاص خط لکھ دیا کہ ہماری انجمن میں آپ صاحبان میں سے بھی کچھ شریک ہوں مگر ادباً.....
مولوی عبدالکريم.... کی کوشش کے حضور درمزا نے انکار ہی فرمایا۔ پھر سر سید صاحب کے چندہ مدرسہ مانگنے کا واقعہ تو مشہور ہی ہے یہاں تک کہ وہ ایک روپیہ تک بھی مانگتے رہے لیکن حضور درمزا نے شرکت سے انکار ہی فرمایا، حالانکہ اپنا خود مدرسہ انگریزی جاری کیا ہوا تھا۔“

(کشف الاختلاف ص ۴۲)

مذکورہ بالا افتراق اور انقطاع کے بعد یہ کیسے ممکن تھا کہ وہ مسلمانوں کے ساتھ مل کر اپنے اُمتیوں کو نماز

نماز علیحدہ پڑھو

پڑھنے کی اجازت دے، اس لیے مرزا نے تاکید کہا :

”خدا تعالیٰ چاہتا ہے کہ ایک جماعت تیار کرے، پھر جان بوجھ کر ان لوگوں میں گھسنا جس سے وہ الگ کرنا چاہتا ہے، منشاء الہی کی مخالفت ہے۔ میں تم کو تاکید منع کرتا ہوں کہ غیر احمدی کے پیچھے نماز نہ پڑھو۔“

(الحکم ۷، فروری ۱۹۰۳ء)

اور اس حکم کو زیادہ وسعت دیتے ہوئے لکھتا ہے :

”پس یاد رکھو! جیسا کہ خدا نے مجھے اطلاع دی ہے تمہارے پر حرام اور قطعی حرام ہے کہ کسی مکفر اور مکذّب یا مرتد کے پیچھے نماز پڑھو بلکہ چاہیے

کہ تمنا روہی امام ہو جو تم میں سے ہو... تمہیں دوسرے فرقوں کو جو دوسرے
اسلام کرتے ہیں، بجلی ترک کرنا پڑے گا۔ (اربعین نمبر ۳ ص ۳۴ کا حاشیہ)

میاں محمود حب جج کے واسطے گیا، تو اپنی

ایک کتاب میں لکھتا ہے کہ پہلے ہی دن طرف

حکیم نور الدین کا فتویٰ

کے وقت مغرب کی نماز کا وقت آ گیا تو اُس نے ہر چند ٹپلنے کی کوشش کی مگر راستے
رُک گئے تھے اور نماز شروع ہو گئی تھی۔ تو اُس کے نانانے جو اس کے ہمراہ تھا کہا کہ
حکیم نور الدین (خلیفہ اول متبئی قادیان) کا حکم ہے کہ مکہ میں ان کے پیچھے نماز پڑھ لو چنانچہ
انہوں نے مغرب کی اور اس کے بعد عشاء کی نماز بھی پڑھ لی، لیکن حرم سے فارغ ہونے
کے بعد جب گھر گئے تو دونوں نمازیں دہرائیں۔ جب وطن واپس آئے تو کسی نے حکیم
نور الدین کے پاس اس کا ذکر کیا۔ اُس نے جواب میں کہا:

”ہم نے ایسا کوئی فتویٰ نہیں دیا۔ ہماری یہ اجازت تو ان لوگوں کے لیے

ہے جو ڈرتے ہیں اور جن کے اتبلا کا ڈر ہے، وہ ایسا کر سکتے ہیں کہ اگر

کسی جگہ گھر گئے ہوں تو غیر احمدی کے پیچھے نماز پڑھ لیں اور پھر آکر دُھرائیں۔“

(آئینہ صداقت ص ۹۱ مصنف میاں محمود احمد خلیفہ قادیان)

مسلمانوں سے کامل علیحدگی اور مکمل انقطاع

تعلق کرنے اور سچ مچ ایک الگ اُمت

مسلمانوں کا جنازہ نہ پڑھو

بنانے کے لیے مسلمانوں کی میت اگرچہ چھوٹے معصوم بچے کی ہو اس کی نماز جنازہ پڑھنے
سے منع کر دیا گیا:

”غیر احمدی مسلمانوں کا جنازہ پڑھنا جائز نہیں حتیٰ کہ غیر احمدی معصوم بچے

کا بھی جنازہ پڑھنا جائز نہیں۔“

(انوارِ خلافت ص ۹۲ مصنف محمود)

اور اسی کتاب کے ص ۹۱ پر میاں محمود اپنے باپ مرزا غلام احمد کے متعلق ایک واقعہ لکھتا ہے :

” آپ کا ایک بٹیا فوت ہو گیا جو آپ کی زبانی طور پر تصدیق کرتا تھا۔ جب وہ مرا تو مجھے یاد ہے آپ ٹھلٹے جاتے اور فرماتے کہ اُس نے کبھی شرارت نہیں کی تھی بلکہ میرا فرمانبردار ہی رہا۔۔۔۔۔ اور یہ بھی فرماتے کہ میری بڑی عزت کیا کرتا تھا، لیکن آپ نے اس کا جنازہ نہ پڑھا۔“

جس مذہب کے بانی کا اپنے فرمانبردار بیٹے کے ساتھ یہ سلوک ہے کوئی مسلمان اس گروہ سے کسی ہمدردی یا کسی سلوک کی کیا امید رکھ سکتا ہے۔

تاکہ زندگی کا کوئی شعبہ ایسا نہ رہ جائے جس سے اُمتِ مرزائیہ کا اُمتِ مسلمہ

”مسلمانوں سے نکاح حرام“

کے ساتھ تعلق باقی رہے اس لیے نکاح کے متعلق یہ حکم سنایا گیا :

” حضرت مسیح موعود کا حکم اور زبردست حکم ہے کہ کوئی احمدی غیب

احمدی کو لڑکی نہ دے۔“ (برکاتِ خلافت ص ۷۵)

میاں محمود ایک دوسری کتاب میں مسلمانوں کے ساتھ نکاح کو ہندوؤں اور

عیسائیوں کے ساتھ نکاح کے مماثل قرار دیتے ہوئے لکھتا ہے :

” جو شخص غیر احمدی کو رشتہ دیتا ہے وہ یقیناً مسیح موعود کو نہیں سمجھتا اور

نہ یہ جانتا ہے کہ احمدیت کیا چیز ہے ؟ کیا غیر احمدیوں میں کوئی ایسا بلے بین

ہے جو کسی ہندو یا عیسائی کو اپنی لڑکی دے۔ ان لوگوں کو ظم کافر کہتے ہو،

مگر ظم سے اچھے رہے کہ کافر ہو کر بھی کسی کافر کو لڑکی نہیں دیتے، مگر ظم احمدی

کہا کر کافر کو دیتے ہو۔“

(ملائکتہ اللہ ص ۴۶)

میاں محمود اپنے باپ کا ذکر کرتے ہوئے لکھتا ہے :

حکیم نور الدین کا مسلم مفاطحہ

” ایک شخص نے بار بار پوچھا اور کئی قسم کی مجبوریوں کو پیش کیا، لیکن آپ نے اس کو یہی فرمایا کہ لڑکی بٹھائے رکھو، لیکن غیر احمدیوں میں نہ دو۔ آپ کی وفات کے بعد اُس نے غیر کو لڑکی دے دی، تو حضرت خلیفہ اول نے اس کو احمدیوں کی امامت سے ہٹا دیا اور جماعت سے خارج کر دیا اور اپنی خلافت کے چھ سالوں میں اس کی توبہ قبول نہ کی باوجودیکہ وہ بار بار توبہ کرتا رہا۔“

(انوارِ خلافت ص ۶۴)

میرزا یوں سے اتحاد کے متمنی مسلمان اس حقیقت کو نہیں معلوم کیوں نظر انداز کر دیتے ہیں کہ جس

اقتصادی مفاطحہ

مذہب کی بنیاد ان تعلیمات پر ہے جن کا ذکر اوپر کر چکا ہوں کہ وہ ہر معاملہ میں مسلمانوں کے ساتھ علیحدگی اور افتراق کو اپنی حیات کے لیے ضروری سمجھتے ہوں نہ صرف یہ بلکہ غلام غیر مسلم اقوام کے گفز کے مقابلہ میں مسلمانوں کو بہت بڑے کافر سمجھتے ہوں۔ کاش وہ چشم بصیرت سے ان مصائب کا مطالعہ کرتے جو قادیان میں رہنے والے مسلمانوں پر خلیفہ قادیان اور اس کی جماعت کی طرف سے نازل کیے جاتے رہے ہیں۔ اگر ان کو مباہلہ والوں کی دردناک داستانِ سننے کی فرصت نہیں ملی۔ اگر ان کو شہید محمد حسین کے پسندگان سے اُن کی زہرہ گداز نکالیف معلوم کرنے کے لیے وقت میسر نہیں ہوا، اگر اس وحشت انگیزی کی خبریں ان کے کانوں تک نہیں پہنچیں جو میرزا فی رضا کار قادیان میں وقتاً فوقتاً پھیلانے رہے ہیں کم از کم مٹھکھوسلہ کا فیصلہ پڑھنے کی فرصت تو مل گئی ہوگی جس میں اُن کو نظر آیا ہوگا :

” انہوں نے اپنے دلائل دوسروں سے منوانے اور اپنی جماعت کو ترقی

دینے کے لیے ایسے حربوں کا استعمال شروع کیا جنہیں ناپسند کیا جائے گا۔ جن لوگوں نے قادیانیوں کی جماعت میں شامل ہونے سے انکار کیا، انہیں مقاطعہ، قادیان سے اخراج اور بعض اوقات اس سے بھی مکروہ تر مصائب کی دھمکیاں دے دے کر دہشت انگیزی کی فضا پیدا کی، بلکہ بسا اوقات انہوں نے ان دھمکیوں کو عملی جامہ پہنا کر اپنی جماعت کے استحکام کی کوشش کی۔“ (فیصلہ مسٹر کھوسلہ)

جو جماعت نہ صرف مذہبی لحاظ سے مسلمانوں کو کافر سمجھتی ہو، بلکہ اقتصادی طور پر بھی مسلمانوں کے ساتھ بدترین سلوک روا رکھتی ہو، اس سے نیکی کی کیا توقع ہو سکتی ہے؟ یہاں پر مرزائی سرگرمی نقل شائع کرتا ہوں شاید ہمارے نکتہ چینی احباب کی تسکین خاطر کا سامان مہیا ہو سکے۔

”قادیان کی احمدیہ جماعت نے جو معاہدہ ترقی تجارت تجویز کیا ہے،

مرزائیوں کا اقتصادی اقرار نامہ

منظور ہے۔ میں اقرار کرتا ہوں کہ ضروریاتِ جماعتِ قادیان کا خیال رکھوں گا اور قادیانی مدیر تجارت کو جو حکم کسی چیز کے ہم پہنچانے کا دیں گے، اس کی تعمیل کروں گا اور جو حکم ناظر امور عامہ دیں گے، اس کی بلاچون چہر تعمیل کروں گا۔۔۔۔۔ ہر قسم کا سٹوا احمدیوں سے خریدوں گا۔ معاہدہ کی خلاف ورزی کی صورت میں ۲۰ روپے سے لے کر ۱۰۰ روپے تک جرمانہ ادا کروں گا۔“

یہ ہے وہ جماعت جس کے ساتھ ہمیں بعض مسلم جرائد اور بعض سیاسی راہنما اتحاد اور اتفاق کی دعوت دیتے ہیں اور مرزائیوں کے اختلاف کو فدوی اختلاف قرار دیتے ہیں۔ اگر ان کے پاس چشمِ بعیرت موجود ہے، تو اس سے ضرور سبق حاصل کریں گے۔

مرزائیوں سے ہمدردی رکھنے والے مسلمان

مرزائیوں کے مسلم ہمدرد

اگر ہماری معروضات کو درخور اعتناء نہ سمجھیں، تو کیا وہ مرزا محمود کی اس تقریر سے بھی سبق حاصل نہیں کریں گے :

” ساری دنیا ہماری دشمن ہے۔ بعض لوگ اُن کو ہم سے مطلب ہونا ہے تو ہیں شاباش کہتے ہیں جس سے بعض احمدی یہ خیال کر لیتے ہیں کہ وہ ہمارے دوست ہیں۔ حالانکہ جب تک ایک شخص خواہ وہ ہم سے کتنی بہادری کرنے والا ہو، پورے طور پر احمدی نہیں ہو جاتا ہمارا دشمن ہے۔“

(تقریر میں محمود ۲۵ اپریل ۱۹۳۰ء)

جنگِ عظیم کا وہ الم آفریں زمانہ جب کہ
حجاز، عراق، فلسطین اور مشرقِ اردن

اسلامی سلطنت کی تباہی پر خوشی

پر اسلامی عظمت کا علم سرنگوں ہو رہا تھا اور صلیب، اہلال کے خلاف کامیاب جنگ لڑ کر صدیوں کے بعد بیت المقدس واپس لینے میں مصروف تھی اور مشرق سے مغرب تک ہر مسلم کا گھرواٹم کدہ بنا ہوا تھا، عین اس زمانے میں مرزائی اسلام کی تنکست پر اپنے مرکز قادیان میں جشن شادمانی منا رہے تھے۔ ”الفضل“ قادیان ۱۶ نومبر ۱۹۱۶ء کے مشرق پر قادیان میں جشنِ مسرت کے عنوان سے یہ اعلان شائع کیا گیا :

” ۱۳ تاریخ جس دن جرمنی کے شرائط منظور کر لینے اور التوائے جنگ کے کاغذ پر دستخط ہو جانے کی اطلاع قادیان پہنچی، تو خوشی اور انبساط کی ایک لہر برفی مسرت کے ساتھ تمام لوگوں کے قلوب میں سراپت کر گئی اور جس نے اس خبر کو سنا نہایت شاداں و درخشاں ہوا۔۔۔۔۔ حضرت خلیفۃ المسیح ثانی کی طرف سے مبارکباد کے تاریخچے گئے اور حضور نے پانچ سو روپیہ اظہارِ مسرت کے طور پر ڈپٹی کمشنر صاحب بہادر گورداسپو کی خدمت میں بھیجا یا کہ آپ جہاں پسند فرمائیں خرچ کریں۔ پیشتر ازیں

چند روز ہوئے کہ ٹرکی کے ہتھیار ڈالنے کی خوشی میں حضور نے پانچ ہزار روپے جنگی اغراض کے لیے ڈپٹی کمشنر صاحب کی خدمت میں بھجوائے تھے۔ ان تمام تفصیلات کے بعد کوننگڈل مسلمان ہے جو مرزاٹیوں کے رویہ سے متاثر نہ ہو اور خود انہی کی تعلیمات اور ان کے طرز عمل کی بنا پر اس مطالبہ کی ہمنوائی میں تامل کرے کہ مرزائی جماعت مسلمانوں سے بالکل الگ ایک جماعت ہے اور اپنی ہی تحریروں کی بنا پر اس کی مستحق ہے کہ اسے مسلمانوں سے الگ ایک اقلیت قرار دیا جائے۔



شعروادب کا ذوق

انتخاب کلام میر تقی میر
متفرق اشعار
دیوان فوق سے انتخاب
فارسی کلام کا انتخاب
انتخاب کلام حافظ شیرازی
نظیری نیشاپوری کی غزلیوں کا انتخاب

اچھے شعر سے لطف اندوز ہوتے تھے کبھی کبھی شعر سناتے بھی تھے۔ ایک دن موقع کی مناسبت سے میں نے یہ شعر پڑھا:

اندریں رہ می تراشش و می غراشش
تا دم آسند دے فارغ مباحش
انہوں نے برجستہ یہ شعر سنایا:

ہے شوق و ضبط شوق میں دن رات کش مکش
دل مجھ کو، میں ہوں دل کو پریشیاں کیسے ہوئے

ایک زمانے میں کسی مقصد کے حصول کے لیے میں تنگ و دوک رہا تھا۔ اس سلسلے میں اپنے ایک حریف کے ہاں بھی مجھے دو چار بار جانا پڑا۔ انہیں خبر ہوئی تو سکرائے اور ظرافت آمیز لہجے میں دو تین بار یہ شعر پڑھا:

اس نقش پا کے سجدے نے کیا کیا، کیا ذلیل

میں گو چڑ قریب میں بھی سر کے بل گیا

میں یہ دیکھ کر خوش ہوتا تھا کہ اُن میں وہ تقشف نہ تھا جو انسان کو پتھر بنا دیتا ہے اور انسانیت کا جوہر انسان سے اُچک لیتا ہے۔

اُن کی ایک بیاض میرے پاس موجود ہے جس میں ایک طرف حافظ، عرفی، فیضی،

نظیری، جامی، گرامی، علی حزیں، قرۃ العین طاہرہ، غالب، اقبال اور دوسرے فارسی اساتذہ کے چیدہ چیدہ اشعار ان کے اپنے ہاتھ سے لکھے ہوئے ہیں۔ دوسری طرف غالب، میر، داس، انشا، سودا، مومن اور دوسرے اُردو اساتذہ کا انتخاب ہے۔ آخر میں اپنے بعض ہم عصر شعراء کا کلام بھی درج کیا ہے۔ یہ انتخاب اُن کے حسن ذوق کی خبر دیتا ہے۔ اس بیاض پر کلام ذوق کے انتخاب کے آخر میں ۱۸ مئی ۱۹۳۲ء نیومنٹرل جیل ملتان لکھا ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ بیاض میں اکثر اشعار عمدہ جانی میں لکھے گئے۔ شعروں کے انتخاب سے اُن کے طبعی رجحان کا پتہ چلتا ہے۔ اشعار ایسے منتخب کیے ہیں جن میں زندگی ہے، رجائیت ہے، فعالیت ہے، بعض بڑے نیکے اور شوخ اشعار بھی بیاض میں لے بعض ظہیں انقلابی ہیں۔ وہ اشعار جن میں زنجیروں، بیرون، قید خانوں اور جہانوں پر لکھے کا ذکر ہے بڑی دلچسپی سے نقل کیے گئے ہیں۔ کچھ عارفانہ کلام بھی بیاض میں درج کیا گیا ہے بعض ایسے شعر بھی بیاض میں لکھے ہیں جن سے حضور اقدس علیہ الصلوٰۃ والسلام سے والہانہ محبت ٹپکتی ہے۔ بیاض کی ضخامت اچھی خاصی ہے۔ اس خرمین کے چند غصے ہمیشہ خدمت ہیں:

انتخابِ کلام میر تقی میر علیہ الرحمہ

کیا بود و باش پوچھو ہو پورب کے ساکنو؛ ہم کو غریب جان کے منس منس پکار کے
 دلی جو ایک شہر تھا عالم میں انتخاب رہتے تھے منتخب ہی جہاں روزگار کے
 اس کو تنک نے لوٹ کے دیران کر دیا ہم رہنے والے ہیں اسی اُجڑے دیار کے

لگانہ دل کو کہیں بھی ماننا نہیں تو نے جو کچھ کہ میر کا اس عاشقی نے کام کیا

پہنچا تو سوہگاسحِ مبارک میں حالِ مہیہ اس پر بھی جی میں آئے تو دل لونکلیئے

یاد اس کی اتنی خوب نہیں میرے باز آ نادان پھر وہ جی سے مٹھلایا نہ جائے گا

جی میں تھا اس سے پیلے تو کیا کیا نہ کیے میرے پھر جب ملے تو رہ گئے ناچار دیکھ کر

کتے تھے اس سے پیلے تو کیا کیا نہ کیے لیک وہ آگیا تو سامنے اس کے نہ آئی بات

دل میں مُسوئے تھے بہت پر حضورِ یار نکلا نہ ایک حرف بھی میسری زبان سے

اُلٹی ہو گئیں سب تدبیریں کچھ نہ دوڑانے کام کیا
عہدِ جوانی ردِ رد کا اپیری میں لیں آنکھیں موند
کس کا کعبہ کیا قبلہ کون ارم ہے کعبِ احرام
میرے دینِ مذہبی اب پوچھتے کیا ہوا نے تو
دیکھا اس بیماری دل نے آخر کام تمام کیا
یعنی رات بہت تھے جاگے صبح ہوئی آرام کیا
کوچہ کے اس کے باشندوں کو کہے ہیں سلام کیا
قتقہ کھینچا، دیر میں بیٹھا، کبلا ترکِ اسلام کیا

زندیاں میں بھی شورش نہ گئی اپنے جنوں کی اب سنگِ مداوا ہے اس آشفتمہ سری کا

شام ہی سے بچھا سا رہتا ہے دل ہے گویا چراغِ مفلس کا

ہمارے آگے ترا جب کسی نے نام لیا دل ستم زدہ کو ہم نے تمام تمام لیا

دل کی دیرانی کا کیا مذکور ہے یہ نگوسو مرتبہ لوٹا گیا

ہم فستیروں سے کج ادائی کیا آن بیٹھے جو تم نے پیار کیا

سخت، کافر تھا جس نے پہلے میر مذہبِ عشقِ اخستہ پیار کیا

وصل و ہجران یہ جو درد منزل ہیں راہِ عشق کی دل غریب ان میں خدا جانے کہاں مارا گیا

اب تو جاتے ہیں تنگدے سے میر پھر میں گے اگر خدا لایا

غیر کے کہنے سے اُن نے ہم کو مارا بے گناہ یہ نہ سمجھا وہ کہ واقع میں بھی کچھ تھا یا نہ تھا

جامہٴ احرام زاہد پر نہ جا تھا عزم میں لیک نامحرم رہا

میرے رونے کی حقیقت جس میں تھی ایک مدت تک وہ کاغذ غم رہا

گر زمزمہ یہی ہے کوئی دن تو ہم صغیر اس فصل ہی میں ہم کو گرفتار دیکھنا

نکٹے گیا، مدینہ گیا، کربلا گیا جدیا گیا تھا ویسا ہی ہل پھر کے آگیا

چمن میں پھولِ تواب کے ہزار گھٹلے دماغ کا شش کر اپنا بھی ٹک نہا کرتا

ب

میری طاعت کو قبول آہ کمان تک ہوگا سب اک بات میں ہے جام ہے اک ہاسک بچ

ر

کچھ ہو رہیگا عشق دہوس میں بھی اندیاز آیا ہے اب مزاج ترا امتحان پر

مرتے ہیں میرے سب پر نہ اس بچی کے ساتھ ماتم میں تیرے کوئی نہ رویا پکار کر

گ

میر بندوں سے کام کب نکلا ماگنا ہے جو کچھ خدا سے مانگ

م

نہ مل میرا ب کے امیروں سے تو ہوئے ہیں فقیران کی دولت سے ہم

ن

دم آفر ہے، بیٹھ جا، مت جا صبر کر ٹھک کہ ہم بھی چلتے ہیں

میر صاحب بھی تھے کوچہ میں شب آتے ہیں بیک جیسے دروازہ گری کرنے کا عادتے ہیں

توار کے تلے ہی گیا عسدر انبساط مر کے ہم نے کاٹی ہیں اپنی جوانیاں

باغبان ہم سے خنونت سے نہ پیش آیا کر عاقبت ناکشاں بھی تو ہیں درکارِ حسین

عشق کا گھر ہے میر سے آباد ایسے پھر خاناناں غراب کسان

عشق کرتے ہیں اس پر یوں سے میرے صاحب بھی کیا دوانے ہیں

و

رات تو ساری گئی سُنتے پریشاں کوئی میری کوئی کھڑی تم بھی تو آرام کرو

ہو گا کسو دیوار کے سایہ میں پڑا میرے کیا کام محبت سے اس آرام طلب کو

مجھ دوانے کی مت ہلا زنجیر کہیں ایسا نہ ہو کہ پھر غل ہو

یوں رفتہ اور بے خود کب تک رہا کر دوں گے تم اب بھی میرے صاحب اپنے تئیں سنبھالو

سرخاکِ آستان پر تمہاری رہا مدام اس پر بھی یا نصیب، جو تم بے وفا کرو

ہے دُور ادب سے تم کھڑے میں پاکشیدہ ہوں مت آئیو جانے کی میری ناز کو

سب میرے کو دیتے ہیں جگہ آنکھوں میں اپنے اس خاکِ رہ عشق کا اعزاز تو دیکھو

۵

اگ تھے ابتدائے عشق میں ہم ہو گئے خاکِ انتہا ہے یہ

خوں بیتہ بائے رہنے لگیں اب تو یہ مرزہ آنسو کی بوند جس سے میکتی تھی گاہ گاہ

ی

دیکھ تو دل کہ جاں سے اٹھتا ہے یہ دھواں سا کہاں سے اٹھتا ہے

یوں اُٹھے آہ اس گلی سے ہم جیسے کوئی جہاں سے اُٹھتا ہے

سراپا آرزو ہونے نے بندہ کر دیا ہم کو وگرنہ ہم خدا تھے گردِ بے مدعا ہوتے

شرط سلیقہ ہے ہر اک امر میں عیب بھی کرنے کو نہیں چاہیے

ناز کی اُس کے لب کی کیا کہیے پنکھڑی اک گلاب کی سی ہے
 بار بار اس کے در پہ جاتا ہوں حالت اب اضطراب کی سی ہے
 میں جو بولا کہ یہ آواز اسی خانہ خراب کی سی ہے
 میرا نسیم باز آنکھوں میں ساری مستی شراب کی سی ہے

کوئی نوحہ ساجھی کاشن سچھ کوٹے مدعا ہم کو انتقام سے ہے

اس کے ابغاٹے عند تک نہ جیے عمر نے ہم سے بے وفائی کی

ہر کوئی اس مقام پر دس روز اپنی نوبت بجائے جاتا ہے

پاسِ ناموسِ عشقِ مہت اور نہ کتنے آنسو پک تک آئے تھے
 میر صاحب رُلا گئے سب کو کل وہ تشریف یاں بھی لائے تھے

کوئی رہنے والی ہے جانِ عزیز گئی گرنہ امروز مسرودا گئی

گلوائے پتھر اور برا بھی کھسا کیے تم نے حقونِ ددستی کے سب ادا کیے

برقع کو اٹھا چہرے سے وہ بُت اگر لے
اللہ کی قدرت کا ناشائستہ آدے
جب نام نزا لیجئے تب چہنم بھر آدے
اس زندگی کرنے کو کہاں سے جگر آدے

چہن کا نام سنا تھا دلے نہ دیکھا ہائے
جہاں میں ہم نے قفس ہی میں زندگانی کی

ہم ہوئے تم ہوئے کہ مہیہ ہوئے
اس کی کونوں کے سب امیر ہوئے

پھر مرج ہوا ایچاں اے میر نظر آئی
شاید کہ ہمارا آئی از تجبہ نظر آئی

گزارشِ فردن میں سمجھ کے کر مجنوں
کہ اس دیار میں میر شکتہ پا بھی ہے

اب کے بھی سیرِ باغ کی جی میں ہوس رہی
اپنی جگہ ہمارا میں کجِ قفس رہی

فقیرانہ آئے صدا کر چلے
میاں خوش رہو ہم دُعا کر چلے
جو تجھ بن نہ جینے کو کہتے تھے ہم
سو اس عہد کو اب وفا کر چلے
کوئی نا امیدانہ کرتے نگاہ
سو تم ہم سے منہ بھی چھپا کر چلے
جہیں سجدے کرتی ہی کرتی گئی
حقِ بندگی ہم ادا کر چلے
پرستش کی یاں تک کہ اے بُتِ تجھے
نظر میں سبھوں کی خدا کر چلے

کرد توکل کہ عاشقی میں نہیوں کو دگے تو کیا کر دگے
الم جو یہ ہے تو درد مند کہاں نہ لگاتے ردا کر دگے

بعد اک عمر کہیں تم کو جو تنہا پایا
ڈرتے ڈرتے ہی کچھ احوال سنا یا ہم نے

مصائب اور تھے پردل کا جانا
عجب اک سانحہ سا ہو گیا ہے

بے مہر و وفا ہے وہ کیا رسم و نفا جانے
الفت سے، محبت سے، مل بیٹھنا کیا جانے

آگے کس کے کیا کریں دستِ طمع دراز
وہ ہاتھ سو گیا ہے سر ہانے دھرے دھرے

پتا پتا بوٹا بوٹا حال ہمارا جانے ہے
جانے نہ جانے گل ہی نہ جانے باغ تو سارا جانے

عالم عالم عشق جنوں ہے دنیا دنیا تممت ہے
دریا دریا روتا ہوں میں صحرا صحرا وحشت ہے

نسبت اس آستان سے کچھ نہ ہوئی
برسوں تک ہم نے جبہ سائی کی

مستی شراب کی سی ہے یہ آمدِ شراب
ایسا نہ ہو کہ تم کو جوانی نشا کرے

موقوف غم میر کہ شب ہو چکی ہمدم
کل رات کو پھر باقی یہ افسانہ کہیں گے

یہ تو یقین چند جھکیاں انتخاب میر کی اب ہم ان کی بیاض سے اردو زبان کے

اساتذہ کے متفرق اشعار نقل کرتے ہیں تاکہ اُن کے شعروادب کے رجحانات کا اندازہ ہو سکے۔

متفرق اشعار

دینا وہ اس کا ساغرے یاد ہے نظام منہ پھیر کر ادھر کو ادھر کو بڑھا کے ہاتھ

کس کس طرح ستاتے ہیں یہ بت ہمیں نظام ہم ایسے ہیں کہ جیسے کسی کا خُدا نہ ہو

مری ٹوٹی ہوئی توبہ کے ٹکڑے کوئی لاوے در سپیر مغاں سے

کہ اُن کو جوڑ کر پھر توڑ ڈالوں میں اک جام شراب ارغواں سے

(نظام رامپوری)

کھٹا نہیں کچھ حال کسے قتل کریں گے بانسے بٹے پھرتے ہیں وہ خجرائی دن سے

ہمیں وہ خط لکھا کرتے تھے پہلے کس تکھ سے بڑا نقاب ہوتا تھا بڑی تمسید ہوتی تھی

داغ کی شکل دیکھ کر بولے ایسی صورت کو پیار کون کرے

(داغ)

مجھے روز اس کے غم میں یونہی ساری ات کرنا کہیں چکے چکے ونا، کہیں دل سے بات کرنا یہ غنی کو کیا ہوا ہے کئی دن سے دیکھتے ہیں نہ کسی کی بات سُنانا نہ کسی سے بات کرنا

(غنی بناری)

رے چل ہاں منجواں میں رے چل، سا مل سا مل کیا پلنا میری خُرد زانہ کو میں غور گُہوں طوفانوں کا

نیم سبل اُس نے گچھوڑا تو کچھ پڑا نہیں
پر یہ غم ہے اعتبارِ دستِ قاتل اٹھ گیا

شیفتہ وہ کہ جس نے ساری عمر
آخر کار نئے پرست ہوا
دینداری و پارسائی کی
شان ہے تیری کبریائی کی

(شیفتہ)

اٹھو صنم کہ سے والو تلاشِ لازم ہے
تمام زادِ سفر راستے میں گٹ جاتا
ادھر ہی لوٹ پڑیں گے اگر خدا نہ ملا
خدا کا فضل ہوا کوئی رہنما نہ ملا
وہ گری کی تنہا وہ رہبروں کا ہجوم

(حفیظ)

مظلوم کی فریاد پہ طیش آتا ہے انکو
کہتے ہیں زبانِ کاٹ کے حال اپنا سا اور

(ناصر حسن پوری)

تو ماڈل کے بس ہیں سر پہ نئے خات سے
دبا دینا کسی مظلوم کی آہوں کو سینے میں
کوڑوں نانوٹوں کی تیناؤں کو ٹھکرا نا
کسی بکس کو ساری عمر آنسوؤں کے رونا نا
ہے جینے دل میں آزادی کی دُھن ان زبوروں
وطن کے عشق کی پاداش میں سُولی پہ ٹکانا
یسا دینا کسی کی راکھ کو تلج کی موجوں میں
کسی کی لاش اٹکے پار خاکِ خوں میں تڑپانا
ملو کیت پرستوں کے لیے سب کچھ یہ آسا ہے
مگر دشوار ہے قانونِ فطرت کا بدل جانا
نوال اس سلطنت کا ٹل نہیں سکتا ہے ٹلے سے
خود اپنی ہی رعایا سے پڑا جو بس کو ٹکرانا
مکاناتِ عمل سے گردہ غافل ہیں تو شبیک ہوں
ہمارا کام تھا نیک اور بد کا اُن کو سمجھانا

(مولانا ظفر علی خاں)

گھر بھرا انگریز کا لندن میں دیکھ آیا ہے تو
چیل کے دہلی میں ہماری خانہ دیرانی بھی دیکھ

(مولانا ظفر علی خاں)

تم ہی سے اے مجاہدِ جہان کو ثبات ہے
شہید کی جہوت ہے وہ قوم کی حیات ہے
تمہاری مشعلِ بدیٰ فروغِ ششِ جہات ہے
تمہاری ضرور سے پڑھنا جہین کا ناسخ ہے
کو اکب بقا ہو تم جہاں اندھیری رات ہے

عبدالحمید سائکت

اے دل کی یانیں کھینچنے والے اکیسے بتائیں کیا دل تھا
اک خاک اور خون کی صورت تھی جو درویشِ دینی ہوتی تھی
باتوں میں کبھی کبھ جاتی تھی اور اب آنکھوں میں کھتی ہے
یہ ات پہاڑی اکن تھا جب کتنی چھوٹی ہوتی تھی
وہ صبح بھی کیا تھی جس کھیلے ہیں ات کی رات تڑپتا تھا
جور لے آئے آتی تھی جو ہوتے ہوتے ہوتی تھی
(فراق گورکھپوری)

رخصت

کبھی میں یاد بھی آؤں تو مت آسنا بہانہ تم
یہی بہتر ہے مجھ کو رفتہ رفتہ بھول جانا تم
مہلا کیا فائدہ اک جی جیسے پر جان کھونے کا
نہ ہونا سوگ میں شامل نہ نوبت ہی پہ آنا تم
نہ کرنا یاد میری دکھ بھری آنکھوں کی مایوسی
تصور میں بھی یہ کلفت فزا منظر نہ لانا تم
جو یاد آئے کوئی اپنی جہاد مست بُرا کرنا
غذا ہے دکھ مری، ناحق نہ جی اپنا دکھانا تم
مری بریادیوں کی یاد میں رہنے سے کیا حاصل
نہ اپنے آنسوؤں کے بے بہا گوہر لگانا تم
مری ہستی کو اک خواب پریشاں فرض کر لینا
گزشتہ صحبتوں کی یاد بھی دل میں نہ لانا تم
مرے اقرارِ اُلفت کو سمجھنا قصتِ باطل
نہ دل کو اب مری حیرت کے افسانے سنانا تم
کوئی اچھا کسے مجھ کو تو سنا بھی نہ بات اسکی
بُرا کوئی کسے تو صدقِ دل سے مان جانا تم

(حامد علی خان)

یا تو خرد کو ہوش کو متی و بے خودی سکھا
یا نہ کسی کو ساتھ لے اسکے حیرم ناز میں
موجِ نسیمِ صبح میں بونے صنم کو بھی ہے
اور بھی جان پڑ گئی کینیتِ ناز میں
شورشِ عندلیب کے رخِ چمن میں پھونک دیا
ور نہ یہاں کلی کلی مست تھی خوابِ ناز میں
(اصغر گونڈوی)

کتاب سے بد نصیب ظفر دفن کے لیے دو گز زمین بھی نہ ملی گونے یار میں
(بہادر شاہ ظفر)

بس یہی نائز پ کے کاٹی رات تم نہ آئے تو کیا حسرت نہ ہوئی

یہ زندگی زندگی نہ سمجھو کہ زندگی سے مراد میں بس وہ عمر رفتہ کی چند گھڑیاں جو نئی صحبت میں گھٹی ہیں

سنا ہے کہ اک آگرہ کا مسافر اٹھائے ہوئے سر پہ ویدوں کے بستے
عراق و عرب میں وہ جب کہ پکارا نئے علیکم، علیکم نئے
(مولانا ظفر علی خاں)

کربانمے ہوئے چلنے کے یاں سب یار بیٹھے ہیں بہت آگے گئے باقی جو ہیں تیار بیٹھے ہیں
رہ چھپائے نجات باد بہاری راہ لگ اپنی تجھے اشکیلیاں سُجھی ہیں ہم بزار بیٹھے ہیں
(انشاء)

خال بھیکیں بھی ہے اور زلف یہ نام بھی ہے مرغِ دل کیوں نہ چھنے دانہ بھی بنے ام بھی ہے

ناصخانوں میں تو اتنا تو سمجھ اپنے کہ ہم لاکھ ناداں ہوئے کیا تجھ سے بھی ناداں ہونگے
پھر بہار آئی وہی دشت نوردی ہوگی پھر وہی پاؤں وہی خار مضیلاں ہونگے
عُمر ساری تو کٹی عشقِ بستاں میں مومن آخری وقت میں کیا خاک مُسماں ہونگے
(مومن)

وہ ہنس ہنس کے نشتر چھو یا کیے ہیں رورو کے دامن بھگوا کیے
(امیر مینائی)

اپنی تصویر پہ نازاں ہو، تمہارا کیا ہے آنکھ زنگس کی دہن خنچے کا حیرت میری

میں اپنی چشمِ شوق کو الزامِ خاکِ دل تیری نگاہِ شرم سے کیا کچھ عیاں نہیں

ظفر آدمی اس کو نہ جانے گا، ہو وہ کیسا ہی صاف منہ و دہکا جسے عیش میں یا دُخدا نہ رہی، جسے عیش میں خوفِ خدا نہ رہا

کچھ زہد نہ معنی شرابِ انگور کیا چہیزِ حرام ہو گئی

(داغ)

ہاتھ نکلے دونوں اپنے کام کے دل کو تھانا اُن کا دامنِ تنہام کے
داغ کے سب حرف لکھتے ہیں جُدا ٹھوٹے کر ڈالے ہمارے نام کے

(داغ)

نشہ پلا کے گرانا تو سب کو آتا ہے مزا تو جب ہے کہ گزروں کو تنہامِ حکایت

(اقبال)

سودا قمارِ حشرق میں خسرو سے کو بہن بازی اگر چہ پا نہ سکا، سر تو کھوسکا
کس منہ سے اپنے آپ کو کتا ہے عشقِ باز اسے رو سیاہ! تجھ سے تو یہ بھی نہ ہو سکا

(سودا)

امیر اس بے وفا دُنیا کی لذت پر نہ تم بلانا بڑی عیار ہے، تمکار ہے ظاہر میں بھولی ہے

(امیر عینی)

آنے والے کسی طوفان کا ڈنارو کر ناخدا نے مجھے ساحل پہ ڈبو نا چاہا

(حفیظ)

تو بہ، تو بہ! شیخِ نبی! تو بہ کا پھر کس کو خیال جب وہ خود کہے کہ پی تھوڑی سی پی میرے لیے

(حفیظ)

تیری جیٹائیں بھی ہستار ہوں، دُعا بھی کروں، تجھی سے رحم کی چلا کے التجا بھی کروں،

یہ دو دو کام تو بس کے مکے نہیں زاہد کہ بُت کدے میں ہوں طاعتِ خلد بھی کروں
(میکش)

یہ بزمِ نئے ہے یاں کو ناہستی میں ہے خودی ہو خود بڑھ کر اٹھالے ہاتھ میں جیسا ہی کاہئے

آہستہ برگ گل بفتاں بر مزارِ ما بس نازک است شیشہٴ دل در کنارِ ما

پنی کے ہم تو چلے جھومتے میمنہ نے سے مجھک کے کچھ بات کسی شیشے نے پیمانے سے
نیچی نظروں سے مری جان مجھے کیوں دیکھا لوگ کچھ اور ہی سمجھے ترے شرمانے سے

دل کو خیالِ یار نے محسوس کر دیا ساغر کو رنگِ بادہ نے پر نور کر دیا
گستاخِ دستیوں کا نہ تھا مجھ میں حوصلہ لیکن ہجومِ شوق نے مجبور کر دیا
(حسرت)

اب تو تیری جفا سے یہ مانگے ہوں میں دُعا ظالمِ خدا کرے کہ کہیں تو لگائے دل
اور جس پہ تو فدا ہو وہ ظالم ہو اس قدر جو مطلقاً ترا بھی نہ خاطر میں لائے دل
آغذیبِ مل کے کریں آہ و زاریاں تو ہائے گلِ پکار میں چلاؤں ہائے دل

تر دامنی پہ شیشخ ہماری نہ بجائیو دامنِ پخوڑویں تو فرشتے وضو کریں
(سودا)

باغباں گلہاں ہوں بلکے رنگ کی بھیجی ہیں ایک کم سن کے لیے
(امیر مینائی)

اس نزاکت میں سُننے کب وہ کسی کی فریاد غنچہ چٹلے تو کسے سر پہ دھمک ہوتی ہے

سے جاتے ہیں ڈرتے جاتے ہیں وہ مائوس سے کم سنی ہے ابھی اس سن میں بھجک ہوتی ہے

کسی کو دیکھ کے ساتی کے ایسے ہوش اٹھے شراب سیخ پہ ڈالی کباب شیشے میں

مے آہ و نالہ سے ڈرا کے ستمگر دیارِ محبت کا ہوں الفتلابی
عمل جب نہیں کچھ نہیں شیخ صاحب فضیلت سپن ہی ہشت تابی

ملنے کا وعدہ منہ سے تو ان کے نکل گیا پوچھی جگہ جو ہیں نے لانا نہیں کے خواب میں

بجڑے کر رہا تھا منبر پر ہم جو پُنجے تو پی گیا زاہد

چاہت کا مزا بعد ہمارے نہ ملے گا ہر شخص سے تم آپ کو گے ہمیں چاہو

(داغ)

نظر لگے نہ کہیں اس کے دست دبار کو یہ لوگ کیوں مے زخم جگر کو دیکھتے ہیں

(غالب)

نظر لگے نہ کہیں اس کے چشم دابرو کو یہ لوگ کیوں مے زخم جگر کو دیکھتے ہیں

بہ ترمیم بیگم مولانا محمد علی قصوری (دہلی)

بدنہ بولے زیر گردوں گر کوئی میری سنے ہے یہ گنبد کی صدا جیسی کئے ویسی سنے

ہو عیب کی خویا کہ ہنر کی عادت مشکل سے بدلتی ہے بشر کی عادت

مُحِبَّتے ہی مُحِبَّتے گا اس گلی میں جانا عادت اور وہ بھی عمر بھر کی عادت

(عالی)

منہ پہ لٹاؤں تو یہ کم ظرف بہک جائینگے بات جو پیر خرابات نے سمجائی ہے

(اسماعیل میرٹھی)

اے درد کھوں کس سے بنا رازِ محبت عالم میں سخن چینی ہے یا طعنہ زنی ہے

(درد)

دل میں ساگنی ہیں قیامت کی شریاں دو چار دن رہا تھا کسی کی نگاہ میں

سرنیک گرم کی حدت کو پوچھو مرے دامن سے اپنی آستیں سے

وفا اس جھانچے پر تم یوں بھی ہے اور یوں بھی
ستیا کچھ فلک نے ہے، ستم کچھ آپ کا بھی ہے
رہیں یہ آرزوئیں یا بکل جائیں برابر ہے
ستم ہو یا کر م دونوں کو کیساں وہ سمجھتا ہے

عذ پر میے دلبر کا کر م، یوں بھی ہے اور یوں بھی
مری آنکھوں میں اشک خوں ہم یوں بھی اور یوں بھی
مرضِ عشق سے پوچھو تو غم یوں بھی ہے اور یوں بھی
سیرائش در جاناں پر غم یوں بھی ہے اور یوں بھی

(مسح الملک شیدا)

پھر اٹھوں گا ابر کے مانند سرد آتا ہوا
موت کے سائے میں رہ کر موت پر چایا ہوا
گھومتا، گھرتا، اگر جتا کو بخت، گانا ہوا
دوڑتا، خم ٹھونکتا، چنگھاڑتا، بچھا ہوا

آج ان ذروں کو بھی نماز اپنی تابانی پہ ہے تیرے در کا نقشِ سجدہ جن کی پیشانی پہ ہے

بیاض میں ٹھجے یہ دیکھ کر کچھ حیرت سی ہوئی کہ ذوقِ تنگ کا انتخاب آپ نے باضابطہ

رولیف وار کیا ہے۔ اس انتخاب میں سے چند اشعار درج ذیل ہیں:
ذوق کے مرنے کی سن کر پہلے تو کچھ رگ گئے پھر کما تو یہ کما منت پھیر کر اچھٹا ہوا

وہ صبح کو آئے تو کروں باتیں میں دوپہر اور چاہوں کہ دن غمور سا ڈھل جائے تو اچھا
ڈھل جائے جو دن بھی تو اسی طرح کروں شام اور پھر کہوں گرا آج سے کل جائے تو اچھا
جب کل ہو تو پھر وہ ہی کہوں کل کی طرح سے گرا آج کا دن بھی یونہی ٹل جائے تو اچھا
القصد نہیں چاہتا میں جائے یہاں سے دل اُس کا نہیں گر چہ بہل جائے تو اچھا

اے ذوق تکلف میں ہے تکلیف سراسر آرام سے وہ ہے تکلیف نہیں کرتا

پردانہ بھی تمنا گرم تپش پر کھلانا راز بلب کی تنگ حوصلگی تھی کہ نفل ہوا

جو حد کی کوتھج پر ہو تو بے یتسیری خوبی کہ جو تو نہ خوب ہوتا، تو وہ کیوں حسود ہوتا

نہ ہوا پر نہ ہوا میر کا انداز نصیب ذوق یاروں نے بہت زور غزل میں مارا

ہر خسستوں کو کرتا ہے بالانشین فلک اُونچی ہے آشیانہ زاغ وز عن کی سناخ

داں سے یاں آئے تھے اے ذوق تو کیا لائے تھے یاں سے تو جائیں گے ہم لاکھ تنالے کر

ان دنوں گر چہ دکن میں ہے بڑی قدر سُخن کون جائے ذوق پر دلی کی گلیاں چھوڑ کر

نہیں خضاب سے مطلب ہمیں یہ محسوس سفید سیاہ پوشش ہوئے ماتم جوانی میں

آج اک پگڑی ہوئی تھی میکے میں رہنے ذوق وہ تیری ہی تارِ فضیلت ہو تو ہو

اے ذوق کسی ہمدمِ دیرینہ کا ملنا بہتر ہے ملاقاتِ میعادِ خضر سے

مزے جو موت کے عاشق بیاں کھجو کرتے مسخ و خضر بھی مرنے کی آرزو کرتے

فارسی کلام کا انتخاب

بیاض میں فارسی شعراء کے سیکڑوں اشعار درج ہیں۔ چند اشعار ملاحظہ کیجیے :

بگیرم دامنِ آلِ سستید لولاک در محشر
کے محشر بر تابد تابِ حسنِ بے مجالش را
قضا گیرد، قدر گیرد، انزل گیرد، ابد گیرد
رکابش را عنائش را عنائش را رکابش را
گرامی در قیامت آلِ نگاہِ مغفرت خواهد
کہ در آغوشِ گیرد جو نمائے بے حسابش را
گرامی مغفور و موعوم

دواع و وصلِ جُدا گانہ لذتے وارد
ہزار بار برو صد ہزار بار بسیا
(حافظ)

حطیم کعبہ شکست و اساسِ قبلہ بر نیت
بتازہ طرح یکے قصر بے قصور نسیم
عذو طاقِ حرم تا بچند مصلحت است
کہ داغِ عشق بہ پیشانیِ غرور نسیم
(فیضی)

فیضی گماں مبر کہ غمِ دلِ نگفتہ ماند
اسرارِ عشقِ آنچہ تو ال گفت گفت ایم

ز عاشقانِ جہاں غیر مانماند کسے
بیار بادہ کہ ماہم غنیمتیم بسے

گر بہ تو افتدم نظر چہ بہ چہ روبرو
شرحِ دہم غمِ ترا نکتہ بہ نکتہ مو بہ مو
از پئے دیدنِ رخت ہم چو صبا فتادہ ام
خانہ بجانہ در بدر کوچہ بہ کوچہ کو بہ کو
سے رود از فراقِ تو خونِ دلِ از دو دیدم
دجلہ بہ دجلہ ہم بہ ہم چشمہ بہ چشمہ جو بہ جو

در دل خویش طاہرہ گشت و ندید حبز ترا صفحہ بہ صفحہ لابلہ لا، پردہ بہ پردہ توبہ تو
(قرۃ العین طاہرہ)

مے خدوم مے گرم پچوں گل بہ پیش بنم مے سوزم مے سازم چوں خون بہ کباب اند

سوز دل پروانہ مگس رانہ دہند سرد غم عشق بوالہوس رانہ دہند
ایں دولت سرد کھیس رانہ دہند
(سرد)

زادہ بہ زن فحشہ گفتا مستی از خیسستی و بہ شرچوستی
زن گفت چناں کہ مے نمایم ہستم تو نیز چناں کہ مے نمائی ہستی
(خیام)

مے خور کہ شیخ و حافظ و مفتی و محتسب چوں نیک بنگری ہمہ تزیویری کھند
(حافظ)

انساں کشید بار امانت نگہ کنسید مارا بایں گیواہ ضعیف ایں گھاں نہ بود

شب ہائے وصل دگر شدہ چشم عنایتے مایم و زلف یار و مسل حکایتے
ہاں و اسی بہ نکتہ مضمون باغ حسدہ خوانی اگر نہ معصفت رخسار آیتے
عصیان مادر حمت پروردگار ما ایں رانہایتے است نہ آں رانہایتے
از چشم قنہ مست کہ خونریز عالم است مضمون دار و گیسر قیامت دایتے
عقل بہانہ جو سپہر افگت و دم گرفت در عرصہ کہ عشق علم کرد رایتے
تا چند امتحان توافل! تبسمے دیرینہ بندہ ایست گرامی، رعایتے
(گرامی)

تراناداں امیدِ غمِ گساری ہا زافرنگ است
 دلِ شاہیں نہ سوزد بہر آں مرغے کہ در چنگ است
 پشیمان شو اگر بعلے زیرِ است پدیر خواہی
 کجا عیش برون آوردن بعلے کہ در رنگ است
 دریں میخانہ برینا زہیم محتسب لرزد
 مگر یک نشیئہ عاشق کہ از فے لڑہ برنگ است

جان پدیر تو سفرہ بے ناں نہ دیدہ
 جنگ عیال و گریہ طغیان ندیدہ
 نہ نشیئہ بگوشہ تو از بیم قرضِ خواہ
 ناگہ زدر در آمدہ مسلمان ندیدہ

جواب

بابا مگر تو کاکل پیچساں نہ دیدہ
 چشم سیاہ و زلف پریشاں ندیدہ
 نہ نشیئہ بگوشہ تو در انتظار یار
 ناگہ زدر در آمد حبانان ندیدہ

دیگر جواب

اے جانِ جان تو گردشِ دورانِ ندیدہ
 آزار بند کاکل و مزنگان ندیدہ
 آگہ نہ ز شیبوہ جو رو جفائے یار
 چشم پر آب و سینہ بریاں ندیدہ

جواب الجواب

واماندہ بصحبتِ سپیراں مرادِ دل
 عیش و نشاطِ محفلِ رنداں ندیدہ
 آگہ نہ ز شیبوہ مردانِ راو عشق
 صبر و ثباتِ عاشقِ بے جاں ندیدہ

نہالِ سرکش و گلِ بے وفا دلالہ دورنگ
 دریں چمن بچہ امید آشتیاں بنم
 عرنی

خاور چکداز شہم بہ این تیسر شبی
 کوثر چکداز لبم بایں تشنہ لبی
 اے دوستِ ادب! کہ در جویم دل ہاں
 شاہنشہ انبیاء علیہم السلام عرنی
 (گرامی)

مرا کے مے فروش آں بیخودی نیست
مگر دریاہ آسے کردہ باشی

واعظاں کیں جلوہ بر محراب دمبزی کنند
بچوں بخلوت می روند آں کار دیگر می کنند
مشکلے دارم زدانشمد مجلس بانہ پر کس
تو بہ فرما باں پرا خود تو بہ کمتر می کنند

ریا حلاں شمارند و جام بادہ ندام
نہے طریقت و ملت نہے شریعت و کین
(حافظ شیرازی)

اے ترک غمزہ زن کہ مقابل نشسته
در دیدہ ام غایبہ و در دل نشسته
آرام کردہ بہنساں خانہ دلم
خلقے دریں گھاں کہ بہ محفل نشسته
(فیضی)

ہلا زمان سلطان کہ رساندیں دُعا را
کہ بشکر پادشاہی ز نظر مراں گذارا
چہ قیامتست جاناں کہ بہ عاشقان نمودی
رُخ چہ چو ماہ تاباں دل بچو تنگ خارا
دلِ عالمے بسوزی چو عذار بر بن موزی
تو ازین چہ سود داری کہ نمی کنی ملارا
ہمہ شب دریں امیدم کہ نسیم صبح گاہی
بہ پیام آتشے بنواز و آشنارا
(حافظ)

حکم عشق است کہ از اہل ریا بگریزم
آہنچہ بر شیخِ عدل است عوام است این جا
(گرامی)

کارِ من آفرشد و آفر ز من کاسے نہ شد
مشق خاکِ من غبارِ کو بیہ یاسے نہ شد
سالماتونِ جگر در ناف آہوشد گرہ
منگ شد اما چہ شد خالِ رخ یاسے نہ شد

سالماد دل طلبِ جامِ جم از مامے کرد
آہنچہ خود داشت ز بیگہ تر متامے کرد

میارا بنیم بر سائل کہ آنجا
 نولے زندگانی نرم نہیں دست
 بہ دریا غلطد با مویشی در آریز
 حیات جادواں اندر سیز است
 (اقبال)

گفتنم کہ نمی آئی، آری و نعم گوئی
 انکار در اقرارے اقرار در انکارے
 بس جرم گزی نیست، جز کاہلی و پیری
 دیرینہ غلامے را مفروش بہ بازارے
 (گرامی)

شیخیم، مقسیم، غازی مایم
 از راہ نشینانِ حجازی مایم
 (گرامی)

فرصت اگر ت وقت دہد مغتم انکار
 ساقی و معنی و شرابے و سردے
 ز سار ازاں قوم نباشی کہ نہ بیند
 حق را بسجودے و نبی را بہ دردے

تو بہ کارے کہ نمی آئی
 بہ کمارے کہ نمی آئی
 بہ چہ امید میتواں مُردن
 بہ مزارے کہ نمی آئی

دوانِ نچنگ، دکلِ سنِ تو بیار
 گلِ چین بہارِ تو ز داماں گلہ دارو

ریگِ عراق منشور کشتِ حجاز تشہ کام
 خونِ حسین بازوہ کوفہ و شامِ خویش را
 (اقبال)

در مدرکے کس را نہ رسد دعویٰ توجید
 منزلِ گہ مردانِ موحد سیر دار است

عشقِ رسوائیت جامی یا بخواباں دل نہ
 یا بکلی کہ عرفان نام دنگِ خویش را
 (جامی)

دوستاں منخ کندم کہ چرادل بہ تو دادم
باید اول بہ تو گفتن کہ چنیں خوب چرائی
(سعدی)

حاجی بٹوئے کعبہ رود از بجائے حج
یارب! بود کہ کعبہ بیاید بسوئے ما

دیدم کہ خونِ ناسخ پر دانه شمع را
چندیں اماں نہ داد کہ شبِ اسحر کند

اگر حقیقتِ اسلام در جہاں این است
ہزار خندہ کفر است بر مسلمان

دردِ مادامی و درمانی ہنوز
جاں زتن بروی و در جانی ہنوز
(خضو)

اے تیر عنق را دلِ عشاق نشاند
گر مکتفِ مسجد و گساکنِ دیرم
نطقے بتو مشغول و تو غائبِ زمیانہ
یعنی کہ ترا مے طلبم خانہ بحسانہ
(ابوالفضل)

ستم است کہ ہوست کشد کہ بہ سیرِ سوسن در آ
پئے ناذہائے رمیدہ بو، پسند زحمتِ جستجو
توز غنچہ کم نہ دمیدہ در دلِ کتابہ چمن در آ
بہ خیالِ علقہ زلفِ او اگر ہے خور و بخشن در آ
(بیدل)

اے سبیلِ اگر نالی، من با تو ہم آوازم
تو عشقِ گلے داری من عشقِ گلِ اندام
(سعدی)

دلِ بدست آور کہ حجِ اکبر است
کعبہ بنگاہِ جلیلِ آذر است
از ہزاراں کعبہ یکبِ دل بہتر است
دلِ گزر گاہِ جلیلِ اکبر است

میکند شعله سرے از دل صد پارہ ما جوش آتش بود امروز بفتاورہ ما

صد خار بہ دامنم در آویخت از بہر گلے کہ چیدہ ام من

(تبسم)

لے آبتار! نوحہ گرا زہب کسیتی چہیں بر جہن نگندہ از اندوہ کسیتی
آیا چہ درد ہست کہ چوں من تمام شب سرا بہ سنگ مے زدی و مے گریستی

(غنی)

آدم از بے بصری بندگی آدم کرد گوہرے داشت و لے تذقیہ وادجم کرد
یعنی از خئے غلامی رنگاں خوار تر است من نہ دیدم کہ سگے پیش سگے سر خم کرد

(اقبال)

گر یزد از صف ماہر کہ مرد غوغانیت کسے کہ گشت نہ شد از قبیلہ مانیت

(ظہیری)

بہ ملک جم نہ دہم مصرعہ ظہیری را کسے کہ گشت نہ شد از قبیلہ مانیت

(اقبال)

تا نشانہ صفت سرنہی در تہ آرہ ہرگز بہر زلف نگارے نہ رسی
تا نثل جنا سودہ نہ گردی نہ سنگ ہرگز بہ کف پائے نگارے نہ رسی

(غنی)

لے مرغ سحر عشق ز پردانہ بیاموز کاں سوختہ را جاں شد و آواز نیامد
این مدعیان از خبرش بے خبر اند آں را کہ خبر شد خبرش باز نیامد

(سعدی)

طاق ابروے تو شد قبلہ و من سر بسجود چشم بدو در کہ ہم بہ نمازے عجبے

چہ نسبت است برندی صلاح و تقویٰ را
سماح و عطف کجا، ہنمہ رباب کجا
چو کحل بینش ما خاک آساں شہاست
کجا رویم بغرمازیں جناب کجا

اگر آں ترک شیرازی بدست آرد دل مارا
بہ ساقی مے باقی کہ درخت سخا ہی منت
ز عشق ناتمام ما جمال یا مستغنی است
حدیث از مطرب وی گو و راز دہر کمتر جو
بدم گفتی و فرسدم عفاک اللہ نگو گفتی
بخال ہندوشش بخشم سمرقند و بخارا را
کنا رآب رگنا بود گلگشت مصلیٰ را
باب رنگ خال مخط چہ حاجت زیبا را
کہ کس نکشود و نکشاید نکست این معما را
جواب تلخ می زبید لب لعل شکر خارا را

دوش از مسجد سوئے میخانہ آمد پیرما
چسیت یاران طریقت بعد ازین تدبیرما
ما مریداں رو بسوئے کعبہ چوں آریم چوں
رو بسوئے خانہ خمار دارد و سپیرما

حافظا مے خورد برندی کن و خوش باش
دام تزویر ممکن چوں دگران قرآن را

صبا بلطف بگو آں عنزال رعنا را
غور حسن اجازت مگر نداد اے گل
بحسن خلق تو اں کرد صیدا بل نظر
چو با حبیب نشینی و بادہ پیمائی
جز ایں قدر نتوان گفت در جمال تو عیب
کہ سر بکوه و بیابان تو دادہ مارا
کہ پرستہ نکنی عند لب شیدا را
بہ بند و دام نگیرند مرغ دانا را
بیاد آں حر لہیان بادہ پیمارا
کہ خال مہر و فانیت روئے زیبا را

مہر راز دل شیدائے خویش
کس نمی بیستم ز خاص و عام را

خدا گواہ کہ گجریم ماہیں عشق است گناہ گبر و مسلمان بہ جرم ما بخشد

آن کس کہ ز غوغا نہ رہد دلے بُرد بر خلقِ جہاں دل بہد وائے بُرد
در دستِ فقیر نیتِ نقدے بُرد وقت آن نیز گزار دستِ دہد وائے بُرد

اندکے پیش تو گفتیم غمِ دل ترسیم کہ دل آزرده شوی ورنہ سخن بیارست

ہم کعبہ و ہم بُت کہہ سنگِ رہ ما بود رفیقیم و صنم بر سرِ محراب شکستیم

تا کے ملامتِ قرۃ اشکبارِ من یک بار ہم نصیحتِ چشمِ سیاہِ خویش

درخمنِ صد زہد و عاقل زند آتش آن داغ کہ ما بردل دیوانہ نہادیم

انتخاب کلام حافظ شیرازی رحمۃ اللہ علیہ

آسائش دو گیتی تفسیر این حرف است باد و ستاں تملطف بادِ ستاں مدارا
دُر کوئے نیک نامی ما را گز زندا دند گر تو نمے پسندی تغییر کن قنارا
آن تلخوش کہ صوفی ام الجبائش خوند اشھی لنا و اعلیٰ من قبلتہ العذارا

ما در پیالہ عکسِ رنجِ یار دیدہ ایم اسے بے خبر لذتِ شربِ مدام ما
ہرگز نمیر و آنکہ دلش زندہ شد عشق ثبت است بر جہریدہ عالم دوام ما

نختہ بر سنجاب شاہی نازینے راچشم
گر ز خار و خار سازد بتر و بالین غریب

تو و طوبی و ما و قامت یار
فکر ہر کس بقدر ہمت اوست
من و دل گرفتہ شدیم چہ پاک
فرض اندر میان سلامت اوست
گر من آلودہ دامن چہ عجب
بہم عالم گواہ عصمت اوست

ہر چہ ہست از قامتِ ناسا و بے اندام ہست
ورنہ تشریف تو بر بالکے کس کوتاہ نیست
بندہ پیر خراباتم کہ لطفش دائمست
ورنہ لطف شیخ و زاح گاہ ہست و گاہ نیست

سحر کرشمہ و وصلش بخواب میدیم
زہے مراتب خوابی کہ بہ ز بیداری ست
جمال شخص ز چشمت زلف عارض خمال
ہزار کلمتہ درین کار دبار دلداری ست

اگر چہ عرض ہنر پیش یار بے ادبی ست
زبان غموش و لیکن وہاں پراز عربی ست
پری ہنفتہ رُخ و دیو در کمر شدہ و ناز
بسوخت عقل ز جیت کہ این چہ بواجبی ست
ازین چین گل بیچار کس پنجد آرسے
چارخِ مصطفوی باشد اربوبہی ست
حسن زہرہ بلالک از جیش صہیب از روم
ز خاک کتا ابو جہل این چہ بواجبی ست
مباش در پئے آزار و ہر چہ خوابی کن
کہ در شریعت ما غیر ازین گنہے نیست

وقت عزیر رفت بیاتاقضا کنسیم
عمرے کہ بے حضور صراحی و جام رفت
زاہد غرور داشت سلامت بندوراہ
رند از رہ نیاز بدار السلام رفت

حافظ ازبادِ خزاں در چمنِ دہرِ مرغِ فکرِ معقول بفرما، گلِ بے خار کجاست

بس تجربہ کر دیم دریں دیرِ مکاناتِ بادِ روکشاں ہر کہ در افتاد بر افتاد

سرِ خدا کہ عارف صادق بکس تکفیت
یارِ ب کجاست محرمِ رازے کہ بیکزماں
حافظ و طیفہ تو دعا گفتن ست و بس
در جہت تم کہ بادہ فروش از کجا شنید
دل شرح آں دہد کہ چہ دید و چہ شنید
در بند آں مباحث کہ نہ شنید یا شنید

برزینے کہ نشانِ کفِ پائے تو بود سالما سجدہ صاحبِ نظران خواهد بود

قد آ منعتہ با گل نہ علاجِ دلِ ماست بوسہ چند بیا میزد بپشتنامے چند

دلا بسوز کہ سوزِ تو کار ہا بکشد دُعلے نیم شبی دفع صد بلا بکشد

صد ملکِ دل بہ نیم نظر بیتواں خرید
قوسے بجد و جد گرفتند وصلِ دوست
می خورد کہ شیخ و حافظ مفتی و محتسب
خواباں دریں معاملہ تقصیر می کنند
قوسے دگر حوالہ بہ تقدیر می کنند
چوں نیک بگڑی ہمہ تزویر می کنند

شکرا بزرگ میانِ من و او صلح فتاد حوریان ز قص کنان ساعرِ سخنانہ زودند

دوش وقت سحر از غصہ سخاتم دادند وندران طلمتِ شب آبِ حیاتم دادند

بے خود از شعشعہ پرتو ذاقم کردند
 چه مبارک سحرے بود و چه منہ خندہ شبے
 بچوں من از عشق رخس بے خود و حیراں گشتم
 من اگر کام روا گشتم و خوش دل چه عجب
 کیبیا نیت عجب بندگی پیر مغاں
 این همه قند و شکر کز سخنم می ریزد
 باوہ از حبا م تجلی بصفت تم دادند
 آن شب قدر کہ این تازہ براتم دادند
 خبر از واقعہ لاست و ماتم دادند
 مستحق بودم و این با بزکاتم دادند
 خاک او گشتم و چندین در جاتم دادند
 اجر صبریت کز ان شاخ نباتم دادند

دیریت کہ دلدار پیامے نفرستاد
 نوشنت کلامی و سلامی نفرستاد

دی پرے فروش کہ ذکرش بخیر باد
 حافظ گرت ز پند یکیمان ملالت است
 گفتا شراب نوش و عشم دل بر زیاد
 کو تہ کنیم قصہ و عمرت در از باد

دست از طلب ندارم تا کام من بر آید
 ہر دم چوبے و نمایاں نتواں گرفت یاری
 یا جاں رسد بجاناں یا حباں زرق بر آید
 مائیم و آتاش تا جاں زرق بر آید

نگار من کہ بکنتب ز رفت و خط نوشنت
 بغزہ مسئلہ آموز صد مدرس شد

من ارچہ عاشقم و رند دست و نامر سیاہ
 میں حسیب گدایان عشق را کایں قوم
 ہزار شکر کہ یاران شہد بے گنہت
 شہان بے کم و خروان بے کلا اند

ہر ہم رسیدہ جام تو بیا کہ زندہ مانم
 پس ازاں کہ من نہ مانم بچکار خواہی آمد

کشتی که عشق دارد و گذارد بدین سال
 بہ آہوان صحرا سر خود نہادہ برگف
 بہ جازہ گردن آئی بہ مزار خواہی آمد
 بہ امید آن کہ در نوس بہ تکار خواہی آمد

صبا بہ تہنیت پیرے فروش آمد
 ہوا میس نفس گشت و بادہ ناف کش
 کہ موسم طرب و عیش و ناز و نوش آمد
 درخت سبز شد و مرغ در غوش آمد
 کہ غنچہ غرق عرق گشت و گل بچوش آمد
 نور لالہ چہل بر فروخت باد بہار

غلام نرگس مست تو تا جدار اند
 ترا صبا و مرا آب دیدہ شد نماز
 و گردنہ عاشق و مستوق را ز دار اند
 کہ از تطاول زلفت چہ سوگوار اند
 کہ غم لیب تو از ہر طرف ہزار اند
 مرد و بصومعہ کا نچا سیاہ کار اند
 کہ بستگان کند تو رستگار اند
 نہ من بران گلِ مراض غزل پریم و بس
 بیا بہ میکدہ و چہرہ ارغوانی کن
 خلاص مافظ ازاں زلف تا بدار مباد

حافظ صبور باش کہ در راہِ عاشقی
 ہر کس کہ جاں نہاد بجاناں میرسد

خبر بلبل این باغ پرسید کہ من
 نالامی ششوم کہ تھنے می آید

نہ ہر کہ چہرہ برافروخت دلبری داند
 نہ ہر کہ طرف کدکچ نہاد و تند نشست
 نہ ہر کہ آئینہ دارد و سکن درمی داند
 کلاہ داری و آئین سردوری داند
 نہ ہر کہ سربترا شد و تلسد ری داند
 ہزار نکتہ باریک تر ز تو این جا است

تو بندگی چو گدایاں بشرط مزد ممکن کہ دوست خود روش بندہ پروری داند

ناز پرورد تنہم بند راہ بدوست عاشقی شیوہ زندانِ بلاکش باشد

ازیں ایفوں کہ ساقی درے انگند حرعیناں را نہ سرماند نہ دستار

بیاناگل برافتانیم ومی در ساغر اندازیم فلک راستغف بشکافیم و طرح نودر اندازیم
اگر غم لشکر انجیزد کہ خون عاشقان ریزد من وساقی ہم سازیم و بنیادش بر اندازیم
چو در دست رھے خوش بزن مطرب دے خوش کہ دست آشاں غزل خوانیم و پاکویاں بر اندازیم
بیاجاناں منور کن ز رویت مجلس مارا کہ در پیشیت غزل خوانیم و در پایت بر اندازیم

در خراباتِ مغال نورِ خدایے بیستم دینِ عجب ہیں کہ چو نورے ز کجائے بیستم
سوزِ دلِ انگِ روانِ آہِ سحر نالہ شب این ہمہ از اثرِ لطفِ شامے بیستم
دوستانِ عیبِ نظر بازی حافظِ مکنید کہ من اورا ز مہمانِ خدایے بیستم

نزدیک تر تم و با شاہد دے ہم صحبت نتوانم کہ دگر حیلہ و تزویر کنم

ناموسِ چند سالہ اجدادِ نیک نام در راہِ جامِ وساقی مہ رو نہادہ ایم

لالہ ساغر گیر و ز گس مت و بر نامِ فق داوری خواہم دے یار بیکرا داور کنم

ابہما زاہد شربت زکلاب و قدست قوتِ داناہم از خونِ جگرے بیغم

من از چشمِ خوشِ ساقی خراب افتادہ ام بکین بلائے کز حبیب آمد ہزارشس مرجا گفتم

شمعِ دگل و پروانہ و بلبل ہمہ جمعند اے دوست! بیمارِ جسم بہ تنہائی ماکن

بچوں عمر تہہ کرم چسند انکہ ننگِ کرم در کنجِ خراباتی اذتادہ خراب اولی

حافظا عادتِ خوباں ہمہ جورست و جفا تو کہ زین طائفہ امید و فامی داری

بیا حافظہ بہ پند تلخ کن گوشش چہ عمرے بغفلت مے گزاری

بفراغِ دل زمانے نظرے باہر ہئے بہ ازا کہ چتر شاہی ہمہ روز ہاد ہونے

دے بکلبہ احزان عاشقاں آئی شبے انیسِ دلِ سوگوار من ہاشی

اس بیاض کے علاوہ حضرت والد علیہ الرحمہ کے کتب خانے سے ایک نوٹ بگ ملی ہے جس میں نظیری پیشاپوری کی غزلیات کا انتخاب ہے۔ بیاض میں بھی اور اس نوٹ بگ میں بھی تمام اشعار حضرت نے اپنے قلم سے لکھے ہیں۔ چند ٹیپ کے شعر نقل کیے جاتے ہیں۔

گونی بید و اسطہ در گوش خاکیکے رازے کزاں خبر بنود جبرئیل را

دردیش و باد شہ بوجود تو قائم آمد خورند کردہ تو عزیز و ذلیل را

ساقی بشود ورنہ کئی امید و بیم را
 ساقی بیک نغمہ غنی کن دل فقیر
 بنام با حقیقت رنگِ قدیم را
 جز احتیاجِ تحفہ ندیدم کریم را
 از آبِ عذوقِ شری کتابِ سقیم را
 روزگاہِ جُرمناہ نظیرِ سی بر آورد

طاعتِ مانیست غیر از درزشِ نپدار ما
 از شمیمِ گلِ دماغِ ما پریشانی مے شود
 بہت استغفارِ ما محتاجِ استغفارِ ما
 برنئے تا بد دمِ جیسے دلِ بسیارِ ما
 شبِ نئے سوزد چراغِ از پستی دیوارِ ما
 خانہٗ ما خاکساراں بر سر راہِ صباست

خورشیدِ عمر بر سر دیوار و خفتہ ایم
 در پیری از ہزار جوانِ زندہ دلِ تیرم
 فریادِ از درازیِ خوابِ گرانِ ما
 صد نوبہا رنگِ برود بر خزانِ ما
 در حیرتِ کم کہ غنچہ بہ ببل چگونہ گفت
 بنیادِ ما حسدِ بی ما استوار کرد
 گونی کہ سودِ ماست نظیرِ زبانِ ما
 کا ندر فائے ماست بعتِ او دوامِ ما
 خود را بر ہنہ بر صفتِ شتیر مے زینم

گر رود عشقِ از مزاجِ پیر لذت کے رود
 سرگزشتِ عیدِ گل را از نظیری بشنود
 بوئے مے باقی بود گر لبِ کسنی پیمانہ را
 عندیبا آشفتمہ ترمی گوید ایں افسانہ را

کجا بودی کہ انشب سوختی آزرده جانے را
 جراحتم ہمدراحت شد از سادستِ عشق
 بقدرِ روزِ محشرِ طولِ دادی ہرزمانے را
 گلے کہ در رہِ من بکنڈ ز خارِ من ست

فرض و سنت تماشائے تو از یادم رفت پرده بر رُشے فُکنِ یازمن ایماں مطلب

شورِ چین ز نغمہ آزادیِ مہرِ دست روئے شگفتہ سحر از شادیِ من ست

جز محبت ہرچہ بر دم سود در محشرِ داشت دین و دانشِ عرضِ کرم کس بچینے بر داشت

شبِ سیاہ صبحِ سفید مے آمد چراغِ مطلب از دودِ مانِ بولہبی است

یکے بگویر عزیزانِ شہریے کن ہیں کہ نقشِ المہا چہ باطل افتادہ است

نالہٴ مانتہ اہلِ نوارا گرم ساخت شوقِ ماہنگامہاں بجز ارا گرم ساخت

گر دس تو گشتن و مردن گناہِ من دیدنِ ہلاک و رحمِ خوردنِ گناہِ کسیت
چوں بگذرد نظیریِ خونینِ کفنِ بخشہ نخلتے فغانِ کند کہ این داد خواہ کسیت

از حجابِ امشبِ نظیریِ باوہ بر سجادہ رحمت پارسا آدابِ مے خوردنِ نمیداند کہ چسیت

بر طرازِ زندگیِ قاستِ موزوںِ نازم یک قبائلیت کہ شائستہ اندامِ تو نبیت

چشمِ بر فیضِ نظیریِ ہمہ خواہاں دارند کاسہ در پیشِ گدا داشته سلطانے چند

تو خلی خوش نثر کیتی کہ باغ و چین ہمہ ز خویش بیدند و در تو پیوستند

ز شرح قصہ مارتہ خواب از چشم خاصا زنا شب آخر گشتہ و افسانہ از افسانہ می نیند

در اشتیاق تو چنداں صنم صنم گفتم کہ شدہ سار ز خود زاہد و برہن شد

عبادتِ سحری را مکن نظیرِ سی کم کہ ہر چہ کرد و دغا ہائے صبحکامی کرد

باعثِ راندنم از بزمِ بجز عار نبود در نہ کس را بمن و بودن من کار نبود
نالہ از ہر رہائی ٹھکنہ مرغِ اسیر خورد و افسوس زمانے کہ گرفتار نبود

مریضانِ دیارِ عشقِ خوش بیمارِ یے دارند کسے دار و نئے خواہد کسے مرہم نئے گیرد

سحر بیتے معنی میسرودان تو بیاد آمد چنان شو کسے بر آوردم کہ وقتِ دستاں گشتہ
اگر پُرسد کسے حالِ نظیرِ سی را بگوئیدش کہ در دہا است آن مرغے کہ شب از آتیاں گشتہ

در جوانی متکلف گشتم بہ پیری کو چہ گرد آنچہ در خلوت ندیدم در گزرے یا ہمیش

کفر و ایماں از برونِ پردہ اند تو درونِ پردہ با خاصاں برقص
راہِ زین شورش بمقصد میرسد ہچو کشتی بر سر طوفان برقص
دوش در یک بزم با داتا سحرے خوردہ ایم نرگسِ محسورہ او بین دختارِ ما پیرس

دارالعلوم تقویۃ الاسلام

دینی درسگاہوں کا قیام اور علمائے حق کی مساعی
عربی دینی مدارس کے اثر کو زائل کرنے کی کوشش

آج دینی درسگاہوں کی اشد ضرورت ہے
مدرسہ غزوفیہ کی تاریخی حیثیت

حضرت والد علیہ الرحمہ کا دور

دارالعلوم اور ۱۹۴۷ء کا خرمین انقلاب

لاہور میں دارالعلوم کا دوبارہ اجراء

حضرت والد علیہ الرحمہ کے بعد

مکتبہ غزوفیہ

شام کی کلاسیں

اساتذہ کرام

مشہور تلامذہ

تقسیم مکتبہ بعد دارالعلوم تقویۃ الاسلام کی دو سالہ رپورٹ اور گوشوارہ بابت ۲۸-۱۹۴۷ء و ۲۹-۱۹۴۸ء چھپا۔ اس کے شروع میں حضرت والد علیہ الرحمہ نے ایک مفصل مضمون لکھا جس میں دینی درسگاہوں کی ضرورت اور اہمیت کو اجاگر کیا اور مدرسہ غزنویہ کی تاریخی حیثیت پر روشنی ڈالی۔ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ دارالعلوم کا تعارف کرانے کے لیے حضرت والد علیہ الرحمہ ہی کے اس مضمون سے اقتباسات نقل کیے جائیں۔

”آج پاکستان اور ہندوستان میں اسلامی تہذیب کے کچھ باقیات صالحات اگر موجود ہیں تو یقیناً وہ صرف علماء کرام اور عربی درسگاہوں کی بدولت موجود ہیں، اگر سوائے ۱۸۵۷ء کے انقلابی دور کے بعد چھوٹے بڑے عربی مدارس قائم نہ ہو گئے ہوتے اور اللہ تعالیٰ کا بے پایاں فضل و کرم اور اس کی تائید و نصرت ان علماء ربانیین کے شامل حال نہ ہوتی جنہوں نے زمانہ کے ہر طرح کے نامساعد حالات کے باوجود مسجدوں کی چار دیواریوں اور گھاس پھوس کے جھونپڑوں میں بیٹھ کر کتاب و حکمت، قرآن و حدیث کے درس و تدریس کا سلسلہ شروع کر دیا تھا تو آپ دیکھتے کہ ہماری اسلامی تہذیب کب کی انگریزی یونیورسٹیوں کے ذریعہ خاتون (کالجوں) میں ذبح ہو چکی ہوتی۔ اور ڈھونڈنے سے بھی کہیں اس کا سراغ نہ ملتا۔ یہ عربی مدارس اور ان کے فیض یافتہ طلباء اور علماء کا ہی فیضان ہے کہ اسلامی تہذیب و تمدن کے لیے محبوبیت اور شعائر اسلامی کے لیے جذباتِ احترام

کم از کم عوام میں باقی رہ گئے۔

۱۸۵۷ء کے بعد کا دور مسلمانوں کے لیے بڑا صبر آزما تھا۔ انگریز کو معلوم ہو گیا تھا کہ ہندوستان کا مسلمان انگریز سے سخت نفرت کرتا ہے، اس لیے اُس نے مسلمانوں کو کچلنے کی پالیسی اختیار کی جس کی تفصیل بڑی دردناک ہے مگر یہ پالیسی کامیاب نہ ہوئی جس قدر ظلم کے سہارے مسلمانوں پر توڑے گئے، اسی قدر ان کی نفرت بڑھتی گئی۔ اس صورت حال نے انگریز کو پریشان کر دیا۔ ہندوستان میں ایک پائیدار حکومت کے قیام کے لیے اب انگریز کو ضرورت محسوس ہوئی کہ مسلمانوں کے قلعہ دل کو متحرک کیا جائے، چنانچہ مسلمانوں کو انگریزی پڑھنے کی ترغیب دی گئی۔ ملازمتوں کا لالچ، عہدوں کی تحریریں، خطابات کا شوق، خوشحالی کی طمع، حکومت کے الطاف و عنایات سے بہرہ اندوز ہو کر آرام کی زندگی بسر کرنے کی ترغیب، عرض یہ اور اسی قسم کے کئی ایک حربے مسلمانوں کے دل کو غلام بنانے کے لیے اختیار کیے گئے۔ دوسری طرف اسلام سے بدظن کرنے کے لیے عیسائی مشنریوں کی خدمات حاصل کی گئیں اور مسلمانوں میں محبت کی درپردہ امداد کے ذریعے عیسائیت کی تبلیغ کا کام شروع کر دیا گیا۔

دینی درسگاہوں کا قیام اور علمائے حق کی مساعی

ہندوستان میں اسلام کے حفظ و بقا کے لیے یہ نہایت نازک وقت تھا۔ یہ علمائے حق کا ہی مقدس گروہ تھا جس نے اس نازک ترین دور میں حالات کی یکسر ناصحت کے باوجود، ایک طرف انہوں نے اپنے علم و عمل اور زبان و قلم سے عیسائی مشنریوں کے فتنہ کا مقابلہ کیا اور دوسری طرف علوم کتاب و سنت کے لیے ایسی درسگاہیں قائم کیں جن میں تمام ہندوستان کے اطراف و کفاف سے تلمیذان علم کمال کشاں آنے لگے اور ان دینی مدارس کے چشمہ ہائے نہایت و بعیرت سے سیراب ہو کر ابر رحمت بن کر گھروں کو اس طرح لوٹے کہ ہزار ہا قلوب و انزواج کے مُردہ کھیتوں کو سرسبز و شاداب کر دیا۔ علماء نے اپنی ایمانی فریضہ

سے یہ سمجھ لیا تھا کہ اگر خطہ کا اسناد نہ کیا گیا اور اس فقہ کے مقابلے کے لیے اسلامی علوم و فنون کے قلعے نہ بنایے گئے تو حملہ آور غنیم ہمارے تاج و تخت کے ساتھ ہی ساتھ ہمارے علوم و فنون ہماری تہذیب و تمدن، ہمارے مذہب غرض ہر وہ چیز جس سے ہماری قومیت اور مذہب ہی آیت زندہ رہ سکتی ہیں سب کو غارت کر دے گا۔ اس خیال کے آتے ہی ان علمائے حق نے جن کو حق بل مجہد نے اس خدمت کے لیے منتخب فرمایا تھا، اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم پر بھروسہ کرتے ہوئے عربی مدارس کی بنیاد ڈالی حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی کی درسگاہ جسے حضرت شاہ عبدالعزیز صاحب نے جاری رکھا اور ان کے بعد حضرت شاہ اسحق صاحب نے آباد کیا، دہلی کے، ۱۸۵ء کے حادثہ کی نذر ہو گئی، لیکن حضرت مولانا سید نذیر حسین صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے دہلی میں اس درسگاہ کو جاری کیا۔

امرت سر کی مشہور درسگاہ مدرسہ غزنویہ اسی شجر طیبہ کی شاخ نثر وار ہے۔ اسی زمانہ میں ملک کے دوسرے اہم حصوں میں دینی علوم کے لیے حضرات اہل علم نے درسگاہیں قائم کیں۔

عربی دینی مدارس کے اثر کو زائل کرنے کی کوشش

قرآن و حدیث کے درس و تدریس کے یہ سلسلے، قال اللہ قال الرسول کے یہ فیصلے علمائے حق کے مواظبت و حوصلہ کی مجلسیں، تبلیغ اسلام کی یہ سرگرمیاں، انگریزی حکومت کے لیے کیونکر قابل برداشت ہو سکتی تھیں۔ انگریزی حکومت کو یقین تھا کہ ہندوستان میں انگریزی حکومت کے خلاف جو عظیم الشان طاقت اٹھ کھڑی ہوئی تھی، وہ دراصل علماء و مذہبی تحریک کا نتیجہ تھی، اس لیے اس نے عربی دینی مدارس کے اثر کو زائل کرنے اور اس کے حلقہ اقتدار کو ختم کرنے کے لیے یہ چال چلی کہ عربی تعلیم کے ایسے کالج اور مدرسے بنائے جائیں جن میں عربی زبان اور عربی ادب کی تعلیم دی جائے، مگر اس میں اسلامی روح نہ ہو تاکہ اس روح سے خالی ہو کر عربی تعلیم کی ایسی لاشیں تیار ہوں جن میں ظاہری حسن و جمال

تو ہو مگر زندگی کی طاقت نہ ہو یہ گلگتہ، الہ آباد، دہلی اور لاہور کے مشرقی زبانوں کے کالج اسی خیال کے منظر میں حالانکہ دین کے بغیر عربی تعلیم کا درجہ اس عربیت جاہلیت سے کم نہیں جس کے مٹانے کے لیے اسلام آیا۔

اے کاش! مسلمان یہ سمجھ سکتے کہ عربی تعلیم صرف عربی تعلیم کے لیے نہ ہماری قومی زندگی کا مقصد ہو سکتا ہے، نہ ہماری مذہبی زندگی کا تقاضا ہے، نہ اس کے لیے ہماری محنت اور دولت کچھ نفع بخش ہے۔ بلکہ جو حقیقت نفس اللہ مری ہے، وہ یہ ہے کہ ہماری زندگی کا مدار جس صحیفہ الہی پر ہے اور ہمارے رسول اکرم کی تعلیم و سیرت اور آپ کے اور آپ کے اصحاب رضوان اللہ علیہم اجمعین کے ارشاداتِ گرامی جس زبان کے مفردات میں محفوظ ہیں، وہ یہی مقدس زبان ہے اس لیے اس زبان کے جاننے اور اس میں مہارت پیدا کیے بغیر خدا اور اس کے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے صحیح منشا سے واقف نہیں ہو سکتے اور نہ اس فیض سے فیضیاب ہو سکتے ہیں جو اس زبان کے سرچشمہ سے بہ رہا ہے، اس لیے اس زبان کو جاننا اس میں مہارت پیدا کرنا اور اس کے الفاظ کی تحقیق، محاوروں کی تفسیر اور طرز و اسلوبِ کلام کی واقفیت فرض کفایہ کی حیثیت سے مسلمانوں پر واجب ہے اور اسی مقصد کے لیے ملک کے مختلف گوشوں میں عربی دینی مدارس کا قیام ضروری ہے۔ اگر آپ غور سے ان تحریکوں کا مطالعہ کریں گے جن سے اس ملک میں الحاد کو تعزیت حاصل ہوئی اور فزنی مقاصد کو فروغ ہوا، تو آپ اسی نتیجہ پر پہنچیں گے کہ یہ انکارِ حدیث اور تفسیرِ بارئے کا فتنہ، الحاد کے سارے فتنے ان سب کا سرچشمہ صرف عربی تعلیم یا عربی زبان کی وہ واقفیت ہے جس میں علوم کتاب و سنت اور مذہبی تعلیم و تربیت کا عنصر شامل نہیں ہے۔

آج دینی درس گاہوں کی اشد ضرورت ہے

اس لیے صاف طور پر سمجھ لینا چاہیے کہ اگر ہم چاہتے ہیں کہ اسلامی تہذیب صحیح معنوں

میں زندہ رہے، شتائزِ اسلامی کا احترام اور مذہب کا اقتدار مسلمانوں کے دلوں پر قائم رہے تو مسلمانوں کو ان مذہبی مدارس کے قیام و بقا اور تحفظ کے لیے پہلے سے زیادہ توجہ منعطف کرنی چاہیے۔ میرے نزدیک ان عربی دینی مدارس کی جس قدر ضرورت کل تھی، آج اُس سے بھی زیادہ ہے۔ کل کی طرح لوگ آج بھی عہدوں اور ملازمتوں کے پھیر اور ربابِ اقتدار کی چا پوسی میں لگے ہوئے ہیں۔ انگریزی تعلیم گاہوں اور تربیت گاہوں سے نکلے ہوئے لوگ مذہب کی پابندیوں کے قبول کرنے سے آج بھی اسی طرح گھبراتے ہیں جس طرح کل گھبراتے تھے بلکہ اس سے بھی زیادہ، اس لیے ان عربی دینی مدارس کو سنبھالنا اور عمدگی سے چلانا وقت کا اہم ترین فریضہ ہے۔ اگر یہ دینی مراکز اور علوم دینیہ کے سرچشمے خشک ہو گئے تو ہماری اسمبلیوں، ڈسٹرکٹ بورڈ اور میونسپلٹیوں سے کوئی توقع نہیں رکھ سکتا کہ وہ اسلامی تہذیب و تمدن کی حفاظت کریں گی اور نہ ہمارے لیڈروں سے جو خود انگریزی تہذیب و تمدن کے پروردہ اور مذہب سے نا آشنا اور دینی زندگی سے محروم ہیں، توقع کی جاسکتی ہے کہ وہ اسلامی تہذیب و تمدن کی حفاظت کر سکیں گے یا قرآن و حدیث، فقہ اسلامی اور دیگر علوم اسلامیہ کے درس و تدریس اور اشاعت کے لیے وہ توجہ منعطف کر سکیں گے مسلمانوں کا طبقہ جو چاہتا ہے کہ مسلمانوں کی زندگی پر مذہب حاوی ہو، مذہب کا اقتدار ہو اور مسلمان مذہب کے رنگ میں رنگے ہوئے ہوں، جو چاہتا ہے کہ قراردادِ مقاصد کے مطابق مسلمانوں کی زندگی کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سانچے میں ڈھلی ہوئی ہو جو چاہتا ہے کہ اس ملک میں خدا کی حاکمیت کے اقرار کے ساتھ خدا کا قانون اس ملک میں نافذ ہو، اُسے کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم اور درس و تدریس کے لیے ایسے مدارس قائم کرنے چاہئیں، یا جو موجود ہیں ان کے بقا و استحکام کے لیے اپنی بہترین توجہات منعطف کرنی چاہئیں تاکہ جدید علماء دین تیار ہوں اور وہ مذہبی انقلاب پیدا کیا جاسکے جس کی ضرورت باوجود سیاسی انقلاب کے ظہور پذیر ہو جانے کے ابھی تک باقی ہے۔

مدرسہ غزنویہ کی تاریخی حقیقت

اب مدرسہ غزنویہ کے متعلق کچھ مختصر سی معروضات پیش کرنا چاہتا ہوں تاکہ آپ اندازہ کر سکیں کہ اس درسگاہ نے کیا کیا دینی خدمات سرانجام دیں اور اس کے فیض کا سلسلہ کہاں تک پھیلا اور آج اس کی کیا ضرورت ہے اور اس سے کیا توقعات وابستہ کی جاسکتی ہیں۔ ہمارے جدِ امجد امام اہل التوحید، منبع آثار السلف الصالحین عارف باللہ حضرت مولانا عبداللہ غزنوی قدس سرہ حیب غزنی سے پنجاب تشریف لائے اور امت سر میں سکونت پزیر ہوئے، توحید و سنت کی اشاعت اور بدعات اور مشرکانہ رسوم سے پاک اسلام کی تبلیغ کا بے پناہ جذبہ جو آپ کے دل میں موجزن تھا، اس نے چند دنوں میں ایسی صورت حال پیدا کر دی کہ امت سر مرجع عوام و خواص بن گیا۔ آپ کے حلقہ پند و نصح میں شریک ہونے، آپ کی اقتداء میں نماز پڑھنے اور کیفیتِ خشوع و خضوع حاصل کرنے اور آپ کے فیضانِ صحبت سے متفیض ہونے کے لیے صلحاء و علماء دُور دُور سے حاضر ہو کر اس چشمہ ہدایت و معرفت سے اپنی رُوح کی تسکین اور قلب کی تطہیر حاصل کرتے۔ آپ کے صاحبزادگان میں سے مولانا عبداللہ، مولانا محمد اور والد بزرگوار حضرت مولانا عبدالجبار صاحب غزنوی قرآن و حدیث کا درس دیتے۔ اس طرح مسجد غزنویہ ایسی تربیت گاہ بن گئی تھی جہاں علم کے ساتھ عمل، اقال کے ساتھ حال کی کیفیت اور علم و بصیرت کے ساتھ معرفت کا نور حاصل ہوتا تھا۔ عارف باللہ حضرت مولانا عبداللہ غزنوی قدس سرہ کے واصل تھی ہونے کے بعد ان کے بڑے صاحبزادے حضرت مولانا عبداللہ بن عبداللہ ان کے خلیفہ مقرر ہوئے۔ آپ تھوڑا عرصہ زندہ رہے۔ ان کی وفات کے بعد والد بزرگوار حضرت مولانا عبدالجبار غزنوی نور اللہ مرقدہ منصبِ خلافت و امامت پر فائز ہوئے۔ آپ کے عہد مبارک میں رُوحانی فیوض و برکات حاصل کرنے والوں کا حلقہ بہت وسیع ہو گیا اور آپ کے علم و فضل کے چرچے پنجاب

سے گزر کر پورے ہندوستان بلکہ بلاد عرب تک جا پہنچے اور اس طرح آپ کے شاگرد تمام ملک بلکہ بیرونی ممالک میں بھی پھیل گئے۔ آپ نے اپنے عہد مبارک میں مسجدِ غزنویہ کی درگاہ کو باقاعدہ دارالعلوم کی شکل میں تبدیل کر دیا اور اس کے لیے ایک نظام قائم کر دیا۔ حضرت امام صاحب علیہ الرحمہ نے اپنی فراستِ ایمانی اور بصیرتِ قلبی کی برکت سے وقت کی اہم ترین ضرورت کو محسوس کیا۔ علوم کتاب و سنت اور دیگر علوم دینی کی تعلیم کے لیے ”دارالعلوم تقویۃ الاسلام“ کے نام سے ایک ایسی درس گاہ قائم کی جو پنجاب میں علمی اور روحانی فیوض کے لحاظ سے عظیم النظیر اور بے مثال تھی۔ دارالعلوم کی بنیاد کچھ ایسے مبارک وقت اور ایسے اخلاص اور حُسنِ نیت کے ساتھ رکھی گئی کہ بہت جلد اس کو فتقبتھا رہا بقبولِ حسن و انتہا نباتاً حسناً کا درجہ حاصل ہو گیا۔ بہت کم عرصہ میں حضرت امام صاحب علیہ الرحمہ کے شاگرد دارالعلوم کے فارغ التحصیل طلباء ملک کی مساجد میں دعوتِ ارشاد کا فرض بجالاتے ہوئے محراب و منبر کی زینت کا باعث ہوئے اور پنجاب کے اکثر دینی مدارس میں مدرسے کے فرائض بجالانے لگے۔ ان کی برکت سے شہروں سے گزر کر دو دراز قضبات و دیہات میں قال اللہ وقال الرسول کے نعلے بلند ہوئے۔ جبل کی تاریکیوں کی جگہ علم و بصیرت کے چراغ روشن ہو گئے۔ غرض علم و معرفت کا یہ شجر طیبہ ”دارالعلوم تقویۃ الاسلام“ جس کی تخم بریزی ۱۹۰۲ء میں حضرت اللہام علیہ الرحمہ کے دست مبارک سے ہوئی ایسا سرسبز اور بار آور ہوا کہ اصلہا ثابت و فرعہا فی السماء توتی اکلہا کلّ حین باذن ربہا کے مطابق اس کے گل و اثمار ہزاروں لاکھوں مومنین کے قلوب و ارواح کے لیے حیات بخش ثابت ہوئے۔

والد بزرگوار حضرت امام صاحب علیہ الرحمہ کے دورِ مین و برکت کے بعد ان کے بھائی حضرت مولانا عبدالواحد صاحب غزنوی نور اللہ مقدمہ جنہیں اللہ تعالیٰ نے فصلِ خطاب و حسن بیان اور فہمِ قرآن میں حظِ وافر عطا کیا تھا، منہِ خلافت پر منگن ہوئے اور زمامِ استہام

مدرسہ ان کے دستِ مبارک میں آئی۔ انہوں نے اسی طرح علوم نبویہ کی خدمت اور توحید و سنت کی اشاعت کی جس طرح ان کے اسلاف کرتے آئے۔ فجزاھم اللہ احسن الجزاء۔

حضرت والد علیہ الرحمہ کا دور

حضرت مولانا عبدالواحد غزنوی علیہ الرحمۃ کے انتقال کے بعد حضرت والد علیہ الرحمہ سے دارالعلوم کا کام سنبھالنے کی درخواست کی گئی۔ جس توابع اور انکار کے ساتھ والد علیہ الرحمہ نے اس ذمہ داری کو قبول کیا۔ اس کی حکایت خود ان کی زبانی سنیے:

”حضرت مولانا عبدالواحد صاحب غزنویؒ کے انتقال کے بعد جماعت کے مخلصین اور تمام خاندان نے اس عاجز کے سامنے یہ تجویز پیش کی کہ حضرت مولانا مرحوم کی جگہ میں کام کروں۔ میں نے اپنی بے لباغی اور نااہلیت کے عذرات پیش کیے لیکن کوئی شنوائی نہ ہوئی۔ میں کسی لحاظ سے بھی بزرگوں کی مندرپشتنک ہونے کا اپنے کو اہل نہ سمجھتا تھا۔ میرے پاس اپنی کوتاہیوں کے اعتراف، اپنے ذنوب و خطایا کی ندامت و انفعال کے سوا کچھ نہ تھا، لیکن جماعت کے فیصلے کے سامنے مجھے مر تسلیم خم کر دینا پڑا۔“

میں نے اس ذمہ داری کو قبول کر لیا کہ شاید یہی خدمت میرے لیے کفارۃ ذنوب کا سبب اور الحقنا بحم ذریتہم وما التثہم من عملہم من شیء کا ذریعہ بن جائے۔ یا اللہ تو علیم و خیر ہے۔ تو بہتر جانتا ہے کہ اس وقت سے آج تک میں کس قدر عاجزی اور زاری کے ساتھ تجھ سے دُعا مانگتا ہوں ”اللہم اِنِّی ضعیفٌ فقوٰنی فی رِضَاکَ ضعیفی وخذْ لِی الخیرَ نِیَا صِیَّتِی وَاَجْعَلِ لِی سَلَامَ مُشْتِئِی رِضَا بِی اللہم اِنِّی ضعیفٌ فقوٰنی وَاِنِّی ذَلِیلٌ فَاَعِزَّنِی وَاِنِّی فَقِیْرٌ فَاَرِزَّنِی“

۱۰ دیکھیے صفحہ ۳۳ تا ۱۰

پس تو ہی میری عاجزانہ التجاؤں کا سننے والا اور انہیں شرف قبولیت بخشنے والا اور مجھے توفیق بخشنے والا ہے کہ تیری توفیق کے بغیر میرے لیے ناممکن ہے کہ میں اپنے فرائض سے عمدہ براہوں کوں۔“

حضرت والد علیہ الرحمہ اعلیٰ کلمۃ الحق کی پاداش میں کئی بار نظر بند ہوئے مگر ان کے عزم اور ہمت کا عالم یہ تھا کہ وہ قید و بند کی سختیاں بھی جھیلنے رہے اور دارالعلوم بھی چلاتے رہے۔ خود قسم طراز ہیں:

”اس دور میں دارالعلوم کے لیے وقت بڑا نازک تھا جب کہ انگریزی حکومت نے مجھے گزشتہ عالمگیر جنگ کے زمانہ میں نظر بند کر دیا اور تین سال کی نظر بندی کے عرصہ میں مجھے دارالعلوم کی نگرانی سے مجبوراً محروم ہونا پڑا۔“

قید سے رہا ہوتے ہی ایک نئے دہانے کے ساتھ دین کے کاموں میں منہمک ہو جاتے۔ خود فرماتے ہیں:

”اس نظر بندی سے خلاصی حاصل کر لینے کے بعد یہ فکروا منگی رہی کہ دارالعلوم کی ایک نئی عمارت بنائی جائے جو تمام ضروریات کے لیے کفیل ہو؛ چنانچہ تیس ہزار روپے کے صرف سے تین منزلہ خوبصورت عمارت مسجد غزنویہ کے ساتھ ہی تعمیر کی گئی۔ خوبصورتی کے علاوہ اس کی سچنگی اور مضبوطی کا خیال اس درجہ رکھا گیا کہ اس کی چھتیں لوہے سینٹ اور کنکریٹ سے تیار کی گئیں اور تمام عمارت سینٹ سے تیار کی گئی، لیکن افسوس کہ ہم تین چار ماہ سے زیادہ عرصہ دارالعلوم کی اس نئی بلڈنگ میں نہ رہنے پائے کہ ۱۹۴۷ء کا انقلاب اپنے تمام فتنوں اور بربادیوں سمیت آگیا۔“

دارالعلوم اور ۱۹۴۷ء کا خونیں انقلاب

۱۹۴۷ء کے خونیں انقلاب میں دارالعلوم پر کیا گزری؟ حضرت والد علیہ الرحمہ یوں

صفحہ ۱۱۰ سے صفحہ ۱۱ سے صفحہ ۱۲

رقطرا نہیں :

” اگرچہ ہندوستان کی تقسیمِ مسلم لیگ اور کانگرس کے باہمی سمجھوتے سے ہُوئی اور دوسرے لفظوں میں ہندوؤں اور مسلمانوں کی نمائندہ جماعتوں کی رضامندی سے ہُوئی، لیکن اس تقسیم کے بعد مشرقی پنجاب سے مسلمانوں کا جبری اخراج مسلمانوں کا قتلِ عام، مسلم خواتین کی بے حرمتی، مسلمانوں کے مال و متاع کی تباہی و بربادی، مسلمانوں کی مساجد اور مدارس کا تاخت و تاراج کرنا، رائٹسٹریٹ سیکو، سنگھ، سکھوں اور کانگرسیوں کی باہمی سازش کے نتیجہ کے طور پر اس وحشت اور بربریت کے ساتھ عمل میں آیا کہ قرونِ منظمہ کی تاریخ میں بڑے سے بڑے جلاد و سفاک اور درندہ خصلت حکمرانوں یا فاتحوں کی تاریخ میں بھی اس کی مثال نہیں مل سکتی۔ مشرقی پنجاب میں امرتسر اس ہولناک بربریت اور سفاکی سے سب سے زیادہ متاثر ہوا۔ ہماری تاریخی مسجد ”مسجدِ غزنویہ“ بھی جلادی گئی۔ مسجدِ غزنویہ کے ساتھ مدرسین کی ہاشن کے مکانات بھی جلادیے گئے۔ دارالعلوم کی تاریخی لائبریری جو بڑی نادر اور بیش قیمت کتابوں پر مشتمل تھی، برباد کر دی گئی۔ بزرگوں کے وقت سے اس لائبریری میں اضافہ ہوتا رہا۔ اس عاجز نے مصر اور ہندوستان کے بڑے بڑے کُتب خانوں سے جدید مطبوعات کا ایک بہت بڑا ذخیرہ اس میں شامل کیا تھا۔ قرآن مجید کی تمام تفاسیر، کُتبِ احادیث اور اُن کی شرح، کُتبِ فقہ، اُتوار لبر، اور اُن کے بڑے بڑے مجموعے۔ فتاویٰ، ادب اور تاریخِ غرض تمام علوم کی بہترین کتابوں کا بڑا ذخیرہ تھا اور تمام درسی کتابوں کے ایک ایک کے پیسوں بلکہ پچاسوں نسخوں کی کئی الماریاں بھری پڑی تھیں، جو آج ہزاروں روپے خرچ کرنے پر بھی نہیں مل سکتیں۔ فوسس کہ سکھوں اور ہندوؤں کی اسلام دشمنی بلکہ مسلم دشمنی کی وجہ سے وہ ذخیرہ برباد ہو گیا۔ انا اللہ وانا الیہ راجعون۔ ہمیں اپنے مکانات کی تباہی و بربادی کا اتنا صدمہ نہیں جتنا اپنے کُتب خانہ کے ضائع ہونے کا صدمہ ہے کیونکہ وہ اب کسی قیمت پر بھی نہیں مل سکتا۔

اس تباہی و بربادی کے علاوہ جو سب سے بڑا نقصان ہمیں پہنچا وہ یہ کہ ہمارے

دارالعلوم کے دو مدرس مولانا عبداللہ صاحب بھوجپانیؒ اور اُن کے بھائی مولوی عبدالرحیم شہید کردیے گئے اور دفتر دارالعلوم کے نہایت وفادار کلرک مولوی عبداللہ صاحب دینانگری اور اُن کی بیوی کومکان کے اندر شہید کر کے سارے دفتر کو آگ لگا دی گئی اور ان شہداء کی لاشیں اس میں خاکتر کر دی گئیں۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ۔ ہمارے پرنے اور مخلص سفیر مولوی صدیق صاحب راستہ میں شہید کر دیئے گئے۔ دوسرے سفیر مولوی علم الدین صاحب راستہ کی صعوبتیں برداشت کرتے اس قدر ضعیف ہو گئے کہ لاہور پہنچنے کے بعد وفات پا گئے۔ اللہ تعالیٰ ان تمام شہداء کی پاک رُوحوں کو اپنے جوار رحمت میں جگہ دے اور ان پر اپنے انوار و برکات نازل فرمائے۔ آمین

لاہور میں دارالعلوم کا دوبارہ اجراء

پاکستان کے قیام اور امرتسر سے مسلمانوں کے جبری اخراج کے بعد اس دارالعلوم کے دوبارہ اجراء کا مسئلہ بہت پریشان کن تھا، لیکن بِاللّٰہِ تَعَالٰی کی مہربانی اور حضرت والد علیہ الرحمۃ کی مساعی جمیلہ سے دارالعلوم کو "شیش محل روڈ" کی موجودہ عمارت میسر آ گئی، لیکن اس وقت درس و تدریس کے آغاز کے لیے ایک کتاب بھی موجود نہ تھی۔ توفیق الہی شامل حال ہوئی اور شروع میں صرف درسی کتابیں خریدی گئیں، لیکن تدریج تفسیر، حدیث، فقہ، تاریخ، تصوف اور دوسرے علوم و فنون پر تمام اہم اور مستند کتابیں خریدنے کی توفیق ہوئی اور یوں تھوڑے ہی عرصے میں اس دارالعلوم کا کتب خانہ پھر علی ذخائر سے مالا مال ہونے لگا۔ ہمارے دینی مدارس میں عام طور پر جماعت بندی کا خیال نہیں کیا جاتا تھا اور نصاب تعلیم پر مجہود طاری تھا۔ حضرت والد علیہ الرحمۃ نے جماعت بندی، اصلاح نصاب، عرصہ تعلیم کا تعین ایسے اہم امور پر توجہ فرمائی۔ قرآن، حدیث اور فقہ کے علاوہ صرف و نحو، منطق و فلسفہ اور بلاغ و ادب کے نصاب میں ضروری تبدیلیاں عمل میں لائی گئیں۔ یہ کتنا بے جا نہ ہو گا کہ حضرت والد

علیہ الرحمہ کے زمانے میں دارالعلوم ازسرنود جو دیں آیا۔ حضرت والد علیہ الرحمہ قومی اور جماعتی کاموں میں اس قدر منہمک تھے کہ وہ اپنے ذاتی مدرسہ پر زیادہ توجہ نہ فرما سکے۔ یہ وثوق سے کہا جاسکتا ہے کہ اگر وہ دارالعلوم پر توجہ مرکوز فرماتے تو اسے ایک عظیم الشان یونیورسٹی میں تبدیل کر سکتے تھے۔

۱۶ دسمبر ۱۹۶۳ء کو دارالعلوم حضرت والد علیہ الرحمہ کی نگرانی اور سرپرستی سے محرم ہوا۔

حضرت والد علیہ الرحمہ کے بعد دارالعلوم

حضرت والد علیہ الرحمہ کے بعد

کو چلانے کی ذمہ داری اس بندہ عاجز کو سونپی گئی۔ راقم الحروف اپنی بے بضاعتی اور کم مائیگی کی وجہ سے حضرت عبداللہ غزنویؒ اور حضرت الامام عبدالجبار غزنویؒ کی مسند پر بیٹھنے کا اپنے آپ کو کسی طرح بھی اہل نہیں سمجھتا تھا لیکن اس بات کے پیش نظر کہ بزرگوں کا کتاب و سنت کا جو فیضان جاری کیا ہے اور مدتوں سے جاری ہے کہیں بند نہ ہو جائے، اس ذمہ داری کو قبول کر لیا۔

فَتَشْتَهُوْا اِنَّ لِحَدَثِكُمْ مَثَلَهُمْ

اِنَّ التَّشْبَهَ بِالْكَرَامِ كَرَامٌ

اگر تم ان جیسے نہ ہو سکو، تو ان کا روپ ہی دھا رو۔ بزرگوں کا روپ

دھارنا بھی ایک سعادت اور شرف کی بات ہے)

یہ خطا کار آس لگائے بیٹھا ہے کہ رحمتِ خداوندی نقل کو اصل میں تبدیل کر دے۔

تجدیثِ نعمت کے طور پر عرض کرتا ہوں کہ اس سے پیشتر دارالعلوم میں خطبہ جمعہ کا انتظام نہ تھا۔ اللہ تعالیٰ نے یہ توفیق بندہ

عاجز کو مرحمت فرمائی۔ لاہور شہر اور آس پاس کے علاقوں سے اچھی خاصی تعداد میں لوگ جمعہ میں شریک ہوتے ہیں۔

مکتبہ غزنویہ

کیا ہے؟ — افراد کی عزت و ذلت، قوموں کے عروج و زوال کے بارے میں ضابطہ الہی — امریکہ اور روس آج کیوں معزز ہیں۔ ہم کیوں بے وقعت ہیں؟ ان سوالوں کے جواب اس مقالے میں موجود ہیں۔

۱۰ — قرآن مجید کے صوری اور معنوی محاسن
(ایک اجمالی جائزہ)

کیا گیا ہے — ذات و صفاتِ خداوندی کے قرآنی تصور کی وضاحت — قرآن مجید سیرت النبی کا مستند ترین مرقع ہے — ایک مکمل ضابطہ حیات ہے اور انسان کی عائلی، سیاسی، اقتصادی اور معاشرتی زندگی میں مشعل راہ ہے۔

۱۱ — محمدی انقلاب کے چند خط و خال : اس مقالے میں اس بات کی وضاحت کی گئی ہے کہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے جو انقلاب برپا کیا وہ کن ارتقائی منازل سے گزرا اور اس کے کیا نتائج مرتب ہوئے اور یہ ثابت کیا ہے کہ محمدی انقلاب ماڈرن اور لیسن کے انقلاب سے عظیم تر تھا۔

یہ ایک المیہ ہے کہ پورے ملک میں کسی دینی درسگاہ میں بھی ایسا نصاب پڑھانے کا انتظام نہیں، جس سے ہمارے کالجوں اور یونیورسٹیوں کے طلباء اور اساتذہ، ڈاکٹر، انجینئرز، وکیل، تاجر اور ملازمت پدیشہ حضرات جو اپنے جی میں علم دین حاصل کرنے کی تڑپ رکھتے ہیں، استفادہ کر سکیں۔ اس مقصد کے پیش نظر شام کی کلاسوں کا اجراء عمل میں لایا گیا ہے۔ نصاب تین پرچوں پر مشتمل ہے: ۱۔ عربی زبان اور گرامر ۲۔ تفسیر قرآن ۳۔ حدیث شریفہ۔

المحمدیۃ کہ متوقع نتائج برآمد ہو رہے ہیں۔

دارالعلوم کی علمی اور تاریخی عظمت کا اندازہ اس بات سے بھی لگایا جاسکتا ہے کہ بڑے بڑے مستند اور قلمناز علماء اس درسگاہ

اساتذہ کرام

میں مندر تدریس پرفائزر رہے بعض اساتذہ کے اسمائے گرامی درج ذیل ہیں :

مولانا عبدالجبار غزنویؒ (دم ۱۳۳۱ھ) مولانا عبداللہ بن عبداللہ غزنویؒ (دم ۱۳۰۰ھ) مولانا
عبدالاول غزنویؒ (دم ۱۳۱۳ھ) مولانا عبدالرحیم غزنویؒ (دم ۱۳۲۲ھ) مولانا عبدالحی غزنویؒ
مولانا محمد حسین بٹالویؒ (دم ۱۳۳۸ھ) مولانا عبدالغفور غزنویؒ مولانا سید محمد داؤد غزنویؒ
مولانا معصوم علی نزاریؒ مولانا عبدالرحمن ساکن کھپلی۔ مولانا غلام رسول پوٹھواری۔ مولانا ابوالفتح
نیک محمد۔ مولانا غلام رحمانی۔ مولانا اصحاب الدین۔ مولانا عبداللہ بھوجیانی۔ اساتذہ الکریم
مولانا شریف اللہ صاحب۔ مولانا محمد عبدہ صاحب۔

اس وقت دارالعلوم میں مندرجہ ذیل اساتذہ تدریس کا کام سرانجام دے رہے ہیں۔
شیخ الحدیث مولانا حافظ محمد اسحاق صاحب۔ مولانا حافظ عبدالرشید صاحب گوٹہ دی۔
مولانا عبدالرشید صاحب۔ مولانا قاری محمد صدیق صاحب۔ جناب پروفیسر میاں
منظور احمد صاحب شاگرد رشید حضرت مولانا شبیر احمد صاحب عثمانی۔ جناب ڈاکٹر حافظ ظہور احمد

اس درگاہ کو یہ سعادت نصیب ہوئی کہ ایسے فاضل افراد
یہاں سے فارغ ہوئے جن میں علمی نقاہت بھی تھی اور

مشہور تلامذہ

نسبت بھی۔ جو بیک وقت علم و فضل اور زہد و تقویٰ سے مالا مال تھے۔ اس درگاہ نے
مولانا عبدالقادر لکھری، مولانا محمد علی لکھری اور مولانا عطاء اللہ لکھری ایسے ارباب صدق و صفا
پیدا کیے۔ مولانا حافظ عبداللہ روپڑی ایسے علم و فضل اور زہد و تقویٰ کے پیکر اسی درگاہ سے
فیضیاب ہوئے۔ مولانا حافظ محمد گوندوی اور مولانا محمد اسماعیل (گوہرانوالہ) ایسے جلیل القدر
حضرات اس درگاہ سے فارغ التحصیل ہوئے۔

جن حضرات نے دارالعلوم تقریبہ الاسلام سے فارغ ہونے کے بعد تدریس یا تبلیغ کا
کام اپنی زندگی میں جاری رکھا تھا یا اس وقت ملک کے اطراف و انکاف میں تدریس یا تبلیغ کا کام کر رہے

۱۷ دیکھیے صفحہ ۱۷۳، ۱۷۴، ۱۷۵، ۱۷۶، ۱۷۷، ۱۷۸، ۱۷۹، ۱۸۰، ۱۸۱، ۱۸۲، ۱۸۳، ۱۸۴، ۱۸۵، ۱۸۶، ۱۸۷، ۱۸۸، ۱۸۹، ۱۹۰، ۱۹۱، ۱۹۲، ۱۹۳، ۱۹۴، ۱۹۵، ۱۹۶، ۱۹۷، ۱۹۸، ۱۹۹، ۲۰۰، ۲۰۱، ۲۰۲، ۲۰۳، ۲۰۴، ۲۰۵، ۲۰۶، ۲۰۷، ۲۰۸، ۲۰۹، ۲۱۰، ۲۱۱، ۲۱۲، ۲۱۳، ۲۱۴، ۲۱۵، ۲۱۶، ۲۱۷، ۲۱۸، ۲۱۹، ۲۲۰، ۲۲۱، ۲۲۲، ۲۲۳، ۲۲۴، ۲۲۵، ۲۲۶، ۲۲۷، ۲۲۸، ۲۲۹، ۲۳۰، ۲۳۱، ۲۳۲، ۲۳۳، ۲۳۴، ۲۳۵، ۲۳۶، ۲۳۷، ۲۳۸، ۲۳۹، ۲۴۰، ۲۴۱، ۲۴۲، ۲۴۳، ۲۴۴، ۲۴۵، ۲۴۶، ۲۴۷، ۲۴۸، ۲۴۹، ۲۵۰، ۲۵۱، ۲۵۲، ۲۵۳، ۲۵۴، ۲۵۵، ۲۵۶، ۲۵۷، ۲۵۸، ۲۵۹، ۲۶۰، ۲۶۱، ۲۶۲، ۲۶۳، ۲۶۴، ۲۶۵، ۲۶۶، ۲۶۷، ۲۶۸، ۲۶۹، ۲۷۰، ۲۷۱، ۲۷۲، ۲۷۳، ۲۷۴، ۲۷۵، ۲۷۶، ۲۷۷، ۲۷۸، ۲۷۹، ۲۸۰، ۲۸۱، ۲۸۲، ۲۸۳، ۲۸۴، ۲۸۵، ۲۸۶، ۲۸۷، ۲۸۸، ۲۸۹، ۲۹۰، ۲۹۱، ۲۹۲، ۲۹۳، ۲۹۴، ۲۹۵، ۲۹۶، ۲۹۷، ۲۹۸، ۲۹۹، ۳۰۰، ۳۰۱، ۳۰۲، ۳۰۳، ۳۰۴، ۳۰۵، ۳۰۶، ۳۰۷، ۳۰۸، ۳۰۹، ۳۱۰، ۳۱۱، ۳۱۲، ۳۱۳، ۳۱۴، ۳۱۵، ۳۱۶، ۳۱۷، ۳۱۸، ۳۱۹، ۳۲۰، ۳۲۱، ۳۲۲، ۳۲۳، ۳۲۴، ۳۲۵، ۳۲۶، ۳۲۷، ۳۲۸، ۳۲۹، ۳۳۰، ۳۳۱، ۳۳۲، ۳۳۳، ۳۳۴، ۳۳۵، ۳۳۶، ۳۳۷، ۳۳۸، ۳۳۹، ۳۴۰، ۳۴۱، ۳۴۲، ۳۴۳، ۳۴۴، ۳۴۵، ۳۴۶، ۳۴۷، ۳۴۸، ۳۴۹، ۳۵۰، ۳۵۱، ۳۵۲، ۳۵۳، ۳۵۴، ۳۵۵، ۳۵۶، ۳۵۷، ۳۵۸، ۳۵۹، ۳۶۰، ۳۶۱، ۳۶۲، ۳۶۳، ۳۶۴، ۳۶۵، ۳۶۶، ۳۶۷، ۳۶۸، ۳۶۹، ۳۷۰، ۳۷۱، ۳۷۲، ۳۷۳، ۳۷۴، ۳۷۵، ۳۷۶، ۳۷۷، ۳۷۸، ۳۷۹، ۳۸۰، ۳۸۱، ۳۸۲، ۳۸۳، ۳۸۴، ۳۸۵، ۳۸۶، ۳۸۷، ۳۸۸، ۳۸۹، ۳۹۰، ۳۹۱، ۳۹۲، ۳۹۳، ۳۹۴، ۳۹۵، ۳۹۶، ۳۹۷، ۳۹۸، ۳۹۹، ۴۰۰، ۴۰۱، ۴۰۲، ۴۰۳، ۴۰۴، ۴۰۵، ۴۰۶، ۴۰۷، ۴۰۸، ۴۰۹، ۴۱۰، ۴۱۱، ۴۱۲، ۴۱۳، ۴۱۴، ۴۱۵، ۴۱۶، ۴۱۷، ۴۱۸، ۴۱۹، ۴۲۰، ۴۲۱، ۴۲۲، ۴۲۳، ۴۲۴، ۴۲۵، ۴۲۶، ۴۲۷، ۴۲۸، ۴۲۹، ۴۳۰، ۴۳۱، ۴۳۲، ۴۳۳، ۴۳۴، ۴۳۵، ۴۳۶، ۴۳۷، ۴۳۸، ۴۳۹، ۴۴۰، ۴۴۱، ۴۴۲، ۴۴۳، ۴۴۴، ۴۴۵، ۴۴۶، ۴۴۷، ۴۴۸، ۴۴۹، ۴۵۰، ۴۵۱، ۴۵۲، ۴۵۳، ۴۵۴، ۴۵۵، ۴۵۶، ۴۵۷، ۴۵۸، ۴۵۹، ۴۶۰، ۴۶۱، ۴۶۲، ۴۶۳، ۴۶۴، ۴۶۵، ۴۶۶، ۴۶۷، ۴۶۸، ۴۶۹، ۴۷۰، ۴۷۱، ۴۷۲، ۴۷۳، ۴۷۴، ۴۷۵، ۴۷۶، ۴۷۷، ۴۷۸، ۴۷۹، ۴۸۰، ۴۸۱، ۴۸۲، ۴۸۳، ۴۸۴، ۴۸۵، ۴۸۶، ۴۸۷، ۴۸۸، ۴۸۹، ۴۹۰، ۴۹۱، ۴۹۲، ۴۹۳، ۴۹۴، ۴۹۵، ۴۹۶، ۴۹۷، ۴۹۸، ۴۹۹، ۵۰۰، ۵۰۱، ۵۰۲، ۵۰۳، ۵۰۴، ۵۰۵، ۵۰۶، ۵۰۷، ۵۰۸، ۵۰۹، ۵۱۰، ۵۱۱، ۵۱۲، ۵۱۳، ۵۱۴، ۵۱۵، ۵۱۶، ۵۱۷، ۵۱۸، ۵۱۹، ۵۲۰، ۵۲۱، ۵۲۲، ۵۲۳، ۵۲۴، ۵۲۵، ۵۲۶، ۵۲۷، ۵۲۸، ۵۲۹، ۵۳۰، ۵۳۱، ۵۳۲، ۵۳۳، ۵۳۴، ۵۳۵، ۵۳۶، ۵۳۷، ۵۳۸، ۵۳۹، ۵۴۰، ۵۴۱، ۵۴۲، ۵۴۳، ۵۴۴، ۵۴۵، ۵۴۶، ۵۴۷، ۵۴۸، ۵۴۹، ۵۵۰، ۵۵۱، ۵۵۲، ۵۵۳، ۵۵۴، ۵۵۵، ۵۵۶، ۵۵۷، ۵۵۸، ۵۵۹، ۵۶۰، ۵۶۱، ۵۶۲، ۵۶۳، ۵۶۴، ۵۶۵، ۵۶۶، ۵۶۷، ۵۶۸، ۵۶۹، ۵۷۰، ۵۷۱، ۵۷۲، ۵۷۳، ۵۷۴، ۵۷۵، ۵۷۶، ۵۷۷، ۵۷۸، ۵۷۹، ۵۸۰، ۵۸۱، ۵۸۲، ۵۸۳، ۵۸۴، ۵۸۵، ۵۸۶، ۵۸۷، ۵۸۸، ۵۸۹، ۵۹۰، ۵۹۱، ۵۹۲، ۵۹۳، ۵۹۴، ۵۹۵، ۵۹۶، ۵۹۷، ۵۹۸، ۵۹۹، ۶۰۰، ۶۰۱، ۶۰۲، ۶۰۳، ۶۰۴، ۶۰۵، ۶۰۶، ۶۰۷، ۶۰۸، ۶۰۹، ۶۱۰، ۶۱۱، ۶۱۲، ۶۱۳، ۶۱۴، ۶۱۵، ۶۱۶، ۶۱۷، ۶۱۸، ۶۱۹، ۶۲۰، ۶۲۱، ۶۲۲، ۶۲۳، ۶۲۴، ۶۲۵، ۶۲۶، ۶۲۷، ۶۲۸، ۶۲۹، ۶۳۰، ۶۳۱، ۶۳۲، ۶۳۳، ۶۳۴، ۶۳۵، ۶۳۶، ۶۳۷، ۶۳۸، ۶۳۹، ۶۴۰، ۶۴۱، ۶۴۲، ۶۴۳، ۶۴۴، ۶۴۵، ۶۴۶، ۶۴۷، ۶۴۸، ۶۴۹، ۶۵۰، ۶۵۱، ۶۵۲، ۶۵۳، ۶۵۴، ۶۵۵، ۶۵۶، ۶۵۷، ۶۵۸، ۶۵۹، ۶۶۰، ۶۶۱، ۶۶۲، ۶۶۳، ۶۶۴، ۶۶۵، ۶۶۶، ۶۶۷، ۶۶۸، ۶۶۹، ۶۷۰، ۶۷۱، ۶۷۲، ۶۷۳، ۶۷۴، ۶۷۵، ۶۷۶، ۶۷۷، ۶۷۸، ۶۷۹، ۶۸۰، ۶۸۱، ۶۸۲، ۶۸۳، ۶۸۴، ۶۸۵، ۶۸۶، ۶۸۷، ۶۸۸، ۶۸۹، ۶۹۰، ۶۹۱، ۶۹۲، ۶۹۳، ۶۹۴، ۶۹۵، ۶۹۶، ۶۹۷، ۶۹۸، ۶۹۹، ۷۰۰، ۷۰۱، ۷۰۲، ۷۰۳، ۷۰۴، ۷۰۵، ۷۰۶، ۷۰۷، ۷۰۸، ۷۰۹، ۷۱۰، ۷۱۱، ۷۱۲، ۷۱۳، ۷۱۴، ۷۱۵، ۷۱۶، ۷۱۷، ۷۱۸، ۷۱۹، ۷۲۰، ۷۲۱، ۷۲۲، ۷۲۳، ۷۲۴، ۷۲۵، ۷۲۶، ۷۲۷، ۷۲۸، ۷۲۹، ۷۳۰، ۷۳۱، ۷۳۲، ۷۳۳، ۷۳۴، ۷۳۵، ۷۳۶، ۷۳۷، ۷۳۸، ۷۳۹، ۷۴۰، ۷۴۱، ۷۴۲، ۷۴۳، ۷۴۴، ۷۴۵، ۷۴۶، ۷۴۷، ۷۴۸، ۷۴۹، ۷۵۰، ۷۵۱، ۷۵۲، ۷۵۳، ۷۵۴، ۷۵۵، ۷۵۶، ۷۵۷، ۷۵۸، ۷۵۹، ۷۶۰، ۷۶۱، ۷۶۲، ۷۶۳، ۷۶۴، ۷۶۵، ۷۶۶، ۷۶۷، ۷۶۸، ۷۶۹، ۷۷۰، ۷۷۱، ۷۷۲، ۷۷۳، ۷۷۴، ۷۷۵، ۷۷۶، ۷۷۷، ۷۷۸، ۷۷۹، ۷۸۰، ۷۸۱، ۷۸۲، ۷۸۳، ۷۸۴، ۷۸۵، ۷۸۶، ۷۸۷، ۷۸۸، ۷۸۹، ۷۹۰، ۷۹۱، ۷۹۲، ۷۹۳، ۷۹۴، ۷۹۵، ۷۹۶، ۷۹۷، ۷۹۸، ۷۹۹، ۸۰۰، ۸۰۱، ۸۰۲، ۸۰۳، ۸۰۴، ۸۰۵، ۸۰۶، ۸۰۷، ۸۰۸، ۸۰۹، ۸۱۰، ۸۱۱، ۸۱۲، ۸۱۳، ۸۱۴، ۸۱۵، ۸۱۶، ۸۱۷، ۸۱۸، ۸۱۹، ۸۲۰، ۸۲۱، ۸۲۲، ۸۲۳، ۸۲۴، ۸۲۵، ۸۲۶، ۸۲۷، ۸۲۸، ۸۲۹، ۸۳۰، ۸۳۱، ۸۳۲، ۸۳۳، ۸۳۴، ۸۳۵، ۸۳۶، ۸۳۷، ۸۳۸، ۸۳۹، ۸۴۰، ۸۴۱، ۸۴۲، ۸۴۳، ۸۴۴، ۸۴۵، ۸۴۶، ۸۴۷، ۸۴۸، ۸۴۹، ۸۵۰، ۸۵۱، ۸۵۲، ۸۵۳، ۸۵۴، ۸۵۵، ۸۵۶، ۸۵۷، ۸۵۸، ۸۵۹، ۸۶۰، ۸۶۱، ۸۶۲، ۸۶۳، ۸۶۴، ۸۶۵، ۸۶۶، ۸۶۷، ۸۶۸، ۸۶۹، ۸۷۰، ۸۷۱، ۸۷۲، ۸۷۳، ۸۷۴، ۸۷۵، ۸۷۶، ۸۷۷، ۸۷۸، ۸۷۹، ۸۸۰، ۸۸۱، ۸۸۲، ۸۸۳، ۸۸۴، ۸۸۵، ۸۸۶، ۸۸۷، ۸۸۸، ۸۸۹، ۸۹۰، ۸۹۱، ۸۹۲، ۸۹۳، ۸۹۴، ۸۹۵، ۸۹۶، ۸۹۷، ۸۹۸، ۸۹۹، ۹۰۰، ۹۰۱، ۹۰۲، ۹۰۳، ۹۰۴، ۹۰۵، ۹۰۶، ۹۰۷، ۹۰۸، ۹۰۹، ۹۱۰، ۹۱۱، ۹۱۲، ۹۱۳، ۹۱۴، ۹۱۵، ۹۱۶، ۹۱۷، ۹۱۸، ۹۱۹، ۹۲۰، ۹۲۱، ۹۲۲، ۹۲۳، ۹۲۴، ۹۲۵، ۹۲۶، ۹۲۷، ۹۲۸، ۹۲۹، ۹۳۰، ۹۳۱، ۹۳۲، ۹۳۳، ۹۳۴، ۹۳۵، ۹۳۶، ۹۳۷، ۹۳۸، ۹۳۹، ۹۴۰، ۹۴۱، ۹۴۲، ۹۴۳، ۹۴۴، ۹۴۵، ۹۴۶، ۹۴۷، ۹۴۸، ۹۴۹، ۹۵۰، ۹۵۱، ۹۵۲، ۹۵۳، ۹۵۴، ۹۵۵، ۹۵۶، ۹۵۷، ۹۵۸، ۹۵۹، ۹۶۰، ۹۶۱، ۹۶۲، ۹۶۳، ۹۶۴، ۹۶۵، ۹۶۶، ۹۶۷، ۹۶۸، ۹۶۹، ۹۷۰، ۹۷۱، ۹۷۲، ۹۷۳، ۹۷۴، ۹۷۵، ۹۷۶، ۹۷۷، ۹۷۸، ۹۷۹، ۹۸۰، ۹۸۱، ۹۸۲، ۹۸۳، ۹۸۴، ۹۸۵، ۹۸۶، ۹۸۷، ۹۸۸، ۹۸۹، ۹۹۰، ۹۹۱، ۹۹۲، ۹۹۳، ۹۹۴، ۹۹۵، ۹۹۶، ۹۹۷، ۹۹۸، ۹۹۹، ۱۰۰۰، ۱۰۰۱، ۱۰۰۲، ۱۰۰۳، ۱۰۰۴، ۱۰۰۵، ۱۰۰۶، ۱۰۰۷، ۱۰۰۸، ۱۰۰۹، ۱۰۱۰، ۱۰۱۱، ۱۰۱۲، ۱۰۱۳، ۱۰۱۴، ۱۰۱۵، ۱۰۱۶، ۱۰۱۷، ۱۰۱۸، ۱۰۱۹، ۱۰۲۰، ۱۰۲۱، ۱۰۲۲، ۱۰۲۳، ۱۰۲۴، ۱۰۲۵، ۱۰۲۶، ۱۰۲۷، ۱۰۲۸، ۱۰۲۹، ۱۰۳۰، ۱۰۳۱، ۱۰۳۲، ۱۰۳۳، ۱۰۳۴، ۱۰۳۵، ۱۰۳۶، ۱۰۳۷، ۱۰۳۸، ۱۰۳۹، ۱۰۴۰، ۱۰۴۱، ۱۰۴۲، ۱۰۴۳، ۱۰۴۴، ۱۰۴۵، ۱۰۴۶، ۱۰۴۷، ۱۰۴۸، ۱۰۴۹، ۱۰۵۰، ۱۰۵۱، ۱۰۵۲، ۱۰۵۳، ۱۰۵۴، ۱۰۵۵، ۱۰۵۶، ۱۰۵۷، ۱۰۵۸، ۱۰۵۹، ۱۰۶۰، ۱۰۶۱، ۱۰۶۲، ۱۰۶۳، ۱۰۶۴، ۱۰۶۵، ۱۰۶۶، ۱۰۶۷، ۱۰۶۸، ۱۰۶۹، ۱۰۷۰، ۱۰۷۱، ۱۰۷۲، ۱۰۷۳، ۱۰۷۴، ۱۰۷۵، ۱۰۷۶، ۱۰۷۷، ۱۰۷۸، ۱۰۷۹، ۱۰۸۰، ۱۰۸۱، ۱۰۸۲، ۱۰۸۳، ۱۰۸۴، ۱۰۸۵، ۱۰۸۶، ۱۰۸۷، ۱۰۸۸، ۱۰۸۹، ۱۰۹۰، ۱۰۹۱، ۱۰۹۲، ۱۰۹۳، ۱۰۹۴، ۱۰۹۵، ۱۰۹۶، ۱۰۹۷، ۱۰۹۸، ۱۰۹۹، ۱۱۰۰، ۱۱۰۱، ۱۱۰۲، ۱۱۰۳، ۱۱۰۴، ۱۱۰۵، ۱۱۰۶، ۱۱۰۷، ۱۱۰۸، ۱۱۰۹، ۱۱۱۰، ۱۱۱۱، ۱۱۱۲، ۱۱۱۳، ۱۱۱۴، ۱۱۱۵، ۱۱۱۶، ۱۱۱۷، ۱۱۱۸، ۱۱۱۹، ۱۱۲۰، ۱۱۲۱، ۱۱۲۲، ۱۱۲۳، ۱۱۲۴، ۱۱۲۵، ۱۱۲۶، ۱۱۲۷، ۱۱۲۸، ۱۱۲۹، ۱۱۳۰، ۱۱۳۱، ۱۱۳۲، ۱۱۳۳، ۱۱۳۴، ۱۱۳۵، ۱۱۳۶، ۱۱۳۷، ۱۱۳۸، ۱۱۳۹، ۱۱۴۰، ۱۱۴۱، ۱۱۴۲، ۱۱۴۳، ۱۱۴۴، ۱۱۴۵، ۱۱۴۶، ۱۱۴۷، ۱۱۴۸، ۱۱۴۹، ۱۱۵۰، ۱۱۵۱، ۱۱۵۲، ۱۱۵۳، ۱۱۵۴، ۱۱۵۵، ۱۱۵۶، ۱۱۵۷، ۱۱۵۸، ۱۱۵۹، ۱۱۶۰، ۱۱۶۱، ۱۱۶۲، ۱۱۶۳، ۱۱۶۴، ۱۱۶۵، ۱۱۶۶، ۱۱۶۷، ۱۱۶۸، ۱۱۶۹، ۱۱۷۰، ۱۱۷۱، ۱۱۷۲، ۱۱۷۳، ۱۱۷۴، ۱۱۷۵، ۱۱۷۶، ۱۱۷۷، ۱۱۷۸، ۱۱۷۹، ۱۱۸۰، ۱۱۸۱، ۱۱۸۲، ۱۱۸۳، ۱۱۸۴، ۱۱۸۵، ۱۱۸۶، ۱۱۸۷، ۱۱۸۸، ۱۱۸۹، ۱۱۹۰، ۱۱۹۱، ۱۱۹۲، ۱۱۹۳، ۱۱۹۴، ۱۱۹۵، ۱۱۹۶، ۱۱۹۷، ۱۱۹۸، ۱۱۹۹، ۱۲۰۰، ۱۲۰۱، ۱۲۰۲، ۱۲۰۳، ۱۲۰۴، ۱۲۰۵، ۱۲۰۶، ۱۲۰۷، ۱۲۰۸، ۱۲۰۹، ۱۲۱۰، ۱۲۱۱، ۱۲۱۲، ۱۲۱۳، ۱۲۱۴، ۱۲۱۵، ۱۲۱۶، ۱۲۱۷، ۱۲۱۸، ۱۲۱۹، ۱۲۲۰، ۱۲۲۱، ۱۲۲۲، ۱۲۲۳، ۱۲۲۴، ۱۲۲۵، ۱۲۲۶، ۱۲۲۷، ۱۲۲۸، ۱۲۲۹، ۱۲۳۰، ۱۲۳۱، ۱۲۳۲، ۱۲۳۳، ۱۲۳۴، ۱۲۳۵، ۱۲۳۶، ۱۲۳۷، ۱۲۳۸، ۱۲۳۹، ۱۲۴۰، ۱۲۴۱، ۱۲۴۲، ۱۲۴۳، ۱۲۴۴، ۱۲۴۵، ۱۲۴۶، ۱۲۴۷، ۱۲۴۸، ۱۲۴۹، ۱۲۵۰، ۱۲۵۱، ۱۲۵۲، ۱۲۵۳، ۱۲۵۴، ۱۲۵۵، ۱۲۵۶، ۱۲۵۷، ۱۲۵۸، ۱۲۵۹، ۱۲۶۰، ۱۲۶۱، ۱۲۶۲، ۱۲۶۳، ۱۲۶۴، ۱۲۶۵، ۱۲۶۶، ۱۲۶۷، ۱۲۶۸، ۱۲۶۹، ۱۲۷۰، ۱۲۷۱، ۱۲۷۲، ۱۲۷۳، ۱۲۷۴، ۱۲۷۵، ۱۲۷۶، ۱۲۷۷، ۱۲۷۸، ۱۲۷۹، ۱۲۸۰، ۱۲۸۱، ۱۲۸۲، ۱۲۸۳، ۱۲۸۴، ۱۲۸۵، ۱۲۸۶، ۱۲۸۷، ۱۲۸۸، ۱۲۸۹، ۱۲۹۰، ۱۲۹۱، ۱۲۹۲، ۱۲۹۳، ۱۲۹۴، ۱۲۹۵، ۱۲۹۶، ۱۲۹۷، ۱۲۹۸، ۱۲۹۹، ۱۳۰۰، ۱۳۰۱، ۱۳۰۲، ۱۳۰۳، ۱۳۰۴، ۱۳۰۵، ۱۳۰۶، ۱۳۰۷، ۱۳۰۸، ۱۳۰۹، ۱۳۱۰، ۱۳۱۱، ۱۳۱۲، ۱۳۱۳، ۱۳۱۴، ۱۳۱۵، ۱۳۱۶، ۱۳۱۷، ۱۳۱۸، ۱۳۱۹، ۱۳۲۰، ۱۳۲۱، ۱۳۲۲، ۱۳۲۳، ۱۳۲۴، ۱۳۲۵، ۱۳۲۶، ۱۳۲۷، ۱۳۲۸، ۱۳۲۹، ۱۳۳۰، ۱۳۳۱، ۱۳۳۲، ۱۳۳۳، ۱۳۳۴، ۱۳۳۵، ۱۳۳۶، ۱۳۳۷، ۱۳۳۸، ۱۳۳۹، ۱۳۴۰، ۱۳۴۱، ۱۳۴۲، ۱۳۴۳، ۱۳۴۴، ۱۳۴۵، ۱۳۴۶، ۱۳۴۷، ۱۳۴۸، ۱۳۴۹، ۱۳۵۰، ۱۳۵۱، ۱۳۵۲، ۱۳۵۳، ۱۳۵۴، ۱۳۵۵، ۱۳۵۶، ۱۳۵۷، ۱۳۵۸، ۱۳۵۹، ۱۳۶۰، ۱۳۶۱، ۱۳۶۲، ۱۳۶۳، ۱۳۶۴، ۱۳۶۵، ۱۳۶۶، ۱۳۶۷، ۱۳۶۸، ۱۳۶۹، ۱۳۷۰، ۱۳۷۱، ۱۳۷۲، ۱۳۷۳، ۱۳۷۴، ۱۳۷۵، ۱۳۷۶، ۱۳۷۷، ۱۳۷۸، ۱۳۷۹، ۱۳۸۰، ۱۳۸۱، ۱۳۸۲، ۱۳۸۳، ۱۳۸۴، ۱۳۸۵، ۱۳۸۶، ۱۳۸۷، ۱۳۸۸، ۱۳۸۹، ۱۳۹۰، ۱۳۹۱، ۱۳۹۲، ۱۳۹۳، ۱۳۹۴، ۱۳۹۵، ۱۳۹۶، ۱۳۹۷، ۱۳۹۸، ۱۳۹۹، ۱۴۰۰، ۱۴۰۱، ۱۴۰۲، ۱۴۰۳، ۱۴۰۴، ۱۴۰۵، ۱۴۰۶، ۱۴۰۷، ۱۴۰۸، ۱۴۰۹، ۱۴۱۰، ۱۴۱۱، ۱۴۱۲، ۱۴۱۳، ۱۴۱۴، ۱۴۱۵، ۱۴۱۶، ۱۴۱۷، ۱۴۱۸، ۱۴۱۹، ۱۴۲۰، ۱۴۲۱، ۱۴۲۲، ۱۴۲۳، ۱۴۲۴، ۱۴۲۵، ۱۴۲۶، ۱۴۲۷، ۱۴۲۸، ۱۴۲۹، ۱۴۳۰، ۱۴۳۱، ۱۴۳۲، ۱۴۳۳، ۱۴۳۴، ۱۴۳۵، ۱۴۳۶، ۱۴۳۷، ۱۴۳۸، ۱۴۳۹، ۱۴۴۰، ۱۴۴۱، ۱۴۴۲، ۱۴۴۳، ۱۴۴۴، ۱۴۴۵، ۱۴۴۶، ۱۴۴۷، ۱۴۴۸، ۱۴۴۹، ۱۴۵۰، ۱۴۵۱، ۱۴۵۲، ۱۴۵۳، ۱۴۵۴، ۱۴۵۵، ۱۴۵۶، ۱۴۵۷، ۱۴۵۸، ۱۴۵۹، ۱۴۶۰، ۱۴۶۱، ۱۴۶۲، ۱۴۶۳، ۱۴۶۴، ۱۴۶۵، ۱۴۶۶، ۱۴۶۷، ۱۴۶۸، ۱۴۶۹، ۱۴۷۰، ۱۴

ہیں۔ اُن میں سے بعض کے اسمائے گرامی درج کیے جاتے ہیں:

مولانا محمد حسین ہزاروی (سابق مدرس دارالعلوم) مولانا نیک محمد (سابق مدرس دارالعلوم)
 مولانا عبدالعزیز والد ماجد حکیم ابوتراب عبدالحق امرتسری، مولانا عبدالکریم فیروزپوری (امین
 خاندان غزنویہ) مولانا فقیر اللہ مدرسی، مولانا حکیم عبدالرحمن دہلوی، مولانا حکیم عبدالرحمن
 سابق پروفیسر طبیہ کالج کابل، مولانا عبدالرحمن برادر مولانا فقیر اللہ مدرسی، مولانا ابوبکی امام
 خاں نوشہروی، مولانا عبدالحمید، مولانا عبدالغنی، مولانا عبدالحمید (دینا نگر)، مولانا محمد خان،
 مولانا حافظ عبدالرشید گوہڑی، مدرس دارالعلوم تفریقۃ الاسلام، مولانا شرف الحق سکول ٹیچر
 اویچ شریف بہاول پور، مولانا محمد حسین طور، مدرس جھوک دادو ضلع لائل پور۔ مولانا عبدالرشید
 خطیب رام گڑھ لاہور، قاضی محمد اسلم سیف سکول ٹیچر تحصیل سمندری ضلع لائل پور، حافظ
 عزیز الرحمن کھوی، مہتمم مدرسہ محمدیہ ربیئالہ خرد۔ حافظ شغبین الرحمن کھوی مدرس ربیئالہ خرد
 ضلع ساہیوال، مولانا محمد منیر کھوی، مدرس جامعہ محمدیہ اوکاڑہ۔ حافظ محمد یحییٰ عزیز امیر جمعیت
 اہلحدیث۔ لاہور۔ حافظ بشیر احمد بھوجانی مدرس میاں چنوں ضلع ملتان۔ مولانا ابوبکر صدیق
 ٹیچر اسلامپہ ہائی سکول مصری شاہ، لاہور۔ مولانا امجد الدین سلفی خطیب رحمن پورہ، لاہور، حافظ
 عبدالرحمن گوہڑی، تاجر کتب، لاہور، مولانا محمد رفیق بھجوی، مدرس مدرسہ محمدیہ گوجرانوالہ۔
 مولانا محمد حنیف تیرنگری خطیب بھائی پھیر و ضلع لاہور۔ مولانا محمد شریف کھوی سکول ٹیچر
 ضلع ساہیوال، مولانا محمد انور باٹھوی سکول ٹیچر شرقپور ضلع لاہور، مولانا محمد علی تبسم ٹیچر گورنمنٹ
 سکول چوینیاں منڈی ضلع لاہور، حافظ محمد ایوب لیکچرار انجینئرنگ یونیورسٹی۔ لاہور۔
 حافظ محمد عابد ٹیچر نیاعلی گڑھ سکول، مانگا منڈی۔ مولانا نذیر احمد ہیروی ٹیچر گورنمنٹ ہائی سکول
 مانگا منڈی۔ مولانا عبدالواحد ہیروی ٹیچر نارمل سکول گکھڑ منڈی، مولانا نور اللہ کھیٹڑوی خطیب مسجد
 توحید آباد۔ لاہور۔ مولانا محمد بشیر گوہڑی مدرس اوڈانوالہ تحصیل سمندری ضلع لائل پور۔ مولانا صلاح الدین
 کھوی مبلغ (کینیا) مولانا جبار اللہ کھیٹڑوی مدرس رام گڑھ، لاہور۔ مولانا عبدالحمید کھیٹڑوی خطیب

کھیڑہ کلاں ضلع شیخوپورہ، حافظ خلیل الرحمن خطیب نکانہ صاحب ضلع شیخوپورہ۔ مولانا نذیر احمد خطیب نبی پور پیراں ضلع شیخوپورہ۔ مولانا محمد صغیت قصوری متبع جماعت اہلحدیث قصور۔ مولانا عبد الحمید خطیب شیخوپورہ۔ مولانا بشیر احمد خطیب پتوکی ضلع لاہور، مولانا حاکم علی ٹیچر اسلامیہ ہائی سکول مصری شاہ لاہور۔ مولانا علی اصغر ٹیچر کوٹ رادھاکشن ضلع لاہور۔ مولانا محمد یونس انژی مہتمم دارالعلوم محمدیہ مظفر آباد۔ آراؤکتیر۔ مولانا محمد رفیق قصوری سکول ٹیچر قصور۔ مولانا عبد الرحمن لدھیانوی خطیب راج گڑھ، لاہور، حافظ محمد یوسف کراچی خطیب مہر سپرہ لاہور۔ مولانا محمد عبداللہ اکاڑی، ادکارہ۔ قاری عبدالواحد خطیب لاپپور، قاری محمد صدیق، سکول ٹیچر ساہیوال۔ مولانا محمد حسین لدھیانوی خطیب ملک پور لاہور۔ مولانا عبدالرشید لدھیانوی۔ سکول ٹیچر بورسے والا ضلع ملتان۔ قاری عبدالحفیظ خطیب کھڈیاں ضلع لاہور۔ مولانا منصور احمد تاجر کتب لاہور۔ مولانا بشیر احمد مدرس ماموں کاشن ضلع لاپپور۔ مولانا مصطفی اشعون سکول ٹیچر ساہیوال۔ قاری ثناء اللہ چوہان مدرس جامعہ خضریٰ اسن آباد، لاہور۔ مولانا محمد صدیق خطیب بادامی باغ، لاہور۔ مولانا بشیر احمد سکول ٹیچر کوٹ رادھاکشن ضلع لاہور۔ مولانا محمد سردر خطیب ٹھار پور لاہور۔ مولانا عبد الحمید خطیب مسجد فردوس دھرم پورہ، لاہور۔ مولانا محمد رفیق مدرس گرجا کھ ضلع گوجرانوالہ۔ مولانا محمد سعید سکول ٹیچر قصور۔ مولانا ظہور احمد سکول ٹیچر بھائی پھرہ۔ لاہور۔ حافظ محمد اسحاق مدرس پتوکی ضلع لاہور۔ مولانا محمد لقمان۔ دارالعلوم کی سفارت کا کام آج کل انجام دے رہے ہیں۔ حافظ محمد زاہد سیکریٹری دفتر دارالعلوم کی حیثیت سے چار سال تک دارالعلوم کی خدمت کرتے رہے ہیں۔

جن حضرات نے اس درس گاہ سے فیض حاصل کیا ہے، انہیں اس درس گاہ سے ایک ذمہ تعلق اور ایک روحانی رابطہ محسوس کرنا چاہیے اور اس کی ترقی اور فروغ کے لیے کوشاں رہنا چاہیے۔

وَآخِرُ دَعْوَانَا اِنَّ الْحَمْدَ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِينَ وَالصَّلٰوةُ وَالسَّلَامُ عَلٰى سَيِّدِنَا مُحَمَّدٍ

ماخذ "سیدی و ابی"

مطبوع	مصنف	کتاب
دارالعلوم تقویت الاسلام معروف بہ مدرسہ غزنیہ کے کتب خانے میں محفوظ ہے۔	تالیف حضرت امام مولانا عبد الجبار غزنویؒ	مخطوط سوانح حیات حضرت عبداللہ غزنویؒ
" " " "	مولانا غلام رسول صاحب قلعویؒ	مخطوطہ مکاتیب غیر مطبوعہ
" " " "	حضرت عبداللہ غزنویؒ	معارف اللطائف (غیر مطبوعہ مقالہ)
" " " "	حضرت مولانا داؤد غزنویؒ	ذکر اللہ عزوجل (")
" " " "	" " "	مسائل متفرقة تصوف (")
مجلس دائرة المعارف العثمانیہ جدید آباد دکن	مولانا عبدالحی مکتومیؒ	نزہتہ الخواطر و سبحة المسامع و التواظر
الہند = ۱۳۶۸ھ = ۱۹۵۹ م	نواب صدیق حسن خاں صاحب	تقصیر من تذکار جہود الاحرار
مطبوعہ شاہجہانی، بمبئی ۱۲۹۸ھ	سید جمال الدین افغانیؒ	کتاب تہمتہ البیان فی تاریخ الافغان
مطبوعہ المورثات مصر ۱۳۱۸ھ = ۱۹۰۱ م	امام ابن قیمؒ	بدائع الفوائد
مطبوعہ منیریہ، القاہرہ، مصر	قاضی ثناء اللہ پانی پتیؒ	تفسیر منطہری
جدید الیکٹریک پریس، دہلی۔ باہتمام مجلس اشاعت العلم جدید آباد دکن	مولانا سید نذیر حسین محدث دہلویؒ	معیار الحق
۱۹۲۵ء مکتبہ نذیریہ قصور، چٹان پریس، لاہور، جنوری	مولانا ابراہیم میر سیالکوٹیؒ	تاریخ اہل حدیث
اسلامی پبلیشنگ کمپنی لاہور۔ دورہ ایڈیشن ۱۹۶۰ء	امام ابوبکر خاں نوشہرویؒ	ہندوستان میں اہلحدیث کی دینی خدمات
مکتبہ نذیریہ، چیچا وطنی، ساہیوال		
جمادی الاول ۱۳۹۱ھ		

مصنف	کتاب	مطبع
امام ابو یحییٰ خاں نو شہودیؒ	تراجم علمائے حدیث ہند	مطبعہ مرکزی جمعیت طلبہ اہلحدیث مغربی پاکستان، طبع دوم ۱۳۹۱ھ
مولانا اشرف علی تھانویؒ	ارواحِ ثلاثہ	کتب خانہ امداد الغریب، بہار، پٹنہ
ترجمہ حضرت مولانا داؤد غفریؒ	باب التوحید از حجۃ اللہ البالغہ	اصل مسودہ کتاب جو دارالعلوم کے کتب خانے میں موجود ہے
حضرت مولانا داؤد غفریؒ	اسوہ حنینؑ	مطبعہ جمعیت اہلحدیث، قصور ضلع لاہور
چوہدری حبیب احمد	مکتوبات حضرت مجدد الف ثانیؒ	روز بازار الیکٹریک پریس امرتسر، بہار
مولانا داؤد غفریؒ	دفاع اول - دفر دوم	شیخ عبدالعزیز بیضج فور اے پی پبلشرز پری
تحریر حضرت داؤد غفریؒ	تحریک پاکستان اور نیشنلسٹ علماء	اشرف پریس لاہور فروری ۱۹۶۶ء
	دوسالہ رپورٹ اور گوشوارہ بابش	گیلانی الیکٹریک پریس ہسپتال رڈ لاہور
	۲۸-۱۹۴۶ء و ۲۹-۱۹۴۸ء	
SIR PEREY SYKES	A HISTORY OF AFGHANISTAN VOL.2	MACMILLAN & COMPANY LTD LONDON

رسائل و اخبارات

مکمل فائل

مکمل فائل

مکمل فائل

اخبار اہلحدیث امرتسر

"توحید" امرتسر

ہفت روزہ الاعتصام لاہور

روزنامہ زمیندار کا مرزا نیوز

حضرت مولانا داؤد غفریؒ کی تصانیف کا مجموعہ

شہدوں کی بیاض - طبی نسخوں کی بیاض - روزنامہ زمیندار کا مرزا نیوز... متفقہ یادداشتیں (جو سیکڑوں صفحات پر مشتمل ہیں)

ہر قسم کی اسلامی علمی اور درسی کتب نیز
مصر، بیروت، ایران اور سعودی عرب کی
مطبوعہ کتب کا

عظیم مرکز
فار ان اکیڈمی

قدافی سٹریٹ ۱۷- اردو بازار

لاہور = فون ۷۲۲۷۹۰۵